



INTERMEDIATE URDU SELECTIONS

(Revised Edition)

UNIVERSITY OF CALCUTTA
1955

Price Rs. 4/-



DATE LABEL

Calcutta University Library

N.B.—Under the rules of the Library, this book is to be
returned WITHIN $\frac{15 \text{ DAYS}}{2 \text{ MONTHS}}$ from the date of
Issue.

<i>Due</i> Date of Issue	Date of Issue	Date of Issue	Date of Issue	Date of Issue	Date of Issue
<i>Return</i> 6 FEB 1966					



INTERMEDIATE URDU SELECTIONS



080 CU
1382/110

(Revised Edition)

UNIVERSITY OF CALCUTTA
1955



1672 B.T. (1948)—ce

1791 B.T. (1952) Revised Edition—B

1853 B.T. (1954) Abridged Edition—A

1860 B.T. (1955) Revised Edition—A

178480

T3CU 2171

PRINTED IN INDIA

PRINTED AND PUBLISHED BY SIBENDRANATH KANJILAL,
SUPERINTENDENT, CALCUTTA UNIVERSITY PRESS,
48, HAZRA ROAD, BALLYGUNGE, CALCUTTA.

1860 B.T.—September, 1955.

تصنیف و تالیف کا شوق بچپن ہی سے تھا چنانچہ ایک رسالہ پندرہ برس کے سن میں احکام الصلوٰۃ لکھا اور انتیس برس کی عمر میں واردات درد نام ایک اور رسالہ لکھا۔ کئی تصنیفات درد کی یادگار ہیں۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی ایک دیوان ہے۔ آزاد انکے کلام کے متعلق فرماتے ہیں ”خواجہ میر درد صاحب کی غزل سات شعہ نو شعر کی ہوتی ہے مگر انتخاب ہرتی ہے خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحر میں جو اکثر غزلیں کہتے ہیں گویا تلوار کی آبداری نشتریں بہر دیتے ہیں۔ خیالات انکے سنجیدہ اور متین تھے کسی کی ہچوسے زبان آلودہ نہیں ہوتی۔ ان خویوں کے علاوہ میر درد کا پایۂ تصوف کے اعتبار سے غالباً کسی اردو شاعر سے کم نہیں۔ اکثر دقیق مسائل کو نہایت مزے اور اختصار کے ساتھ نظم کرتے ہیں بقول آزاد گوان کا اردو کا دیوان مختصر سا ہے لیکن نفاست اور سادگی کے ساتھ خیالات میں بلندی اور جذبات میں جوش ہر جگہ آپکو ملیگا الفاظ چیدہ اور پسندیدہ استعمال کرتے ہیں۔

خواجہ میر درد کا انتقال ۲۴ صفر سنہ ۱۱۹۹ھ اور سنہ ۱۷۷۵ء کو ہوا۔ ۶۶ برس کی عمر تھی دہلی میں دفن کیئے گئے ان کا مزار اب تک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

چکبست

ان کے بزرگوں کا وطن لکھنؤ ہے مگر یہ فیض آباد میں سنہ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے تعلیم و تربیت لکھنؤ میں حاصل کی اور سنہ ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی سنہ ۱۹۰۸ء میں قانون کا امتحان پاس کرکے وکالت کے میدان میں قدم رکھا۔ اس پیشہ میں ایسی کامیابی حاصل کی کہ لکھنؤ کے ممتاز وکلا میں شمار ہونے لگے۔

سنہ ۱۹۳۶ء کی بارہ فروری کو ایک مقدمے کی پیروی کیلئے رائے بریلی گئے۔ سہ پہر تک بحث کی اور پھر لکھنؤ واپس آنے کیلئے اسٹیشن آئے ریل میں بیٹے تھے کہ فالج گرا زبان بند ہوگئی اور کچھ گھنٹوں کے بعد اسٹیشن ہی پر انتقال ہوگیا۔ کاظم حسین معشر لکھنوی نے چکبست ہی کے ایک مصرعے سے تاریخ وفات کہی۔ ”موت کیا ہے انہی اجزا - کا پریشاں ہونا“۔ چکبست بچپن ہی سے شاعری کے دادادہ تھے۔ آتش، غالب اور انیس نے اپنی لاتعداد خوبیوں سے انہیں اپنا گرویدہ بنالیا تھا جسکا اثر آج بھی انکے کلام پر صاف نظر آرہا ہے۔ مسدس میں انیس کا اور غزل میں آتش کا انداز بیان ہر جگہ نمایاں ہے۔

چکبست کے یہاں حسن و عشق کے آفسا نے بہت کم ہیں انکی شاعری کا خاص مقصد وطن کو بیدار کرنا ہے۔ چنانچہ غزلوں میں بھی اسی بات کو مد نظر رکھتے ہیں۔

درد

نام سید خواجہ میر اور تخلص درد تھا۔ ان کے والد کا نام خواجہ محمد ناصر تھا اور عندلیب تخلص کرتے تھے فارسی کے اچھے شاعر تھے سلسلہ نسب خواجہ بہا الدین نقشبندی سے ملتا ہے۔ خواجہ میر درد دلی میں پیدا ہوئے اور والد کے اثر سے شاعری اور تصرف کے ورثہ دار ہوئے۔

عموماً بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں جسکی وجہ سے شعر میں ایک ترنم اور ساتھ ہی ساتھ کیف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ تفرل کی چاشنی دیکر نظموں کا لطف دوبالا کر دیتے ہیں۔

اکبر

سید اکبر حسین نام تھا اور اکبر تخلص میر تفصل حسین کے بیٹے تھے۔ اکبر کی ولادت کا فخر الہ آباد کو حاصل ہے۔ ۱۶ نومبر سنہ ۱۸۴۶ء کو بمقام بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے جہاں انکے چچا تحصیلدار تھے۔ اکبر اپنی ابتدائی تعلیم میں بھی اپنی ذہانت کی وجہ سے ہمیشہ اچے درجوں میں ممتاز رہے۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان اول درجے میں پاس کیا کچھ دنوں کے بعد نائب تحصیلدار ہو گئے رفتہ رفتہ ترقی کر کے ہائی کورٹ کی وکالت پاس کر کے منصف ہو گئے۔ آخر میں جج خفیفہ کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ بالآخر سنہ ۱۹۰۳ء میں پنشن لیکر علمی زندگی بسر کرنے لگے۔

انکو شعر و شاعری کا ذوق بچپن ہی سے تھا۔ وحید کو اپنا کلام دکھاتے تھے جو خواجہ آتش کے بیک واسطہ شاگرد تھے ابتدا میں اکبر بھی اسی رنگ میں شعر کہتے جو اس زمانہ کا خاصہ تھا لیکن اکبر کی شہرت اسوقت ہوئی جب انہوں نے قدیم رنگ کو خیر باد کہہ کر اپنے لیئے ایک نہایت کارآمد میدان تلاش کیا۔ ملک اور قوم کی حالت کو تباہ دیکھ کر انکا دل بھر آیا مگر آہ و فریاد سے زمانہ کو چونکانا مناسب نہ سمجھا کبھی چٹکیاں لیکر کبھی طنز آمیز باتیں کہہ کر دلوں کو ابھارنے کی کوشش کی۔ مغرب کی کورانہ تقلید دیکھ کر اہل مشرق کو طرح طرح سے سمجھاتے رہے۔ انکی ظرافت اور بذلہ سنجی کسی نہ کسی تبلیغی مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہے اور خوبی یہ ہے کہ انکی نصیحت کبھی ناخوشگوار نہیں معلوم ہوتی۔ اپنے طرز بیان سے وہ تلخ باتوں کو بھی شربت کا گھونٹ بنا دیتے ہیں۔ افسوس کہ اسطرح ہنسا ہنسا کر کام لینے اور اصلاح کرنے والا سنہ ۱۹۲۱ء میں راہی ملک بقا ہوا۔

۳-رور

منشی درگاسہائے سرور حکیم پیارے لال کے بیٹے تھے - آپکی ولادت دسمبر سنہ ۱۸۷۳ء میں جہاں آباد میں ضلع پیلی بھیت کے مقام پر ہوئی - آپکے بزرگ اس قصبہ کے قدیم رئیس و زمیندار تھے -

سرور کی ابتدائی تعلیم جہاں آباد کے تحصیل اسکول میں ہوئی وہیں سے انہوں نے اردو مدل کا امتحان پاس کیا ابتداء ہی سے وہ اپنی جماعت میں ذہانت کی وجہ سے ممتاز رہے - اس امتحان کے پاس کرنے کے بعد آپ مولوی سید کرامت حسین بہار سے فارسی پڑھنا شروع کیا، شعر و سخن کا شوق بھی اسی وقت پیدا ہوا - لکھنے پڑھنے سے جسقدر وقت بچتا تھا شعر گوئی اور شعرا کا کلام دیکھنے میں صرف کرتے تھے آپ اصلاح بھی مولوی صاحب موصوف سے لیا کرتے تھے -

عرصہ کے بعد سرور کو انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا جہاں آباد میں اسکیلئے کوئی اسکول نہ تھا - لہذا ایک پوسٹ ماسٹر سے انگریزی پڑھنا شروع کیا - دو سال کے عرصہ میں آپ انگریزی مدل کا بھی امتحان پاس کر لیا - شعر و شاعری کا مشغلہ جاری رہا - ابتدا میں وحشت تخلص کیا پھر سرور ہو گئے -

سنہ ۱۸۹۹ء سے آپ کا کلام ادبی رسالوں میں شائع ہو کر مقبول عام ہونے لگا دفعۃً انکا اکلوتا بیٹا جسکی ماں ایک سال کا چھوڑ کر مری تھی انتقال کر گیا اس حادثہ نے سرور کی طبیعت میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا - ہر وقت غم زدہ رہنے لگے اور غم غلط کرنے کیلئے نئے نئے اختیارات کر لی -

لیکن آخر میں اسقدر پینے لگے تھے کہ کئی کئی روز تک مست و بیہوش رہتے - ۳ - اپریل سنہ ۱۹۱۰ء کو سرور نے اپنا مجموعہ مرتب کرنے کی غرض سے الہ آباد کا سفر کیا ۳ جون کو آپ الہ آباد سے وطن آئے دوبارہ پھر اسی سلسلہ میں الہ آباد آ رہے تھے کہ یکایک بخار اور درد سینہ میں مبتلا ہو گئے اور دوہی روز می ۳ دسمبر ۱۹۱۰ء کو رحلت کر گئے -

سرور کے یہاں نظموں کا ذخیرہ غزلیات کے مقابلہ میں زیادہ ہے - طرز بیان میں فارسی تراکیب سے چستی و روانی پیدا کر دیتے ہیں الفاظ کے انتخاب میں

اپنی طرف مروجہ کر لیتی ہے وہ زبان اور معاررات کی کشش ہے - زبان کی صفائی اور لطافت میں مشکل سے کبھی فرق آنے پاتا ہے بلکہ ایسے مزے کے ساتھ الفاظ کو شعر کے سانچے میں جماتے ہیں کہ خود بخود ترنم پیدا ہو جاتا ہے - اشعار میں ضرب المثل نظم کرنے میں کوئی ان کا ثانی فطر نہیں آتا - نہ صرف اردو ہندی بلکہ عربی و فارسی کی بھی مثالیں پائی جاتی ہیں -

مومن

ان کے والد کا نام غلام نبی خان تھا - خاندانی پیشہ طبابت تھا - مومن خاں کے دادا سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں دلی آئے اور شاہی طبیبوں میں داخل ہو گئے اور اسی سلسلہ میں کچھ جاگیر بھی ملی -

مومن خاں کی ولادت سنہ ۱۸۰۰ء میں ہوئی - انکے والد کو شاہ عبدالعزیز سے عقیدت تھی - چنانچہ یہ نام شاہ صاحب موصوف ہی نے رکھا تھا ابتدائی تعلیم شاہ عبدالقادر سے حاصل کی عربی سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنے خاندان میں قلم کی کتابیں پڑھیں ذکاوت اور حافظہ قسام ارل نے مومن خاں کو خاص طور سے عطا کیا تھا - نجوم میں وہ مہارت حاصل کی کہ بڑے بڑے منجم منہ دیکھا کرتے تھے - شاعری میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے رہے - اصناف شاعری میں قصیدہ، رباعی، راسخ، غزل، ترکیب بند، ترجیع بند، مثنوی سبھی پر طبع آزمائی کی - تاریخ گوئی میں کمال تھا بات بات میں تاریخ کہتے تھے -

کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معنی آفرینی اور جدت بیان کے لحاظ سے اردو میں کم شعرا اس پایہ کے گذرے ہیں - فارسی ترکیبوں اور الفظ کے الت پھیر سے سادی بات کو بھی شاندار بنا سکتے تھے کبھی کبھی الفاظ کی تکرار تاثیر بڑھانے میں مدد دیتی تھی - اشعار میں تہرری سی پیچیدگی - طنز تشبیہ اور استعارے کی ندرت انکی انفرادی خصوصیات میں داخل ہیں -

۵۳ برس کی عمر میں کوٹھے سے گرے، پانچ مہینہ بیمار رہ کر سنہ ۱۲۶۸ھ میں انتقال کیا -

الہ آباد ہی میں تھے کہ راجہ چندرلال نے دکن بلانے کی خواہش کی اور بارہ ہزار روپیہ کا لالچ دیا لیکن ناسخ ہمیشہ لکھنؤ کی یاد میں تڑپتے رہے نواب غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد پھر لکھنؤ جانا نصیب ہوا لیکن اس بار بھی زیادہ نہ رہ سکے دربار کا رنگ دیکھ کر پھر وطن کو خیرباد کہا بالآخر سنہ ۱۳۴۸ھ میں لکھنؤ آکر گھر میں ایسے رہے کہ سر نہ نکلتے ۔

ذوق

شیخ ابراہیم نام ذوق تخلص تھا ۔ شیخ محمد رمضان کے لڑکے تھے ۔ ذوق سنہ ۱۲۰۲ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے جب ذرا ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے حافظ غلام رسول کے پاس پڑھنے کو بٹھا دیا ۔ حافظ جی شاعر بھی تھے ۔ ہر وقت انکے ہاں شعر و شاعری کا چرچا رہا کرتا تھا وہیں سے ذوق کو بھی شعر گوئی کا شوق ہوا اور حافظ جی سے اصلاح لینے لگے بعد میں شاہ نصیر کو دکھانے لگے رفتہ رفتہ مشق سخن نے ذوق کو استاد بنا دیا یہاں تک کہ ولیعہد سلطنت بھی ذوق سے اصلاح لینے لگے اور ذوق نے اپنی قابلیت کا وہ سکھ جمایا کہ خاقانی ہند کا خطاب دربار سے عطا ہوا بعد میں خان بہادر بھی ہو گئے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک ہاتھی مع ایک حوضہ نقری کے مرحمت ہوا تھا ۔ ان کا انتقال سنہ ۱۸۵۴ء میں ہوا ۔ مرنے سے تین گھنٹہ قبل یہ شعر کہا تھا ۔

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے
ذوق فطرتاً نہایت نرم دل اور سنجیدہ مزاج تھے ۔ خوف خدا دلمیں اس قدر تھا کہ عمر بھر اپنے ہاتھ سے کوئی جانور ذبح نہیں کیا ۔ موسیقی سے خاص دلچسپی تھی ۔ نجوم اور رمل میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے ۔ طب میں بھی دخل تھا ۔ نماز و روزہ کے بہت پابند تھے ۔ گھنٹوں عبادت خدا میں مصروف رہا کرتے ۔

ذوق کے کلام کو دیکھ کر یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انکی غزلوں میں تغزل کے ساتھ اختصار و برجستگی اور کس قدر رنگینی بھی ہے لیکن ذوق کی ایک اہم خوبی جو

ناسخ

امام بخش نام، ناسخ نخاص تھا۔ پیدائش فیض آباد میں ہوئی بعد میں لکھنؤ چلے آئے انکے حالات کے بارے میں بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ دنیائے ادب میں انکی ترقی ذاتی تھی۔

ناسخ کو ورزش کا بہت شوق تھا خوراک کی مقدار کچھ کم نہ تھی، پانچ سیر پختہ کھاتے تھے جس پہل کیلئے جی چاہتا لگن اور سینٹیاں بھر کر سامنے مڑ گئے اور دم کے دم میں صاف کرجاتے، نہایت قوی ہیکل تھے، بلند و بالا، فراخ سینہ مددًا ہوا سر سیاہ رنگ کھارے کا لنگ باندھے شیر کی طرح بیٹھے رہتے تھے۔

لکھنؤ میں انہوں نے عربی، فارسی پڑھی تحصیل علم کے بعد اصلاح کلام کیلئے میر کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن انہوں نے اصلاح کی زحمت نہ کی۔ میر کے انکار کے بعد انہوں نے کسی سے اصلاح نہ لی خود ہی اپنا کلام دیکھتے رہے۔ ناسخ کو ترقی کیلئے میدان صاف ملا۔ بہت قلیل مدت میں مشہور شعرا مثلاً میر۔ سودا۔ جرأت۔ مصحفی سب کے سب کے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ناسخ اپنے کمالات کی وجہ سے جلد دربار تک پہنچ گئے۔ امرا و رؤسا میں انکی بڑی قدر و منزلت ہونے لگی۔ آغا زین سلطنت اودھ نے چاہا کہ دربار سے ملک الشعراء کا خطاب دیا جائے۔ ناسخ نے نواب غازی الدین حیدر کی اہمیت انکی نہ سمجھی کہ ان کا عطا کیا ہوا خطاب قبول کریں۔ صاف انکار کر دیا نواب صاحب کو یہ رویہ ناپسند ہوا، ناسخ سے خفا ہو گئے۔ ناسخ کو جان کے لالے پڑ گئے گوشہ عافیت تلاش کرنے کیلئے الہ آباد آنا پڑا۔

دلی اجڑ چکی تھی، اپنی خصوصیات کی وجہ سے اب ادب کا مرکز لکھنؤ تھا۔ آتش و ناسخ نے اپنے کمالات کی بنا پر لکھنؤ اسکول کی بنیاد ڈالی۔ ناسخ نے شاعری سے زیادہ قواعد، عروض اور متروکات پر زور دیا۔ ناسخ نے ان اصلاحات پر انکی زیادہ توجہ دی کہ ان کے اشعار بے کیف ہو گئے۔ زبان کو وسعت عطا کرنے کیلئے نئی تشبیہات و استعارے لانے کی فکر میں رہتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض تشبیہیں اور استعارے دور ارکار ہو گئے بعض عامیانہ ہو گئے۔

جرات

ان کا اصلی نام یحییٰ امان تھا مگر زمانہ نے قلندر بخش کے نام سے مشہور کیا۔ انکے باپ کا نام حافظ امان تھا۔ ان کے بزرگوار مغلیہ خاندان کے دربار سے وابستہ تھے۔ چنانچہ امان شاہی خطاب اکبر کا عطیہ تھا۔

دلی کی جب حالت خراب ہوئی تو جرات فیض آباد آئے اور یہاں پڑھ لکھ کر جوان ہوئے، نواب محبت خان کے ملازم ہوئے۔ سنہ ۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ آئے اور شاہ عالم ثانی کے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں رسائی حاصل کی عرصہ تک یہاں قیام رہا اور یہیں سنہ ۱۲۲۵ھ میں پیوند خاک ہوئے۔

جرات شاعری میں جعفر علی خان حسرت کے شاگرد تھے جو فارسی کے ایک مشاق اور اردو کے بھی اچھے شاعر تھے۔ جرات کو موسیقی سے فطرتی شغف تھا علم نجوم میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ طبیعت اتنی شگفتہ پائی تھی کہ بات کرنے میں منہ سے پھول جھڑتے تھے لیکن بعض انہیں آتش بازی کے پھول کی طرح بھی ہوتے تھے جس سے کبھی کبھی لوگ تامل آتھتے تھے۔ اس زمانے کے دربار اور محفلوں کیلئے جرات کا مذاق ایک بڑی حد تک پر لطف خیال کیا جاتا تھا۔ انشاء اللہ خاں سے محبت گرم رہتی تھی عین جوانی میں آنکھوں سے محروم ہو گئے جسکی وجہ سے انکے حریفوں کو مضحکہ اڑانے کا موقع ملتا تھا۔

جرات کے با کمال شاعر ہونے میں کلام نہیں انہوں نے اکثر اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے، جہاننگ زبان کا تعلق ہے اسمیں صفائی سادگی خاص طور سے قابل دید ہے۔ معازرات کی بندش اور خوش مزاجی کا چٹخارہ پڑھنے والے کو اپنی طرف پوری طرح مائل کر لیتے ہیں۔ شوخی اور بانگین زیادہ ہے۔ ان کا کلام حسن و عشق کے اکثر ارداد کا مرقع ہے۔

شیخ غلام علی راسخ

شیخ غلام علی راسخ نے میر تقی میر سے مشق سخن کی ہے۔ سنہ ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے۔ کوئی کہتا ہے کہ پٹنہ میں کسیکا بیان ہے کہ موضع سائیں جو پٹنہ سے دس کوس فاصلہ پر ایک گاؤں ہے اور کی ولارت ہوئی۔ سنہ ۱۲۲۱ھ تک کلکتہ، غازی پور، لکھنؤ اور دلی کی سیاحت میں مصروف رہے۔ سنہ ۱۲۲۲ھ میں اپنے وطن مالوف کو واپس آئے اس زمانہ میں پٹنہ میں مرجع ارباب کمال تھا اور شاعری کا گھر گھر چرچا تھا انکی عمر کا بقیہ حصہ یہیں گذرا، مشاعروں میں شریک ہوتے تو دروازو بیٹھے رہتے اور جب شعرا غزلیں پڑھتے تھے تو یہ آنکھیں بند کیئے جھومما کرتے اپنی غزلیں پڑھتے وقت آنسوؤں کا تار بندھ جاتا۔ چھتر ۷۶ برس کی عمر پا کر ۲۲ جماد الاخریٰ سنہ ۱۲۳۸ھ کو وفات پائی۔

کلام رطب و یابس نہونے کے برابر ہے تصرف کا مذاق بہت ابھرا ہوا نظر آتا ہے جسکو بہت سادہ طریقے سے ادا کرتے ہیں تشبیہ اور استعاروں کی چاشنی کم ہے جس سے کسی قدر پھیکا پن ظاہر ہوتا ہے تاہم رنگین شعروں کی کمی نہیں سیکڑوں شعرا سے انتخاب کیئے جاسکتے ہیں جو دلنشین ہونے کے قابل ہیں۔

کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں انکا قیام زیادہ رہا ہے۔ چند قصیدے آصف الدولہ اور غازی الدین حیدر کی تعریف میں بھی ہیں مگر غازی الدین حیدر کی تعریف کا قصیدہ اس زمانے کا ہے جب وہ نواب وزیر تھے بعض غزلیں داسخ و آتش کی طرحی زمین میں ہیں مگر وہ بھی اپنے رنگ کی ہیں۔

انکے معاصریں میں کسیکا بھی کلام زبان کی پاکیزگی اور بیان کی خوش ادائی میں انکا جیسا صاف ستھرا نہیں ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو چار دیوانوں سے چھانت کر یہ دیوان تیار کیا گیا ہے اور بڑی بڑی غزلوں میں سے دس دس پانچ پانچ شعر انتخاب کر کے جمع کر دیئے گئے ہیں۔

کردیقا ہے ۔ جہاں جہاں یہ خوبی پیدا ہوگئی ہے اُس نے افسانوں کو جنت نگاہ اور عبارت کو فردوس ہوش بنادیا ہے ۔ آپکی طبع زاد افسانوں میں اکثر حیات انسانی کی نفسیاتی تخیل ہوتی ہے ۔ اور اُن کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو حسیات و جذبات انسانی کی نقاب کشائی میں خاص ملکہ ہے جس کو اُن کی افسانہ نویسی کا ایک خاص جزو سمجھنا چاہئیے ۔ آپ کے یہاں کبھی فطرت انسانی کا مطالعہ اس لطیف طرز پر ہوتا ہے کہ قلب میں ایک انبساطی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو کبھی کردار افسانہ سے رہ اٹھتے لیاں ہوتی ہے کہ تبسم کی لہریں قہقہوں سے بدل جاتی ہیں ۔ آپ کے افسانوں کا مجموعہ ”خیالستان“ کے نام سے مشہور ہے ۔ اس کے علاوہ زہرا ۔ جلال الدین خوارزم شاہ ۔ پرانا خواب جنگ و جدال وغیرہ وغیرہ بھی آپکے مشہور ترجمے ہیں ۔ آپ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے رجسٹرار بھی رہ چکے ہیں ۔

حبیب الرحمن خان شروانی

حضرت مولانا مولوی محمد حبیب الرحمن خان شروانی عمائدین ملک میں سے ہیں ۔ رئیس حبیب گنج ہونیکے باوجود آپ امور مذہبی میں کافی دسترس رکھتے ہیں ۔ آپ کے تبحر علمی کے سبب حضور نظام نے آپ کو صدر الصدور امور مذہبی کا منصب عطا فرمایا ۔ اور نواب صدربازنگ بہادر کے معزز لقب سے سرفراز کیا ۔ آپ کے پر از معلومات معرکۃ الاراء مضامین اکثر ملک کے مشہور رسالے ”معزن“ اور ”آردر“ میں شائع ہوتے رہے آپ کو شاعری سے بھی خاصی دلچسپی ہے ۔ آپ اکثر معیاری غزلیں کہلایا کرتے ہیں ۔ آپ کے تصنیفات میں ”سیرۃ الصدیق“ ملک میں نہایت ہی مقبول تصنیف شمار کی جاتی ہے ۔ اپنی مشہور تصنیف غبار خاطر میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ہر مکتوب میں آپ کو ”صدیق“ کہہ کر مخاطب کیا ہے ۔ سجاد حیدر صاحب نے اپنی مشہور تصنیف ”خیالستان“ کو آپ کے نام معنون کیا ہے ۔

منظر میں دلکشی اور بیان میں شگفتگی زیادہ ہو جائے - لیکن مقامت اور سنجیدگی کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے نہیں جانے پاتا - سادگی سے رنگینی پیدا کرنا یہ آپکے نثر کا امتیازی پہلو ہے -

سجاد حیدر یلدرم

سجاد حیدر کا نام اردو کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں - جن لوگوں نے کامیابی کے ساتھ اردو میں دوسری زبانوں کے افسانوں کو ترجمہ کر کے اس ادب کو گرانہا بذائیکی کوشش کی ہے ان کی فہرست میں آپکا نام زریں حروف سے لکھے جانیکے قابل ہے - غالباً آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس سلسلہ کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی ہے - انہوں نے سب سے پہلے اردو میں ترکی افسانوں اور ڈراموں کا ترجمہ کرنا شروع کیا - ترکی تخیل کو اردو کے پیرایہ میں اس طرح منتقل کیا ہے کہ ترجمہ میں اصل کی شان آگئی ہے - ترکی طرز معاشرت و حسن ادا کو اردو کی دنیا میں مانوس ہونیکے لئے آپ نے اکثر اردو کی ترکیبوں میں اجتہاد سے کام لیا ہے - اور خوشی اس بات کی ہے کہ بیشتر مقامات پر ان کو ایسی اثر پذیر کامیابی ہوئی ہے کہ اس خدمت کو اردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا - مگر کبھی کبھی اپنے لطیف جذبات کو بیان کرنیکے لئے ایسی ایسی ترکیبیں اور الفاظ استعمال کرجاتے ہیں جو سننے والوں کو کسی قدر غیر مانوس معلوم ہوتے ہیں -

ترکی ترجموں کی کثرت کا یہ نتیجہ ہوا کہ سجاد صاحب کے طبع زاد افسانوں میں بھی ترکی افسانوں کی رومانیت جا بجا نظر آنے لگی - آپ کے ترجموں میں وہ برجستگی اور ندرت ہوتی ہے کہ وہ بذات خود ایک تصنیف کا مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں - پڑھنے والے کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے یا کسی کی ذاتی تخیل کا نتیجہ - ایک تو الفاظ کا انتخاب عمدہ اور پھر ان کو نہایت موزوں جگہ سے ترتیب دینا یہ موصوف کا وہ کرشمہ ہے جو ان کی نثر میں شامہی کا مزہ پیدا

شاد نے لیا۔ آپ کو اس وقت دستور کے مطابق اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم دی گئی۔ عرصہ تک آپ انگریزی تعلیم سے محروم رکھے گئے۔ غرض کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں آپ فارسی کے ماہر اور عربی سے آشنا ہو گئے تھے۔ انگریزی تعلیم اسکے بعد حاصل کی اور اس کا شوق برابر جاری رہا۔ نہایت کم عمری سے آپ کو علم و ادب کا شوق و ذوق رہا۔ سنہ ۱۸۹۷ء میں جب آپ کی عمر سترو سال کی تھی آپ نے عظیم آباد سے ”ادیب“ نام کا ایک ماہوار علمی و ادبی رسالہ جاری کیا۔ اس رسالہ کی زبان اور طرز ادا پر ملک گریہ ہو گیا۔ اس سے پہلے ایسے رسالے ملک میں بہت کم شائع ہوا کرتے تھے۔ علامہ علمی شغف کے آپ کو سیر و سیاحت کا بھی شوق تھا چنانچہ سنہ ۱۹۲۰ء میں آپ نے یورپ کا سفر اختیار کیا اور اسی سلسلہ میں ایشیا کے بھی چند ممالک کا دورہ کر کے وہ اپنی معلومات و تجربات میں اضافہ کرتے رہے۔ یوں تو آپ نے مختلف موضوع پر مضامین لکھ کر عرصہ سے اپنی جگہ ملک کے ممتاز لوگوں میں کر لی تھی۔ لیکن آپ کا خطبہ صدارت (اردو کانفرنس منعقدہ سنہ ۱۹۱۶ء) اور اردو کی تاریخ موسوم بہ ”داستان اردو“ نے مستقل کتاب کی صورت میں آپ کی شہرت کو غیر فانی بنا دیا۔ آپ کا انتقال پر ممال ۱۲ دسمبر سنہ ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ میں ہوا۔ نصیر حسین خیال جس پایہ کے نثر نویس تھے اس کا خیال کر کے اگر اُن کو آزاد ثانی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ وہی دہلی کی نکسالی نرم و شیریں زبان ہے وہی روانی اور فصاحت انکی عبارت کی بھی جان ہے جس طرح آزاد روزمرہ اور عام فہم الفاظ سے تاثر کا طلسم باندھتے تھے ویسا ہی اُن کو بھی زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ زور کے موقع پر زور اور غمناک منظر کیلئے نہایت چبھتے ہوئے دل ہلادینے والے الفاظ ہر جگہ آپ کو ان کے یہاں نظر آئینگے۔ ہر موقع کی تصویر نہایت دلچسپ پیرایہ میں پیش نظر کر دینا ان کا خاص رنگ ہے۔ آپ کی عبارت میں شروع سے اخیر تک کہیں بھی ناہمواری نہیں ملے گی فارسی اور عربی کے ادق الفاظ اور ہندی کے نہایت الفاظ بھی کبھی کبھی استعمال کرتے ہیں مگر اس حسن سے کہ یکسانیت معروح نہ ہونے پائے۔ آپ کے اسلوب بیان میں یہ خوبی ہے کہ جس فضا کو بیان کرنا چاہتے ہیں اسی قبیل کے الفاظ اور جملے بھی لاتے ہیں تاکہ

زندگی، شب زندگی، ماہِ عجم و محبوبہ خدادند وغیرہ - طبقہ نسواں کی اصلاح اور بہبودی آپ نے ساری عمر مد نظر رکھی اور اسی مقصد کے پیش نظر آپ نے ”عصمت“ اور ”بنات“ دو ماہانہ رسالے بھی جاری کئے - ۱۹۳۶ء میں آپ کا انتقال ہوا -

نصیر حسین خیال

آپ کا نام نصیر حسین خان خیال تخلص اور ادیب الملک لقب تھا - آپ پٹنہ عظیم آباد کے ایک نہایت موقر و قدیم خاندان میں ۲۱ مارچ سنہ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے - آپ کے والد ماجد نواب سید نوروز حسین خان بعالم جوانی آپ کو تین سال کا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے - آپ کی دادی نواب فاطمہ بیگم صاحبہ نے اپنے یتیم پوتے کی پرورش و تربیت اپنے ذمہ لی - یہ بیگم صاحبہ نواب محمد عیسیٰ خان کی صاحبزادی، پانی پت اور دلی سے تعلق رکھتی تھیں - انکی معاشرت و اداب اور انکی زبان دہلوی تھی - آپ کی نانی نواب عارفہ بیگم صاحبہ نواب مہدی علی خان کی دختر تھیں یہ بھی دہلی نژاد اور پانی پتی تھیں - اسکے علاوہ آپکے دادا نواب محمد معسن خان اور آپ کے نانا نواب سید محمد عباس خان بھی دہلوی تھے - یہ خاندان پچھان خصوصاً دہلی سے فرخ سیر اور محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں عظیم آباد آیا اور بس گیا - ہمارے ممدوح کے بزرگوں کو شاہان مغلیہ کی طرف سے صوبہ بہار میں جاگیریں اور آل تمغا عنایت ہوئے تھے - وہ حضرات اپنی جائداد اور ریاست کی خاطر پورب تشریف لائے اور وہاں گھر بنا کر رہے - غرض آپ کا خاندان تقریباً دوسو سال سے عظیم آباد کو دہلی کا نمونہ بنانا رہا ہے - اس خاندانی تعلقات کی بغا پر آپ کی اردو اپنے بزرگوں کی طرح خالص اور نکسالی سمجھی گئی - آپ کے گھر کی معاشرت و تہذیب اور زبان شہر میں ہمیشہ مانی گئی اور اسکی تقلید کی گئی - ابھی آپ سات سال ہی کے تھے کہ آپ کی دادی صاحبہ رحلت کر گئیں اور آپکی پرورش و تربیت کا ذمہ آپکے عم محترم نواب سید جعفر حسین خان جعفر مرحوم اور آپکے اموائے معظم حضرت

برائیوں کو ایک مؤثر پیرائے میں طشت از بام کر کے ان سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ مغربی تہذیب کی گورانہ تقلید سے روکنے کیلئے وہ اپنے بہت سے کرداروں کو خرابیوں میں مبتلا دکھا کر تباہ و ہلاک کر دیتے ہیں۔ اس طرح ایک عبرت انگیز نقشہ نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ جس کو دیکھ کر طبیعت عرصے تک بے چین رہتی ہے۔

وہ ایک بڑی حد تک قدامت پسند واقع ہوئے تھے اور نئی روشنی کی تعلیم و تربیت کو ایک فریب سمجھ کر نہایت بے دردی سے اسکا انکشاف کرتے تھے۔ وہ تعلیم نسواں کے حامی تھے۔ لیکن تربیت کو عورت کی زندگی کا زیور سمجھتے تھے۔ انکے افسانوں کے کرداروں کی زندگی ہماری زندگی سے ملتی جلتی ہوئی ہے۔ اسی لئے ان کا عروج اور زوال ہمارے لئے کافی اثر رکھتا ہے۔ ایک افسانہ نگار سے زیادہ ان کی وقعت ہماری نظروں میں ایک مصلح کی حیثیت سے ہے۔ انہوں نے مختلف عنوانات کے ماتحت یہ کوشش کی ہے کہ عورت کی زندگی کس طرح کامیاب بن سکتی ہے۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے بچوں کی فطرت کا بھی کافی مطالعہ کیا ہے۔ اور نہایت کامیابی کیساتھ ان کی ذہنی نشرو نما کا اندازہ کر کے قصہ کو غیر فطری ہونے سے بچالیا ہے۔ انکی تحریر نہایت آسان اور غیر مبہم ہوا کرتی ہیں۔ مختصر جملوں سے بیان کو نہایت دلاویز بنا دیتے ہیں۔ اور اثر پیدا کرنے کے لئے کبھی کبھی معقوف عبارت بھی لکھ جاتے ہیں۔ انکے یہاں مزاح لطیف اور منظر نگاری کی کمی ہے لیکن اسکی تلافی ان کے دلکش مکالموں سے ہو جاتی ہے۔ ان کی تحریر میں دلی کی زبان کا پورا لطف حاصل ہو جاتا ہے۔ نسوانی معازرات سے رنگینی پیدا کر دینا انکے لئے کوئی بات نہیں۔ راشد الخیری فطری طور پر حزن و ملال کے دلدادہ تھے۔ ان کا ہر افسانہ بیکسی کا مرقع اور یاس کی تصویر ہے۔ اسی رجحان کے سبب انکے نام کے ساتھ ”مصور غم“ کا لقب بہت زیب دیتا ہے۔ وہ اردو کے ان چند خوش قسمت مصنفوں میں تھے جن کی کتابیں کثیر التعداد ہونے کے باوجود بھی قبول عام کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ بار بار چھپتی ہیں اور بک جاتی ہیں۔ آپکی تصانیف کی تعداد تیس سے کم نہیں۔ جن میں سے چند مشہور یہ ہیں۔ سمرنا کا چاند، صبحِ زندگی، شام

علوہمتی، شرافت، سوسائٹی کی پوری کیفیت کا نقشہ ان کے کلام میں اس طرح پایا جاتا ہے جیسے آئینے کے اندر تصویر، عیوب کو بھی ایسے ظریفانہ طریقہ پر بیان کرتے ہیں کہ سچی تصویر پیش نگاہ ہرجاتی ہے اور برا بھی نہیں معلوم ہوتا۔ منظر نگاری میں مصور کی آنکھ اور شاعر کے دماغ سے کام لیتے ہیں۔ زبان شستہ اور پاکیزہ ہے۔ البتہ علمی نمک کی چاشنی کم ہے۔ سرشار کی طبیعت میں اس قدر تمسخر تھا کہ جب وہ ناصح بننا چاہتے ہیں تو ناکامیاب نظر آتے ہیں۔ انکی ناروں میں عام طور سے پلاٹ غیر مربوط ہوتا ہے۔ کردار نگاری میں انکا قلم ایک سا نہیں چلتا۔ البتہ مکالمہ میں ان کو ہر انشاء پرداز پر فوقیت ہے۔ بول چال میں وہ اپنے ناول کے گوشہ گوشہ کو روشن کر دیتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ جس طریقہ کا کیریکٹر ہوتا ہے ویسے ہی الفاظ آسکتے اظہار خیالات کیلئے لاتے ہیں لیکن کبھی کبھی شوقیانہ الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ سرشار کی شہرت ملک میں چاروں طرف پھیل گئی۔ سنہ ۱۸۹۵ء میں وہ حیدرآباد تشریف لے گئے جہاں حضور نظام اور مہاراجہ سرکش پرشاد نے انکی کافی قدر دانی کی۔ حیدرآباد میں کچھ عرصہ تک ”دہدبہ آصفیہ“ بھی نکالتے رہے۔ کثرت سے نوشی نے اتنے قابل قدر دماغ کو قبل از وقت خراب کر دیا اور سنہ ۱۹۰۲ء میں انکا انتقال حیدرآباد ہی میں ہوا۔

راشد الخدیوی

ڈاکٹر نذیر احمد کی طرح علامہ راشد الخیری بھی عورتوں کی اصلاح و ترقی کے حامی ہیں۔ انکے تمام افسانے اور ناول دیکھنے کے بعد یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے صنف نازکی کی تمام کمزوریوں اور خرابیوں کا مطالعہ نہایت دلچسپی سے کیا ہے اور اسی کو اپنی تحریر کا موضوع قرار دیا۔ وہ نہایت ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ رسم و رواج پر تنقید کرتے ہیں۔ اور انکی تمام

۔۔۔ سرشار

آپ سنہ ۱۸۴۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابھی صرف چار سال کے تھے ہی کہ سایہ پدری سے محروم ہو گئے۔ اس زمانہ میں عربی اور فارسی کی تعلیم بچپن میں ایک لازمی چیز تھی۔ سرشار نے بھی شروع کر دی۔ اور تھوڑے عرصہ میں کافی دستگاہ حاصل کر لی۔ جب انگریزی تعلیم کا رواج ہوا تو کیننگ کالج میں داخل ہو گئے۔ مگر کوئی ڈگری حاصل نہ کر سکے۔ سلسلہ معاش کیلئے کھیری کے ضلع اسکول میں مدرسہ کر لی۔ سرشار کو بچپن ہی سے انشا پردازی کا از حد شوق تھا۔ کشمیریوں کے رسالے موسوم بہ ”مرسلہ کشمیر“ میں مضامین دینا شروع کر دیا۔ اردہ پنج بھی اپنی خوبیوں کی وجہ سے مقبول عام ہو رہا تھا۔ سرشار نے اس میں بھی مضامین بھیجنا شروع کئے۔ انکے طرز اسلوب نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ترجمہ کا شوق بھی سرشار کو کم نہ تھا۔ اس پر انہیں پورا عبور حاصل تھا۔ جب انہوں نے علم طبعی کی ایک کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ گو مضمون نہایت مشکل تھا مگر ترجمہ اس خوبی کیساتھ کیا گیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ نہیں ہے بلکہ تصنیف ہے اس کتاب کا نام انہوں نے ”شمس الضحیٰ“ رکھا۔ اس سے انکی شہرت روز افزون ترقی کیساتھ ملک میں پھیلائے لگی۔ یہاں تک کہ منشی نول کشور نے ان کو ”اردہ پنج“ کی ایڈیٹری کیلئے منتخب کر لیا۔ سرشار کی ایڈیٹری کیوجہ سے اردہ پنج اخبار کو جو عروج نصیب ہوا وہ اس کے لئے معراج کمال تھا۔ سرشار نے اپنی مشہور کتاب ”فسانہ آزاد“ کی بنیاد اسی اخبار سے شروع کی۔ اور یہی کتاب اردو ناول نویسی کی سنگ بنیاد مانی گئی۔ گرچہ اردو ناول نویسی کی ابتدا ڈاکٹر اذیر احمد کے ہاتھوں ہو چکی تھی۔ فسانہ آزاد کے سوا اور چند کتابیں بھی آپ کی ہیں جو بہت ہی مشہور اور مقبول ہیں مثلاً سیر کہسار، کامنی۔ یہی کہاں وغیرہ۔ سرشار کے بیان میں شگفتگی، زبان میں پاکیزگی، طرز ادا میں سلاست۔ آمد میں جوش، محاورہ میں صفائی، روزمرہ میں لطافت، لکھنؤ کی مٹی ہوئی حالت، تہذیب طرز معاشرت، زبان، سلیقہ

خیالی سے تدگ آکر ندرہ کو بھی خیرباد کہا اور اعظم گڑھ میں آکر دار المصنفین کی بنیاد ڈالی۔ جسکا مقصد یہ تھا کہ عمدہ مصنفوں کی ایک جماعت تیار ہو جائے۔ اس غرض کی تکمیل میں انہوں نے اپنی جائداد وغیرہ بھی وقف کر دی۔ شبلی کی شہرت اب نہ صرف ہندوستان میں چاروں طرف ہو رہی تھی بلکہ ہندوستان کے باہر بھی انکی علمی خدمات کا اعتراف کیا جا رہا تھا۔ سنہ ۱۸۸۴ء میں گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ اس سے پہلے ۱۸۸۲ء میں سلطان ترکی نے تمغہ مجیدی عنایت فرمایا تھا۔ سیرۃ النبی آپ کی آخری تصنیف تھی۔ چاہتے تھے کہ اس اہم کام کو بھی اپنے ہاتھوں انجام دیں۔ لیکن افسوس یہ حسرت پوری نہ ہو سکی۔ ابھی پہلی جلد بھی تمام نہ ہوئی تھی کہ سنہ ۱۹۱۴ء میں آپ نے انتقال فرمایا۔

شبلی نے مختلف موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ انکی ہمہ گیر طبیعت نے علم کلام، تنقید، سیرۃ، ہر میدان میں اپنی تیزی دکھائی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ نام تاریخ اور تنقید کے میدان میں ہوا۔

تاریخ نویسی میں آپ کا اسلوب بیان نہایت دلچسپ اور دلکش ہے۔ فن تنقید کو آپ نے اردو میں بہت کچھ فروغ دیا۔ اُسکے اصول قائم کئے۔ شعر العجم اور موازنۃ انیس و دبیر لکھ کر آپ نے لوگوں کو عمل کا بھی راستہ بتا دیا۔ آپکی طرز تحریر میں عموماً صفائی اور سادگی ہے۔ مضمون کی خشکی رفع کرنیکے لئے دلچسپ تشبیہ اور استعاروں سے بھی جابجا کام لے لیتے ہیں۔ الفاظ نیز روزمرہ عام پسند ہوتے ہیں۔ لیکن زور کے موقع پر عربی اور فارسی کے بھی الفاظ استعمال کر کے اپنے مفہوم کو واضح کرتے ہیں۔ آپ کا اسلوب بیان ایسا ہے کہ بلند سے بلند مضامین اس میں سلیس اردو کیساتھ لکے جاسکتے ہیں۔ عبارت میں ایک خاص وصف یہ ہے کہ جو مزہ تقریر سے حاصل ہوسکتا ہے وہ آپکی تحریر میں بھی قائم رہتا ہے۔ آپ پہلے شخص ہیں جو لکھنؤ یا دہلی کے رہنے والے نہ تھے مگر پھر بھی زمانہ نے آپ کی تحریر کو مستند سمجھا۔

امین دیوانی ہو گئے۔ لیکن حوصلہ مندوں نے اسے بھی چھڑا دیا۔ اور اب استعفیٰ دیکر گھر بیٹھے عامی مشاغل میں دن گزارنے لگے۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں بھائی سے ملنے کیلئے علی گڑھ گئے۔ وہاں سرسید مرحوم سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے علامہ کو فارسی کی پروفیسری عطا کی۔ علمی ذوق نے انہیں اس عطیہ کو قبول کرنے پر مجبور کیا۔ علی گڑھ کی فضا شبلی کی علمی نشو و نما کے حق میں بہت مفید ثابت ہوئی۔ یہاں نہ صرف سرسید کے کتب خانہ کو دیکھنے کا موقع ملا۔ بلکہ اہل علم کی صحبت بھی حسبِ دلخواہ نصیب ہوئی۔ قومی جوش جو انکے دل میں فطرتاً موجود تھا اسے آدمیوں میں سرسید اور کتابوں میں ”سنین الاسلام“ مصنفہ محمد حسین آزاد نے اور بھی ابھار دیا۔ شبلی نے اسلام کی گذشتہ شان و شوکت کو دنیا کے سامنے نئی آب و تاب کے ساتھ پیش کر کے مسلمانوں کی رگ حمیت میں جوش پیدا کرنیکی کوشش کی۔ مسلمانوں کی نامور ہستیوں کو پیش کر کے اپنی بے حس قوم کو بیدار کرنا چاہا اور اس سلسلہ میں الامون، الفاروق، سیرۃ النعمان، الغزالی وغیرہ مختلف اوقات میں لکھیں۔ ان میں سے بعض کتابوں کے مواد اکٹھا کر نیکے لئے ان کو مصر و شام اور قسطنطنیہ جانا پڑا۔ سرسید کے انتقال کے بعد سنہ ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے سلسلہ قطع کر کے اعظم گڑھ چلے آئے اور مستقل قیام کا ارادہ کر لیا۔ مگر مواری سید علی بلگرامی کی کوششوں نے انہیں حیدرآباد جانے پر مجبور کیا۔ شبلی یہاں چار سال تک بحیثیت ناظم محکمۂ تعلیم کام کرتے رہے۔ اور سلسلہ آصفیہ میں کئی کتابیں لکھیں۔ علم الکلام، الکلام، الغزالی، موزانہ انیس و دبیر، سوانح مولانا روم۔ یہ سب قیام حیدرآباد کی تصانیف ہیں۔

سنہ ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء اس غرض سے قائم کیا کہ نصاب تعلیم کی اصلاح، علوم دین کی ترقی، علماء کی باہمی نزاع کا انسداد، عام مسلمانوں کی بہبودی اور فلاح کی تدبیریں سوچی جائیں۔ آپ نے ابتدائی سے اسمیں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ حیدرآباد میں جب انہیں معلوم ہوا کہ ندوۃ العلماء کی حالت ابتر ہو گئی ہے تو استعفیٰ دیکر لکھنؤ چلے آئے۔ اور ندوۃ کی تربیتی کشتی کو سنہالتے رہے۔ لیکن سنہ ۱۹۱۳ء میں لوگوں کی تنگ

کی کوشش کی ہے کہ فن تاریخ میں بھی ادبیات اور دلچسپی کیونکر قائم رکھی جاسکتی ہے۔

آزاد کی خصوصیات میں سب سے نمایاں اور دلکش جوہر ان کی طرزِ تحریر ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور زبان کی شیرینی، معارروں کی صحت اور جابجا تشبیہ اور استعاروں کی گل کاری سے عبارت میں وہ حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ پڑھتے چلے جائیے اور سیری نہیں ہوتی۔ اُن کے معاصرین شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، حالی وغیرہ اُن کو نہایت قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مولانا شبلی نے تو اُنکی موت پر ان کو ”خدائے اردو“ کہہ کر یاد کیا تھا۔ انکے قلم کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے کہ مراد خواہ کتنا ہی کم ہو۔ صفحے کے صفحے لکھتے جاتے ہیں اور تاثیر و لطف میں کمی نہیں آتی۔ اُنکی عبارت کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ تحریر میں لوچ اور موقع پر زور خاص طور پر پیدا ہو جاتا ہے۔ گویا ایک کمان میں دو تیر ہر وقت رھتے ہیں اور جس تیر سے دل پر چوٹ کی جاسکتی ہے اُسی کو کام میں لاتے ہیں۔ آزاد کا قلم سوز و گداز کی تصویر اس خوبی سے اُتارتا ہے کہ نثر میں شعر کا درد و اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ آزاد کا انتقال سنہ ۱۹۱۰ء میں ہوا۔

شبلی

شبلی سنہ ۱۸۵۷ء میں بمقام بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولوی شکر اللہ نامی ایک شخص سے حاصل کی۔ بعد اِظے رقت کے مشہور مولوی محمد فاروق صاحب چڑیا کوٹی سے عربی کی مفتھی کتابیں پڑھیں۔ تلاشِ علم کیلئے رامپور، لاہور، سہارن پور اور لکھنؤ کا سفر کرتے رہے۔ بہترین اُستادوں سے معقول، حدیث و فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ علمی فراغت کے بعد گھر والوں کے اسرار سے رکالت بھی پاس کر لیا۔ اور چند عرصے تک رکالتی بھی کی۔ لیکن یہ پیشہ پسند نہ آیا۔ اسے چھوڑ کر سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ اور

عمر بھر کی کمائی جس کو آزاد اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے ضائع ہو گئی ۔ کچھ دنوں تک آزاد کس مہرسی کی حالت میں ادھر ادھر مارے پھرے ۔ آخر میں لاہور پہنچے اور سررشتہ تعلیم میں پندرہ روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے ۔ مگر قابلیت کے زور سے رفتہ رفتہ رہ شہرت حاصل کی کہ پنجاب گورنمنٹ کی نظروں میں سما گئے ۔ گورنمنٹ نے ان سے قصص ہند اور دوسری درسی کتابیں لکھوائیں ۔ جو بہت مقبول ہوئیں ۔ گورنمنٹ نے انہیں ایک مرتبہ علمی خدمات کے سلسلے میں کابل اور بخارا بھی بھیجا ۔

آزاد کے کارنامے اردو ادب میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں ۔ انہوں نے نہ صرف مختلف کارآمد نظم لکھ کر اردو شاعری کو راہ راست پر لانیکی کوشش کی بلکہ نثر میں بھی ایسی تصنیفات اپنی یادگار چھوڑیں جو اس سے پہلے نظر نہ آتی تھیں ۔ رمزیہ اور کفایہ افسانہ اردو ادب کی باقاعدہ تاریخ علم اللسان پر سخن دان فارس وغیرہ ایسے کارنامے ہیں جو اردو میں اس سے پہلے نہیں لکھے گئے ۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد کا مرتبہ خدمات اور احسانات کی وجہ سے قریب قریب اردو کے تمام انشاء پردازوں سے بلند ہے ۔ آزاد کی ہمہ گیری تبصر علمی اور اردو کی محبت نے اردو ادب کو تنگنائے خیال اور مضامین سے نکال کر کئی ایک نئے میدان دکھائے ۔ نظم جدید کی ایجاد کا سہرا آزاد ہی کے سر ہے ۔ نثر میں ”آب حیات“ لکھ کر انہوں نے نہ صرف اردو ادب کی تاریخ کو صحیح راستہ پر لگادیا ۔ بلکہ فن تنقید کا بھی معیار اردو میں قائم کر دیا ۔

آزاد نے ایک دوسرا میدان بھی اردو ادب کو دکھایا ہے ۔ انگریزی اور یونانی ادب سے متاثر ہو کر ایسے اخلاقی اور نتیجہ خیز خیالی افسانوں کی بنیاد ڈالی جو غالباً اردو کیلئے بالکل نئی چیز تھی ۔ انگریزی میں اس قسم کے افسانوں کا نام ”ایلی گری“ ہے جس کو اردو والے ”رمزیہ“ کہتے ہیں ۔

تیسرا نیامیدان جو آزاد نے اردو والوں کو دکھایا وہ علم السنہ یا ”فیلولوجی“ کا تھا جس میں علامہ اور باتوں کے الفاظ کی پیداوار ترقی تغیر کا دھنگ بتایا ہے ۔ اس کتاب کا نام ”سخندان فارس“ ہے ۔ دربار اکبری بھی آزاد کا مقبول کارنامہ ہے ۔ اس کتاب میں تفصیلی حالات کے علاوہ آزاد نے اس بات کے دکھائے

ایک "سائینڈیک سوسائٹی" قائم کی - جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان مغرب کی ترقی اور خیالات سے آگاہ ہوتے رہیں - سنہ ۱۸۶۱ع میں ایک انگریزی اسکول مراد آباد میں سنہ ۱۸۶۴ع میں دوسرا اسکول غازیپور میں کھولا - ایک اور انجمن انہوں نے قائم کی جس کا نام "برٹش انڈیا ایسوسی شن" تھا - اُن کو مسلمانوں کی اصلاح کا خیال شروع سے تھا - چنانچہ سنہ ۱۸۹۶ع میں ولیمٹ گئے سال بھر کے بعد ہندوستان واپس آئے اور یہاں آکر اپنے منصوبے کی تکمیل کیلئے رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا جس میں مذہبی اور اخلاقی مضامین ہوتے تھے - منشاء یہ تھا کہ مسلمانوں کے خیالات میں وسعت اور ترقی پیدا ہو جائے -

سر سید کا سب سے بڑا کارنامہ علی گڑھ کالج ہے - پنشن لینے کے بعد انہوں نے اس کالج کی ترقی کیلئے ہمہ تن کوشش ہو کر کام کیا - سنہ ۱۸۷۷ع کے شروع میں کالج کا بنیادی پتھر لارڈ لیٹن کے ہاتھوں سے رکھا گیا - اس وقت سے سر سید نے مرتے دم تک جس جانکاهی اور دراندیشی سے اس کالج کی ترقیوں کی فکر کی ہے وہ آپ اپنی مثال ہے - سنہ ۱۸۹۸ع میں سر سید نے طویل عمر پا کر انتقال کیا اور اپنے محبوب کالج کی مسجد میں دفن گئے گئے -

آزاد

محمد حسین نام اور آزاد تخلص تھا - انکے والد کا نام محمد باقر تھا - خاص دلی کے رہنے والے تھے - سنہ ۱۸۳۲ع میں پیدا ہوئے - جب آزاد نے ہوش سنبھالا تو انکے والد نے بیٹے کو اپنے عزیز دوست محمد ابراہیم ذوق کے سپرد کیا - جن کا سایہ عاطفت میں آزاد کی تعلیم و تربیت ہوئی - غدر کے ہنگامے میں آزاد پر وہ مصیبتیں پڑیں کہ دنیا نظروں میں سیاہ ہو گئی - مولوی محمد باقر شہید ہوئے - گھر بار لت گیا - غضب یہ ہوا کہ استاد ذوق کی

کتابوں کا مطالعہ ہمیشہ کرتے رہے۔ چنانچہ ملازمت ہی کی حالت میں اپنی مشہور کتاب آثار الصداۃ تصنیف کی۔ یوں تو آپ کی تصانیف کئی ایک ہیں مثلاً ”خطبات احمدیہ“۔ ”تاریخ سرکشی بجنور“ وغیرہ۔ لیکن سب سے زیادہ اثر اردو پر آپکا مشہور رسالہ ”تہذیب الاخلاق“ کا پڑا۔ جب مذہبی چھیڑ چھاڑ اس رسالہ میں شروع ہوئی تو جواب دینے والوں نے بھی خوش قسمتی سے وہی طرز بیان اختیار کیا جو خرد سرسید کا تھا۔ اور چونکہ یہ سلسلہ عرصہ تک قائم رہا۔ لہذا ایک اچھا ذخیرہ سلیس اور عام فہم اردو زبان کا تیار ہو گیا۔ اور لوگ اسوقت اُسی رنگ میں لکھنے کے عادی ہو گئے۔ چنانچہ اُس وقت سے ہر انشاء پرداز نے یہی روش اختیار کی۔ غالباً سرسید پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو نثر میں علمی مضامین کو سادگی و ممانت کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ آپ کا طرز بیان عام طور سے تشبیہات و استعارات و بدائع سے پاک ہے۔ جس بات کو لکھتے ہیں اس کو دلیل سے مضبوط کرنیکی پوری کوشش کرتے ہیں اور مشکل سے مشکل مضمون کو نہایت آسانی کے ساتھ ادا کر جاتے ہیں انکے کلام میں سچائی اور بیباکی خاص جوہر ہیں۔ الفاظ نہایت سیدھے سادے اور روزمرہ کے استعمال کرتے ہیں۔ کہیں کہیں بذلہ سنجی اور شگفتگی بھی پائی جاتی ہے۔ منظر اور موقع کی تصویر الفاظ سے نہایت خوبی کے ساتھ کھینچتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ عبارت کبھی کبھی بے لطف و ناہموار ہو جاتی ہے۔ اپنے جوش اصلاح اور اظہار خیال میں اتنے آزاد تھے کہ قواعد کی پابندی اپنے لئے زیادہ ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ جو لفظ اُن کا مفہوم پورا کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا اُس کو فوراً استعمال کر جاتے تھے۔ عبارت کبھی کبھی گلابی اردو کا مزہ بھی دیتا جاتا ہے۔ معاررے بھی کبھی ثقیل آجاتے ہیں لیکن جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پہلا قدم اصلاح کیلئے اُٹھتا ہے تو کتنی دشواریوں کا ساءا کرنا پڑتا ہے۔ نب معمولی خامیاں بھی بے وقعت نظر آتی ہیں۔

قوم و ملک کیسانہ جو کچھ سرسید نے احسان کیا وہ دنیا میں روز روشن کی طرح روشن ہے۔ ”آثار الصداۃ“ کی تصنیف کے بعد آپ نے

شعرو سخن سے طالب علمی کے زمانے میں شوق ہوا۔ داغ دہلوی سے تلمذ حاصل کیا۔ بچے تغزل کی طرف طبیعت مائل ہوئی پھر ”نیسچرل“ شاعری میں ایک نئی روح پھونکی۔ اسلام اور فلسفۂ زندگی اور تصوف پر متعدد نظمیں لکھیں جو نہایت مقبول ہوئیں۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں آپ کو ”سر“ کا خطاب ملا۔

آپ کی بعض نظموں کا ترجمہ انگریزی اور اردو زبانوں میں ہوا اور آپ کی شہرت نے ایک بین الاقوامی حیثیت حاصل کی۔

آپ کی وفات ۲۱ اپریل سنہ ۱۹۳۸ء کو ۶۳ برس کی عمر میں ہوئی۔ آپ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔

آپ کی تصانیف یہ ہیں۔ بانگ درا۔ بال جبریل۔ ضرب کلیم۔ اسرار خودی۔ رموز بیخودی۔ پیام مشرق۔ زبور عجم۔ جاوید نامہ و مسافر۔

سر سید احمد خان

آپ کی ولادت دہلی میں سنہ ۱۸۱۷ء میں ہوئی۔ آپ کے آباء و اجداد شاہجہان کے وقت میں دامنغان، ہمدان اور ہرات میں کام کرتے ہوئے ہندوستان آئے۔ اور اسی وقت سے شافی دربار میں رسائی ہوئی۔ جس کا سلسلہ عالمگیر ثانی کے وقت تک قائم رہا۔ جنہوں نے سر سید کے دادا کو جواد الدولہ کا خطاب بھی دیا۔ اکبر شاہ ثانی نے سر سید کے والد میر متقی کو عہدۂ وزارت کے لئے نامزد کیا۔ مگر انہوں نے اپنی قناعت پسندی کی وجہ سے انکار کر دیا۔ سر سید کی تعلیم و تربیت ان کی والدہ کے زیر سرپرستی ہوئی۔ سنہ ۱۸۳۷ء میں سر سید نے ملازمت کر لی اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے صدر امین کے درجہ تک پہنچ گئے۔

سنہ ۱۸۹۱ء میں آپ کو سرکار نے خطاب ”خان بہادر“ عطا کیا اور ایک ہزار روپیہ سالانہ انہیں برابر ملتا رہا۔

نواب سید نصیر حسین خیال مرحوم جو اردو کے مشہور ادیب تھے آپ کے بھانجے تھے۔

حضرت شاد نے سنہ ۱۹۲۷ء میں انتقال کیا۔

وحشت

آپ کا نام رضا علی ہے۔ آپ سنہ ۱۸۸۱ء میں بمقام کلکتہ پیدا ہوئے۔ مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے بھرپور انگریزی میں تعلیم پائی۔ فن شعر سے طالب علمی ہی کے زمانے سے ربط تھا۔ مولوی ابوالقاسم محمد شمس ولد نساخ مرحوم سے تلمذ حاصل کیا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں آپ کا دیوان شائع ہوا جسکی نسبت مولانا حالی ’ظہیر دہلوی‘ علامہ شبلی ’شوق قدوائی‘ ڈاکٹر اقبال اور دیگر اکابر عصر نے تحسین آمیز کلمات تحریر فرمائے۔

آپ امپیریل رکارڈ دیپارٹمنٹ کے چیف مولوی تھے اور جب سنہ ۱۹۲۶ء میں اسلامیہ کالج کلکتہ قائم ہوا تو اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں سرکار نے ’خان بہادر‘ کا خطاب عطا کیا۔ فی الحال سرکار سے وظیفہ پاتے ہیں۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال

آپ کی ولادت سنہ ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ ہوئی۔ آپ کے آبا و اجداد پندتان کشمیری تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد تین سال یورپ میں رہے اور سنہ ۱۹۰۸ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لیکر واپس آئے۔ ۱۹۳۴ء تک بیرسٹری کرتے رہے۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
 همکو غریب جانکے هنس هنس پکار کے
 دہلی کہ ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
 رھتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
 اُسکو فلک نے لوٹکے برباد کر دیا
 ہم رھنے والے ہیں اُس اُجڑے دیار کے
 دہلی کی بربادی کے بعد لکھنؤ پہنچے اور نواب آصف الدولہ نے آپکے لئے
 ایک معقول وظیفہ مقرر کر دیا۔
 آپ اردو کے استاد مسلم الثبوت ہیں۔ غزل میں آپ کا جواب نہیں۔
 عجب سوز و گداز ہے عجب لطف زبان ہے۔ ”میر کے بہتر نشتر“ مشہور
 ہیں اگرچہ آپ کے دلپسند اشعار کی تعداد کثیر ہے۔ چھ دیوان اور متعدد
 مثنویاں آپکی یادگار ہیں۔ آپکے همعصر شعراء میں سودا اور درد بڑے صاحب
 کمال گزرے ہیں۔ آپکی وفات سنہ ۱۶۲۵ھ (سنہ ۱۸۱۰ع) میں ہوئی۔

شاد عظیم آبادی

شاد تخلص سید علی محمد نام آپکی ولادت سنہ ۱۸۴۶ عیسوی میں
 بمقام عظیم آباد ہوئی۔ والد کا نام سید محمد عباس میرزا تھا جنکا شمار
 عظیم آباد کے عالی خاندان رؤسا میں تھا۔
 عین شباب سے فن شعر کی طرف مائل رہے اور پوری زندگی اسکی خدمت
 میں وقف کر دی۔ مشاہیر شعراء میں آپ کا پایہ ہمیشہ ممتاز سمجھا گیا۔
 تلامذہ کثیر آپ کے خرمین فیض کے خوشہ چیں ہو کر سرفراز ہوئے۔ غزل
 کی طرف آپکی توجہ خاص طور پر رہی۔ ساتھ ہی اسکے فن مرثیہ گوئی
 کمال پیدا کیا۔ ایک مجموعہ آپکی غزلیات کا موسوم بہ ”کلام شاد“
 دار المصنفین اعظم گڑھ کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا۔ آپکی تصانیف میں
 ایک ناول صورتۃ الغیال بھی مشہور ہے۔

میرزا فرحت اللہ بیگ بی - ۱۷

دہلی کے رہنے والے ہیں - حیدر آباد دکن میں اسسٹنٹ سکریٹری تھے - نہایت عمدہ ظرافت آمیز مضامین لکھتے ہیں - زبان تہیّہ دلی کی نکسالی ہے - واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو چشم دید مشاہدات کا لطف آجاتا ہے - مضامین کا مجموعہ اور دہلی کا ایک ”یادگار مشاعرہ“ کتاب کی صورت میں شائع ہو چکا ہے -

میر انیس

میر ببر علی نام میر مستحسن خلیق خلف میر حسن دہلوی کے بیٹے تھے - فیض آباد میں پیدا ہوئے لکھنؤ میں تربیت پائی - مرثیہ گوئی میں جو آپ کا آبائی فن تھا کمال حاصل کیا - آپکے ہم عصر میرزا دبیر تھے - دونوں میں چشمک رہتی تھی اور دونوں با کمال استادوں کے بے شمار طرفدار تھے - میر انیس کی واقعہ نگاری ایک معجزہ ہے اور اس پر زبان کا مزہ کلام کے لطف کو دوبالا کر دیتا ہے - آپ مرثیہ پڑھتے بھی بہت خوب تھے - سنہ ۱۲۹۱ھ میں انتقال فرمایا -

میر

میر محمد تقی منغلص بہ میر سنہ ۱۱۳۶ھ میں اکبر آباد میں پیدا ہوئے - دہلی میں سکونت اختیار کی اور اسی کو اپنا وطن بنایا چنانچہ ایک قطعہ میں فرماتے ہیں -

درگیش نندنی کا اردو ترجمہ کر کے شائع کیا۔ اب پبلک انکی تحریرات کی مشتاق اور گرویدہ ہو گئی۔

سنہ ۱۸۸۷ ع میں اپنا رسالہ دلگداز جاری کیا۔ اس کے مضامین ایسے دلکش اور پسندیدہ ہوتے تھے کہ ہندوستان کے ہر سررشتہ تعلیم نے شرر کے مضامین کو اردو نصاب میں داخل کر لیا۔

سنہ ۱۸۸۸ ع میں دلگداز میں تاریخی ناول شروع کئے جو اس قدر مقبول ہوئے کہ اس وقت تک تیسویں ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

سنہ ۱۸۹۰ ع میں مہذب نام ایک اخبار جاری کیا جس میں علمائے اسلام کے سوانح عمری ہوا کرتے تھے۔

سنہ ۱۸۹۱ ع میں ”دلگداز“ اور ”مہذب“ دونوں کو بند کر کے حیدر آباد چلے گئے۔

سنہ ۱۸۹۵ ع میں نواب وقار الامرا بہادر کے چھوٹے بیٹے کے اتالیق ہو کر انگلستان گئے اور چودہ پندرہ مہینے رہے وہاں فرانسیسی زبان سیکھی۔ سنہ ۱۹۰۰ ع میں حیدر آباد سے لکھنؤ چلے آئے۔ مگر سنہ ۱۹۰۱ ع میں پھر بلائے گئے اور سنہ ۱۹۰۲ ع تک رہے۔ لکھنؤ آکر ”دلگداز“ پھر جاری کیا جو انکی زندگی میں کئی مرتبہ بند ہوا اور پھر جاری ہوا۔

سنہ ۱۹۱۸ ع میں پھر حیدر آباد بلائے گئے اور تاریخ اسلام لکھنے پر مامور کئے گئے۔ جس کے لئے ایک معقول رقم ماہوار انکو لکھنؤ گھر بیٹھے ملتی رہی۔ دو تاریخیں بھی لکھی ہیں ایک تاریخ سندھ اور دوسری تاریخ ارض مقدس۔ انکی چھوٹی بڑی تصنیفات کثرت سے ہیں جنکی تعداد ایک سو دو کے قریب ہے رسالے بھی بہت سے جاری کئے جو ایک مدت تک چلتے رہے۔ سنہ ۱۹۲۱ ع میں انتقال کیا۔

شرر نے سب سے پہلے اردو میں تاریخی ناول لکھے۔ قصے کے پلاٹ اور کیریکٹروں کی ترقی پر توجہ کی۔ ناول کو غیر مہذب الفاظ و مضامین سے پاک کیا۔ یہ ناول نویس ہی نہ تھے۔ بلکہ مورخ ڈرامہ نویس ادیب اور جریدہ نگار بھی تھے۔

مغربی شعرا اور مبصرین کی رائیں نہایت تفصیل سے بیان کی گئی ہیں اور نہایت مفید مشورے دیے ہیں۔ حیات جاوید میں سرسید مرحوم کی طویل اور کثیر الاشغال زندگی کے حالات نہایت وضاحت کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور انکی لائف پر بحیثیت ایک لیڈر۔ مدبر۔ ریفارمر اور اہل قلم کے بحث کی گئی ہے اس کتاب کا اردو زبان میں وہی درجہ ہے جو ڈاکٹر جانسن کی لائف مصنفہ باسویل کا انگریزی میں ہے۔

مولانا اخلاق مجسم تھے۔ کبھی کسی کی برائی انکی زبان سے نہیں سنی گئی۔ بقول احسن مارہروی یونانی خیالات کی رو سے مولانا ایک معتدل اور متوسط کامل انسان اور صوفیانہ خیالات کی رو سے ایک صاحب باطن ولی تھے۔ خدا توفیق دے کہ آئندہ نسلیں بھی انکی پیروی کریں۔

مولوی عبد الحلیم صاحب شرر

سنہ ۱۸۶۱ ع میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ انکے نانا دربار اودھ میں ایک معزز عہدہ دار تھے۔ شاہی خاندان کے ساتھ یہ بھی انگلستان گئے اور وہاں سے واپس آکر مدیابرج کلکتہ میں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں عربی فارسی اور کچھ انگریزی پڑھی۔ انیس سال کی عمر میں کلکتہ سے لکھنؤ آگئے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ یہاں عربی کی کتب درسیہ ختم کیں۔ پھر دہلی جاکر حدیث کی تکمیل کی۔ اسی عرصہ میں انگریزی کی بھی معقول قابلیت پیدا کر لی۔ سنہ ۱۸۸۰ ع میں اودھ اخبار کے ایڈیٹوریل سٹاف میں آگئے۔ اعلیٰ خیال آفرینی۔ فلسفیانہ رنگ اور ستھرے مذاق کے سبب سے انکے مضامین کی بہت شہرت ہو گئی۔ سرسید مرحوم نے بھی انکے مضمون کو جو ”روح“ کے عنوان سے تھا بہت پسند کیا۔ اسی زمانہ میں ایک ہفتہ وار رسالہ موسومہ ”محشر“ نکالا جو بہت مقبول ہوا۔ سنہ ۱۸۸۲ ع میں اودھ اخبار سے ترک تعلق کر لیا اور اپنا سب سے پہلا ناول ”دلچسپ“ شائع کیا۔ سال بھر کے بعد اس ناول کا دوسرا حصہ شائع کیا۔ اسکے دو سال بعد بنکم چٹرجی کے ناول

قابل قدر لا زوال ”مسدس حالی“ موسومہ ”بہ مد و جزر اسلام“ ہے ۔
حیات سعدی بھی اسی زمانہ میں شائع کی گئی تھی ۔

سنہ ۱۸۸۹ء میں سر آسمان جلاہ مدارالمہام حضور نظام دکن کی کوشش سے پچھتر روپیہ ماہوار وظیفہ حیدرآباد سے مقرر ہو گیا جو بعد میں سو روپیہ کر دیا گیا اور ملازمت سے مستعفی ہو کر پانی پت آ گئے ۔ اسکی ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ دہلی کی صحبت درہم برہم ہو گئی اور اہل کمال یکے بعد دیگرے راہی ملک بقا ہو چکے تھے چنانچہ اس کا اظہار اس شعر میں کیا ہے ۔

کوچ سب کر گئے دلی سے ترے قدر شناس
قدر یاں رہے اب اپنی نہ گنونا ہرگز

یہ زمانہ مولانا کی خاص خدمت علم اور تصنیف و تالیف کا ہے ۔
شعر و شاعری پر مقدمہ ۔ یادگار غالب اور حیات جاوید اس زمانہ کی یادگاریں ہیں ۔ بڑے علمی انہماک کی زندگی بسر کر کے سنہ ۱۹۱۴ء میں کچھ علالت کے بعد ۳۱ دسمبر کو راہی ملک بقا ہوئے ۔ مولانا کے علمی کارنامے بڑے زبردست ہیں ۔ فن تنقید سوانح نگاری پر سب سے پہلے قلم آپ ہی نے اٹھایا ۔ حیات سعدی ۔ یادگار غالب اور مقدمہ شعر و شاعری اس فن کی کتابیں ہیں ۔ سوانح نگاری بھی کی ۔ عمدہ نظیر ”حیات جاوید“ یعنی سرسید مرحوم کی لائف ہے ۔ نظم میں ”مکمل دیوان“ اور مسدس حالی کے علاوہ بہت سی مثنویاں اور قطعات وغیرہ ہیں ۔

مولانا کا پایہ شاعری اور نثر نگاری دونوں میں بہت بلند ہے ۔ اردو شاعری میں ایک نئی روح پھونک کر اردو شاعری میں فطری اخلاق اور قومی شاعری کے نئے عنصر کا اضافہ کیا ”مسدس حالی“ اپنی نظیر نہیں رکھتا بلکہ نواب امداد امام صاحب ’اثر‘ نے تو یہ لکھ دیا ہے کہ ایسا اخلاقی مسدس لکھنا محض حالی ہی کا کام تھا ۔ اسکے لئے تاریخی معاملات کی پوری واقفیت اور مبالغہ و استعارہ وغیرہ سے طبعی نفور لازمی چیزیں تھیں ۔ مقدمہ شعر شاعری فن تنقید پر اپنی نظیر آپ ہی ہے ۔ شعر کی ماہیت کے متعلق مشرقی اور

شیفتہ سے ملاقات ہوئی اور نواب صاحب نے مولانا کو اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کر لیا۔ سات آٹھ برس تک نواب صاحب کے ہاں رہے۔ نواب صاحب اور مولانا دونوں اپنا کلام میرزا غالب کو دکھاتے تھے نواب صاحب کی صحبت نے مولانا کے مذاق سخن پر بہت بڑا اثر کیا۔ مبالغہ سے پرہیز کرنا۔ حقائق و واقعات میں لطف پیدا کرنا۔ سیدھی سادی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا نواب صاحب کے نزدیک کمال شاعری ہے۔ چھپھورے اور بازاری الفاظ و معاورات اور عامیانہ خیالات سے نواب شیفتہ کو اور میرزا غالب دونوں کو نفرت تھی۔ ان خیالات کا اثر مولانا پر پڑا اور ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا جو فی الحقیقت صحیح مذاق ہے۔ سنہ ۱۸۶۹ء میں نواب شیفتہ کے انتقال کے بعد مولانا کو گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ایک جگہ مل گئی۔ یہاں انگریزی کتابوں کا ترجمہ ہوتا تھا۔ مولانا اس ترجمہ کی عبارت درست کرتے تھے۔ اس کام سے مولانا کی طبیعت کو انگریزی ادب سے گوشتہ مناسبت ہو گئی اور مشرقی ادب کی کم مائیگی کا احساس پیدا ہو گیا۔ اس زمانہ میں سررشتہ تعلیم پنجاب کا ایک اخبار نکلتا تھا جو بعد میں ”اتالیق پنجاب“ کے نام سے موسوم ہو کر ماہوار رسالہ بن گیا تھا۔ مولانا کچھ عرصے تک اسکے نائب ایڈیٹر بھی رہے۔ ۱۸۷۴ء میں مولوی محمد حسین آزاد نے کرنیل ہالرائیڈ کے ایما سے ایک جدید طرز کا مشاعرہ شروع کیا۔ اس میں مصرع طرح کے بجائے مضمون کا عنوان شعرا کو بتایا جاتا تھا۔ اور شعرا اس پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ مولانا کی چار مثنویاں برکھارت، نشاط امید، تعصب، انصاف اور حب وطن انہیں مشاعروں کی یادگار ہیں۔ لیکن لاہور کی آب و ہوا مولانا کے موافق نہ تھی اس لئے گورنمنٹ عربک اسکول دہلی میں تبادلہ کرا لیا اور سنہ ۱۸۷۵ء تک وہیں رہے۔ درمیان میں پانچ چھ مہینے کو پھر لاہور چیفس کالج میں اتالیق مقرر ہو کر گئے۔ مگر رئیس زادوں میں رہنا پسند نہ کیا اور دہلی میں چلے آئے۔ یہ زمانہ مولانا کے اطمینان کا ہے کیونکہ درس و تدریس سے مولانا کی طبیعت کو بے حد لگاؤ تھا۔ اس زمانہ میں متعدد علمی کام کئے جنہیں سب سے زیادہ

مختار حالات مصنفین

منتخابات اردو

شمس العلماء حافظ خواجه الطاف حسین حالی

خواجه صاحب ۱۸۳۶ ع پانی پت میں پیدا ہوئے۔ آپکے والد نمک کے محکمہ میں سرکاری ملازم تھے۔ نو سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا تو پرورش اور تعلیم کا بار بھائی پر پڑا۔ بچے خواجه صاحب نے قرآن شریف حفظ کیا پھر فارسی اور کچھ عربی پڑھی۔ ابھی سترہ ہی سال کی عمر تھی اور تعلیم مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ شادی کر دی گئی۔ اب عزیز و اقربا مصر ہوئے کہ تعلیم ختم کر کے کھانے کمانے کا دھندا کرنا چاہتے۔ لیکن مولانا کا شوق علم ابھی تشنه تھا۔ چھپرہ دہلی چلے گئے۔ بڑی محنت تکلیف اور صعوبتیں جھیل کر عربی کی تکمیل کی۔ شعر و سخن کا چسکا بچپن ہی میں لگ گیا تھا۔ یہی شوق کشان کشان میرزا غالب کی خدمت میں لے گیا اور اس نے وہ اثر دیکھایا کہ الطاف حسین کو لا زوال حالی بنادیا۔ دہلی میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہ گذارا تھا کہ کنبہ والوں کو آپکا پتہ لگ گیا۔ اور بھائی آکر دہلی سے پانی پت لیگئے۔ یہ واقعہ سنہ ۱۸۵۵ ع کا ہے۔ پانی پت آکر بھی مطالعہ میں منہمک رہے۔ مگر کچھ روز بعد حالات کی مجبوری سے تلاش ملازمت کیلئے نکلے اور حصار پہونچے یہاں ضلع کے دفتر میں ایک اسامی قلیل تنخواہ کی ملگئی۔ ایک ہی سال نوکری کرنے پائے تھے کہ سنہ ۵۷ ع کا غدر پڑ گیا۔ مولانا کسی نہ کسی طرح گھر پہونچے۔ چونکہ اسوقت تلاش ملازمت کیلئے کسی دوسری جگہ نہیں جاسکتے تھے اسلئے جب تک پانی پت رہے تحصیل علم مطالعہ کتب اور شہر و شاعری میں مشغول رہے۔ چار سال بعد پھر دہلی پہونچے۔ یہاں نواب مصطفیٰ خان

اول کوشش اور بعد دعا:—

کوشش میں ہے شرط ابتدا انسان سے

پھر چاہئے مانگنی مدد یزداں سے

جب تک نہ کام دست و بازو سے لیا

پائی نہ نجات نوح نے طوفاں سے

—

دانا کا حال نادانوں میں:—

کیا فرق سماعت نہو جب کانوں میں

دانائی کی باتوں میں اور افسانوں میں

غربت میں ہے اجنبی مسافر جس طرح

دانا کا یہی حال ہے نادانوں میں

—

عفو باوجودِ قدرتِ انتقام :-

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بارخدا
مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا رہ ہے
جولے سکے اور نہ لے بدی کا بدلا

ہمت :-

تیمور نے اک مورچہ زیرِ دیوار
دیکھا کہ چرہا دانہ کو لیکر سوار
آخر سرِ بام لیکے پہنچا تو کہا
”مشکل نہیں کوئی پیشِ ہمتِ دشوار

محنت :-

محنت ہی کے پہل ہیں یہاں ہر اک دامن میں
محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں
موسیٰ کو ملی نہ قوم کی چوپانسی
جب تک نہ چرائیں بکریاں مدین میں

عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا

جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

—

علم :-

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال

غائب ہوا تر جہاں سے وہاں آیا زوال

ان پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح

جن قوموں نے تہرایا تجھے راس المال

—

عزت کس چیز میں ہے :-

دولت نے کہا، مجھ سے ہے عزت ہے جہاں

فرمایا ہنر نے، میں ہوں عزت کا نشان

عزت بولسی، غلط ہے دونوں کا بیان

میں بید ہوں حق کا جو ہے نیکی میں نہاں

—

عیش و عشرت :-

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے

ہر قہقہہ پیغامِ بکا ہوتا ہے

جس قوم کو عیش درست پاتا ہوں میں

کہتا ہوں کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے

—

صَلح کُل:—

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بید کر دیں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

— — —

غرور سب عیبوں سے بدتر ہے:—
ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور
پر عیب سے بچنے کا بہ مقدور ضرور
عیب اپنے گہٹاؤ پر خبردار رہو
گہٹنے سے کہیں انکے نہ بڑھ جائے غرور

— — —

گفتار و کردار میں اختلاف:—
جو کرتے ہیں کچھ زباں سے کہتے ہیں وہ کم
ہوتے نہیں ساتھ جمع دم اور قدم
بڑھتا گیا جس قدر کہ حسن گفتار
بس اتنے ہی گہٹتے گئے کردار میں ہم

— — —

عالم و جاہل میں کیا فرق ہے:—
ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہم سر
آتا نہیں فرق اس کے سوا ان میں نظر

رباعیاتِ حالی

توحید :-

ہند نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مہاں نے راگ گایا تیرا
دھری نے کیا دھر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بس نہ آیا تیرا

طوفاں میں ہے جب جہاز چکر کھاتا
جب قافلہ رادی میں ہے سرگرا تا
اسباب کا آسرا ہے جب اٹھ جاتا
وہاں تیرے سرا کوئی نہیں یاد آتا

نعت :-

بطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف
یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف
ارلادھی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر
آبا کو بھی ہے تیری ابرت سے شرف

جوں کوچہ مسواک اسی میں دیکھا
کوچہ ہے یہ سربستہ نہیں اسمیں راہ

شہرہ حق :-

کب جس میں ہو دنیا کی طلب بیتہ سکے
جس دل میں ہوس بھری ہو کب بیتہ سکے
تسکینِ شہرہ حق سے ہوتی ہے نصیب
اتہ جائے نظر سے خلق تب بیتہ سکے

نایاب دارئی زندگانی :-

پیری چلی گئی اور گئی جوانی اپنی
اے درد کہاں ہے زندگانی اپنی
کل اور کوئی بیان کرے گا اسکو
کہتے ہیں اب آپ ہم کہانی اپنی

دیوانہ :-

کچھ آپ ہی گراے آپ ہی کچھ چنتا ہے
کہتا ہے کچھ آپ کچھ آپ ہی سنتا ہے
اے درد ہمیشہ یہ دل دیوانہ
کیا کچھ ادھیڑتا ہے اور بنتا ہے

گذرے ہ اب اس طرح اپنی اے درد
رونا چپکے پڑے اکیلے رہنا

ظرف:—

اے درد اگرچہ مے میں ہے جوش و خروش
رہتے ہیں رلے اہل کامل خاموش
عوجوں کو شراب کی وہ پی جاتے ہیں
گرداب کے مانند جوہیں دریا نوش

ہستی:—

اے درد بہت کیا پرکھا ہم نے
دیکھا پہ عجب ہے یاں کا لیکھا ہم نے
بیدنائی نہ تھی تو دیکھتے تھے سب کچھ
جب آنکھ کھلی تو بچہ نہ دیکھا ہم نے

غم عشق:—

اے درد یہ درد جی سے کھوتا معلوم
جوں لالہ جگر سے داغ دھونا معلوم
گلزارِ جہاں ہزار پہولے لیکن
میرے دل کا شگفتہ ہونا معلوم

معرفت:—

کی بہت طریقِ زہد میں عمر تباہ
اب کی بجائے دل کو معرفت سے آگاہ

حرص رہا:۔

پیدا کرے ہر چند تقدس بندا
مشکل ہے کہ ہر حرص سے دل برکندہ
جنت میں بھی آکل و شرب سے کب ہے نجات
دورخ کا بہشت میں بھی ہوگا دھندا

عشرت دنیا:۔

ہم نے بھی کبھو جام و سبو دیکھا تھا
جو کچھ کہ نہیں ہے رؤ بر دیکھا تھا
ان باتوں کو جو غور کرئیے اے درد
کچھ خواب سا تھا وہ کبھو دیکھا تھا

غفلت:۔

موند آنکھ سدا کب تیئن دن تالیئے گا
غفلت کے تیئن بغل میں یوں پالیئے گا
اے درد مراقبہ تو کرتے ہو رے
تک اپنے گریبان میں بھی سردائیئے گا

اپنا اپنا:۔

کس کا کون کیا کس سے کہنا
اپنا اپنا ہر ایک کا ہے لہنا

راصائیں کا ایک سین

کیا جانے کس خیال میں گم تھے وہ بیگناہ

نورِ نظر پہ دیدہ حسرت سے کسی نگاہ

جنش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ

لی گوشہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ

چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا

ہر موڑے تنِ زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا

افسانہ شدائدِ رنج و محن کھلا

اک دفترِ مظالمِ چرخِ کھن کھلا

وا تھا دھانِ زخم کہ بابِ سخن کھلا

دردِ دلِ غریب جو حرفِ بیاں ہوا

مخونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

سنکر زباں سے ماں کی یہ فریادِ دردِ خیز

اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ نیز

عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز

لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کسی گریز

سوچا یہی کہ جان سے بیکس گذرنہ جائے

ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

سب سو رہے اپنے اس خاک میں نہاں ہیں

توڑے ہوئے کھنڈر ہیں یا انکی ہڈیاں ہیں

برسوں سے سو رہا ہے برہم سماں ہمارا

دنیا سے مت رہا ہے نام و نشان ہمارا

کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا

اک لاشِ بے کفن ہے ہندوستان ہمارا

اس کے بھرے خزانے برباد ہو رہے ہیں

ذلت نصیب وارثِ غفلت میں سو رہے ہیں

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحرِ وطن کا

آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا

• ہے رشکِ مہرِ ذرہ اس منزلِ کہن کا

ٹلتا ہے برگِ گل سے کا نٹا بھی اس چمن کا

گرد و غبارِ یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو

مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

قوم کا غم مول لیکر دل کا یہ عالم ہوا
یاد بھی آتی نہیں اپنی پریشانی مجھے
ذره ذره ہے مرے کشمیر کا مہمبان نواز
راہ میں پتھر کے ٹکروں نے دیا پانی مجھے

خاکِ ہند

وے خاکِ ہند تیری عظمت عیس کیا گماں ہے
دریا ئے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جہیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے
اللہ ری زیب و زینت کیا ارجِ عروشاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمتِ خورشیدِ پُرضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹیِ ہمالیہ کی
گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو
سرمہ نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

جو ظہورِ عالمِ ذات ہے ' یہ فقط ہجومِ صفات ہے
 ہے جہاں کا اور وجود کیا جو طلسمِ رہم و گماں نہیں
 یہ حیاتِ عالمِ خراب ہے نہ عذاب ہے نہ ثواب ہے
 رہی کفر و دین میں خراب ہے جسے علمِ رازِ جہاں نہیں
 نہ وہ خم میں بادہ کا جوش ہے نہ وہ حسنِ جلوہ فروش ہے
 نہ کسی کو رات کا ہوش ہے وہ سحر کو شب کا سماں نہیں
 یہ زمیں پہ جنکا تھا دبدبہ کہ بلند عرش پہ نام تھا
 انہیں یوں فلک نے مٹا دیا کہ مزار تک کا نشان نہیں

کچھ اور ہے وہ شاعرِ معجزیاں نہیں
 جس کے سخن سے رنگِ طبیعت عیاں نہیں
 اظہارِ دردِ غیر سے کرتے ہیں بوالہوس
 ہم کو دماغِ نالہ و آہ و فغاں نہیں
 کیا دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی
 واللہ وہ زمین نہیں آسماں نہیں

دل کئے تسخیر بخشا فیضِ روحانی مجھے
 حُبِ قومی ہو گیا نقشِ سلیمانی مجھے
 جانچتا ہوں وسعتِ دل حملہٴ غم کے لیئے
 امتحان ہے رنج و حرماں کسی فرادانی مجھے

جس طرح خم سے کسی جام کا تَکِرا نکلے
 یونہی گردوں سے مہِ نور کا نمایاں ہونا
 سر میں سودا نہ رہا پاؤں میں بیری نہ رہی
 میری تقدیر میں تھا بے سر و ساماں ہونا
 صفحہ دھریہ مہرِیدِ قدرت سمجھو
 پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا
 ہو بیاضِ سحرِ نور پہ دل کیا مائل
 یاد ہے دفترِ انجم کا پریشاں ہونا
 کل بھی وہ کل جو ہے فردائے قیامت زاہد
 اور پھر اس کے لئے آج پریشاں ہونا
 پاؤں زنجیر کے مشتاق ہیں اے جوشِ جنوں
 ہے مگر شرطِ ترا سلسلہ جنباں ہونا
 گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک
 ہے اسے طُورہ دستارِ غریباں ہونا
 ہے مرا ضبطِ جنوں جوشِ جنوں سے بڑھ کر
 ننگ ہے میرے لئے چاکِ گریباں ہونا

—

صری بیخودی ہے وہ بیخودی کہ خودی کا وہم و گماں نہیں
 یہ سرورِ ساغرِ مدے نہیں ' یہ خمارِ خوابِ گراں نہیں

یہذت برج نرائن چکبست

غزلیات :—

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا

اجل کیا ہے خمار بادہ ہستی اتر جانا

مقام کوچ کیا ہے منزل مقصود تک پہولے

قیامت تھا سرائے دھرمیں دردن تھر جانا

بہت سودا رہا واعظ تجھے نازِ جہنم کا

مزا سوزِ محبت کا بھی کچھ اے بے خبر جانا

مصیبت میں بشر کے جوہر مردانہ کھلتے ہیں

مبارک بزدلوں کو گردشِ قسمت سے تر جانا

سدھاری منزلِ ہستی سے کس بے اعتنائی سے

تنِ خاکسی کو شاید روح نے گردِ سفر جانا

— — —

دردِ دل پاسِ وفا جذبۂ ایمان ہونا

آدمیت ہے یہی اور یہی انسان ہونا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب

موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

ہم کو منظور ہے اے دیدہ وحدت آگیں

ایک غنچہ میں تماشائے گلستان ہونا

افسوس ہے کہ آپ ہیں دنیا سے بے خبر
 کیا جائے جو رنگ ہے شام و پگاہ کا
 یورپ کا پیش آئے اگر آپ کو سفر
 گذرے نظر سے حال رعایا و شاہ کا
 وہ آب و تاب و شوکت ایوانِ خسروی
 وہ محکموں کی شان وہ جلوہ سپاہ کا
 آئے نظر علوم جدیدہ کی روشنی
 جس سے خجل ہو نور رخِ مہر و ماہ کا
 عورت کسی امیر کے گھر میں ہو آپ کی
 کمرن مسوں سے ذکر ہو الفت کسی چاہ کا
 بوخیز دلفریب گل اندام ناز نہیں
 عارض پہ جنکے بار ہو دامن نگاہ کا
 رکیڑے اگر تو ہنس کے کہے اک بُتِ حسین
 دل مولوی یہ بات نہیں ہے گناہ کا
 اسوقت قبلہ جھک کے کروں آپ کو سلام
 پھر نام بھی حضور جو لیس خاتقاہ کا
 ممبر پہ یوں تو بیٹھ کے گوشے میں اے جناب
 سب جانتے ہیں وعظ ثواب و گناہ کا

کچھ جوڑ تو ان میں کے ہوئے بال میں رقصاں
باقی جوڑتے گھر ان کا تھا افلاس کا مارا
بہرا رہ نیاکمپ میں یہ بندگیٹس آیا
بی بی نہ رہیں جب تو میاں پن بھی سدھارا
دونوں جو کبھی ملتے ہیں گاتے ہیں یہ مصرعہ
آغاز سے بدتر ہے سرانجام ہمارا

دنیا کی کشش :-

مید سے آج حضرت واعظ نے یہ کہا
چرچا ہے جا بجا نرے حالِ نساہ کا
سمجھا ہے تو نے نیچر و تدبیر کو خدا
دل میں ذرا اثر نہ رہا لالہ کا
ہے تجھ سے ترک صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج
کچھ درنہیں جناب رسالت پناہ کا
شیطان نے دکھا کے جمالِ عرسِ دھر
بندہ بنادیا ہے تجھے حبِ رجاہ کا
اس نے دیا جواب کہ مذہب ہو یا رواج
راحت میں جو مغل ہو رہ کا نٹا ہے راہ کا

درِ نظارہ مقفل رہے کب تک ہم یسر
کیوں نہ غنچہ-روں کے لئے بادِ صبا کی ہو کلید

مشرق و مغرب :-

عاشقی انکی نہیں ہے عقل سے بالکل جدا
اہل دل وہ بھی ہیں لیکن دل بدن کے ساتھ ہے
وہ نہیں ہیں میرے چاکِ جب و داماں میں شریک
ہے جنوں ان کو بھی لیکن پیرہن کے ساتھ ہے
آہوئے رعنائی دشت ہوئے وہ قائل نہیں
آنکھ انکی آہوئے دشتِ ختن کے ساتھ ہے
محبہ کو الجھا نے کو کافی ہوگئی سنبل کی شان
جوشِ سردا اُن کا زلفِ پرشکن کے ساتھ ہے
یہ نہیں تو کچھ نہیں باتیں ہی باتیں ہیں فقط
ہر زباں اپنے جدا طرزِ سخن کے ساتھ ہے

موجودہ تعلیم :-

اک پیر نے تہذیب سے لڑے کو ابھارا
اک پیر نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا
پتلیوں میں وہ تن گیا یہ سائے میں پھیلی
پاجامہ غرض یہ ہے کہ دونوں نے آتارا

غفلت کا نشہ :—

پیر مغان سے رات کیا میں نے یہ گلا
مغمرم ہوں یہاں بھی مزا کچھ نہیں ملا
اس نے یہ مسکرا کے کہا از رہ ممزاج
جینے کی کس نے تم کو بڑھا پے میں دی صلاح
میں نے کہا کہ بعض نور سالہ پیر مرد
ابتک ازارہ ہیں درِ میکدہ کی گرد
کہنے لگا کہ اُن پہ عبث ہے تیری نظر
غفلت کا ہے وہ نشہ جوانی سے تیز تر

تم نے شہسوار کو پتلون سے بدلا اے شیخ
پھر مرے واسطے معمر رہے کیوں جبل و رید
خود تو گتِ پت کے لئے جان دے دیتے ہو
ہم سے کہتے ہو کہ پڑھ بیٹے کے قرآن مجید
لال جب خود ہی کنیری کا ہوا ہے بندہ
تو یہ مینار ہے کیوں گوشہٴ عزلت میں شہید
دولہا بھائی کی ہے یہ رائے نہایت عمدہ
ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید

خوش قسمتی کی اس کو نشانی سمجھتے ہیں
 کہتے ہیں یہ خدا کے کرم کا ظہور ہے
 البتہ شرط یہ ہے کہ بتیا ہے ہونہار
 مائیل ہے نیکیوں پہ برائی سے دور ہے
 سفا ہے دل لگائے بزرگوں کی پند کو
 وقتِ کلام لب پہ جناب و حضور ہے
 برتاؤ اس کا صدق و محبت سے ہے بہرا
 اسمیں نہ ہے فریب نہ کچھ مکر و زور ہے
 افکارِ والدین میں ہے دل سے وہ شریک
 ہمدرد ہے معین ہے اہلِ شعور ہے
 راضی ہے اس پہ باپ کی جو کچھ ہو مصلحت
 صابر ہے باادب ہے عقیل و غیور ہے
 رکھتا ہے خاندان کی عزت کا وہ خیال
 نیکوں کا دوست صحبتِ بد سے نفور ہے
 کسبِ کمال کی ہے شب و روز اسکر دمن
 علم و ہنر کے شوق کا دل میں دفور ہے
 لیکن جوان صفات کا مطلق نہیں پتا
 ازر پہر بھی ہے خوشی تو خوشی کا قصور ہے

پردہ :-

بٹھائی جائیں گی پردے میں بیبیاں کب تک
 بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک
 حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی
 تو کام دیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک
 میاں سے بی بی ہیں پردا ہے انکو فرض مگر
 میاں کا علم ہی اُٹھا تو پھر میاں کب تک
 طبیعتوں کا نمو ہے ہوائے مغرب میں
 یہ غیرتیں یہ حرارت یہ گرمیاں کب تک
 عوام باندھ لیں دڑھ کو تھرد و انٹر میں
 سکند و فرست کی ہوں بند کھڑکیاں کب تک
 جو منہ دکھائی کی رسموں پہ ہے مُصرا بلیس
 چھپیں گی حضرت حوا کی بیٹیاں کب تک
 جناب حضرت اکبر ہیں حامی پردہ
 مگر وہ کب تک اور انکی رباعیاں کب تک

نصیحت اخلاقی :-

بیٹے کو لوگ کہتے ہیں آنکھوں کا نور ہے
 ہے زندگی کا لطف تو دل کا سرور ہے

محنت سے گریز:—

کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے
 کہ بیٹا تو اگر کرے ایم - اے - پاس
 تو فوراً بیاہ دوں لیلے کو تبتہ سے
 بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
 کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی
 کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
 کجا یہ فطرتی جوش طبیعت
 کجا تھونسی ہوئی چیزوں کا احساس
 بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے
 ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
 یہ اچھی قدردانی آپ نے کی
 مجمع سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس
 دل اپنا خوں کرنے کو ہوں موجود
 نہیں منظور مغز سر کا آماس
 یہی تھری جوشِ رطلِ لیلے
 تو استعفا مرا باحسرت ریاس

لیکن جو یہ تعمیم ہے حضرت کے سخن میں
 اس کو تو نہ تسلیم کرے گا یہ گنہ گار
 ہر مذہب و ملت میں ہیں اچھے بھی برے بھی
 وہ کونسا فرقہ ہے کہ سب جسمیں ہوں ابرار
 ملبوس و مکان کا جو کیا آپ نے مذکور
 اسکے بھی بجا ہونے کا مجھ کو نہیں اقرار
 باطن سے ہے اخلاق حمیدہ کا تعلق
 فطرت میں جو ہے نیک وہ بد ہوگا نہ زہار
 ارضاعِ زمانہ تو بدلتے ہی رہیں گے
 رکتی نظر آتی نہیں دنیا کی یہ رفتار
 ہے جسکو ضرورت وہ ضرورت سے ہے مجبور
 ہے شوق جسے کیوں نہ کیا جائے وہ مختار
 مقصود جو اصلی ہے وہ ہے دل کی درستی
 یا ہیت و ارکوت ہو یا جبہ و دستار
 شبہ مرے اس قول کی صحت میں اگر ہو
 سن لیجئیے سعدی کا یہ ارشاد گہر بار
 حاجت بہ کلاہ برکی داشتنت نیست
 درویش صفت باش و کلاہ تتری دار

انگریزی لباس

انگلش درس انور کا جوکل بزم میں دیکھا

اکبر نے کہا یہ تو خرابی کے ہیں آثار

معنی میں بھی ہو جائیگا آخر کو تغیر

تبدیلی صورت کے رہے گریہی اطوار

خالق کی عبادت سے حجاب آنے لگیگا

شرماؤ گے کرتے ہوئے اسلام کا اظہار

بیگانہ رشی ہوگی عزیزانِ وطن سے

بنگلے میں نہاں ہو گئے کہیں چہرے کے گہر بار

فاتح سے مسارات کی اُتھیں گی امدگیں

وہ زیست جو آسان تھی ہو جائیگی دشوار

آپس میں بھی تم لوگ موافق نہ رہو گے

ایک ایک کو دیکھیگا بہ اکراہ و بہ انکار

آخر کو رہو گے نہ ادھر کے نہ اُدھر کے

انگریز بھی کہنچتے رہیں گے قوم بھی بیدار

انور نے کہا صَلِّ عَلیٰ راہ بہت خوب

شک اسمیں نہیں مدح کے قابل ہے یہ گفتار

کون کہتا ہے کہ انگلش کا نہر دل سے مطیع

کون کہتا ہے نہ کرا لفتِ ولسن پیدا

کون کہتا ہے تکلف سے نکر زیست بسر

کون کہتا ہے نہ کر وضع میں جو بن پیدا

کون کہتا ہے کہ تو علم نہ پڑھ عقل نہ سیکھ

کون کہتا ہے نہ کر حسرتِ لندن پیدا

بس یہ کہتا ہوں کہ ملت کے معانی کو نہ بھول

راہ قومی کا تو خود ہی نہ ہو رہزن پیدا

مذہبی شاخ فقط ہے تری قومی ہستی

یہ جو توڑتی تو نہیں کوئی نشیمن پیدا

کچھ گہرند انہیں نیشن کہ بنا لیس لڑے

فطرتی طور پر خود ہوتی ہے نیشن پیدا

سلف رسپکت کا پھر یاد رہیگا نہ سبق

پھر نہیں ہونے کی یہ بحثِ تور من پیدا

بزم تہذیب سے ہو جائیڈگے قطعاً خارج

حس ہی باقی نہ رہیگا کہ ہوشیون پیدا

ادھرید ضد ہے کہ لمنید بھی چھو نہیں سکتے

ادھریہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مٹے لا

غرض درگوندہ عذاب است جان مجنوں را

بلائے صحبتِ لیلے و فرقتِ لیلے

قومیت

پیر و مرشد نے کیا قوم میں بچپن پیدا

وہ یہ سمجھے تھے کہ ہرجائیگا جوبن پیدا

وہ تو پیدا نہ ہوا ہاتھ سے لڑکوں کے مگر

ہو چلے دیں کی دیوار میں روزن پیدا

آج ہوتا نہیں اسکا ضرر انکو محسوس

ہو رہے ہیں ابھی کچھ لالہ و سوسن پیدا

بالیقہیں آئیگا اس باغ پہ ایسا اک وقت

کر چلیں گی روشیں نشتر و سوزن پیدا

باپ کے خون سے ہوگی جو حمیت زائل

ہونگے اطفال بھی بے غیرت و کودن پیدا

ظلمتِ جہل سے گھر جائنگے دل کے اطراف

سینوں میں ہونہ سکیں گے دل روشن پیدا

شب غم میں تیرہ دنیا نہ مری نظر میں ہوتی
 نہ زمانہ بھر کے جھگڑے نہ بکھیرے ہوتے دیں کے
 مجھے تجھ سے کام ہوتا تجھے مجھ سے کام ہوتا
 نہ چمن میں گل کا شیدا نہ میں عندلیب ہوتا
 نہ فلک سے برق گرتی مری شاخِ آشیاں پر
 ترا داغِ سوزِ الفت جو مجھے نصیب ہوتا
 میں شرار بنکے اُڑتا شبِ غم میں آسماں پر
 نہ ہلالِ عید ہوتا، نہ مہِ صیام ہوتا

قطعات و مثنویات

اکبر الہ آبادی
 وضع قدیم و جدید
 قدیم وضع پر قائم رہوں اگر اکبر
 تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلہ
 جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں
 خود اپنی قوم مچاتی ہے شور و زاریلا
 جو اعتدال کی کھٹے تورہ ادھر نہ ادھر
 زیادہ حد سے دئے سب نے پاؤں ہیں پھیلا

شبِ نیم کی ننھی ننھی بوندیں ٹپک رہی ہوں

سبزے پہ موتیوں کا پانی چھڑک رہی ہوں

مصررف آہ ہم تم گلگشتِ باغ میں ہوں

دامن میں پھول چنتے کنج فراغ میں ہوں

سودائے عشق

مٹے سوزِ عاشقی کا جو نصیب جام ہوتا

میں سحر کو بھی نہ بجھتا رہ چراغِ شام ہوتا

وہ جگر کا داغ نبتا دم حشر بھی نہ مٹتا

دل رجاں کو پھونک دیتا رہ تپِ درام ہوتا

نہ میں بجھنے والا شعلہ نہ شرارِ خام ہوتا

شبِ غم میں بنکے ٹپکوں کسی چشم تر سے آنسو

میں بنوں سحر کا تارا نہیں مجھکو یہ گوارا

شبِ تار میں چمکتا نہ ہوا پہ بن کے جگنو

جو فروغِ عشق دیتا مجھے چرخِ فتنہ آرا

میں جگر پہ داغ کھا کھا کے مہِ تمام ہوتا

نہ کسی کی نوکِ مثر گاں کی خلش جگر میں ہوتی

نہ کمنہ شوقِ حلقے کسی زلفِ عنبریں کے

اک تنگ و تار حجرے میں آہ اب مکیں ہوں

فریادِ آتشیں ہوں دردِ دلِ حزیں ہوں

پتلا ہوں آہ اب میں سوزِ غمِ نہاں کا

رگِ زگ میں مشتعل ہے شعلہ مری فغاں کا

جمنا کی آف رہ موجوں کا دلفریب منظر

جھونکے ہوا کے بہینے بہینے رہ روحِ پرور

رہ چاندنی کا آنچل پھیلا ہوا زمیں پر

فواروں کا اچھلنا پھولوں کی نکھتِ تر

اک چاند کا نکھرنا اک چاند کا سنورنا

ہنس کر شہید مجھ کو تیغِ ادا سے کرنا

مرجھا رہے جویہ گل تیرے مزار پر ہیں

سوزِ دروں کا مرہم جاںِ دلِ رجگر ہیں

ہو ان میں ہے وفا کی یہ میرے چارہ گر ہیں

راجِ مشامِ جاں ہیں دامنِ کشِ نظر ہیں

یہ ان گلوں کی نازک نازک جو پتھریاں ہیں

مہدی بھری یہ تیری گویا ہتھیلیاں ہیں

اشجارِ جھومتے ہوں شاخیں لچک رہی ہوں

خوشبو ہو بہینی بہینی کلیاں مہک رہی ہوں

کہاں لائی آرا کر آہ تو باد خزاں مچھو

کہیں خار مغیلاں تے کہیں غول بیاباں تھا

بہار عالم نیرنگ تھی ہر پنکھڑی میری

نہ تھا معلوم رنگ انقلاب دھڑ پنہاں تھا

حقیقت کھل گئی دور خزاں آیا جو گلشن میں

نہ تھا غازہ رخ گلرنگ پر خون شہیداں تھا

تعبیر زاتھا منظر آہ اک اک باغ ہستی کا

وجود عالم امکان مگر خواب پریشان تھا

حسرت دیدار

وہ شان کج کلاہی، وہ فخر تاجداری

وہ طرہ زرافشاں وہ تاج شہریاری

ممتاز! آف وہ تیری دیرینہ غمگساری

وہ تیری جاں نوازی وہ میری جاں نثاری

قصہ کہا نیاں ہیں باتیں وہ اب کہاں ہیں

اے حسن و عشق تیری گہائیں وہ اب کہاں ہیں

بے نام و بے نشان ہوں بے تاج و بے نگین ہوں

پامال ہو چکا جو وہ نقشِ دل نشیں ہوں

ناز ہے صحرا کو تیری سرخی رفتار پر
دورتا ہے خون کا قطرہ سبزہ کہسار پر

”گل خزاں دیدہ“

خوشا رہ دن کہ میں آرائشِ صحنِ گستاں تھا
خوشا رہ دن کہ میرے فرق پر تاجِ زرافشاں تھا
صبا گہوارہ جنباں قصہ گو بانگِ عنادل تھی
مرا چھوٹا سا بسترِ خوابِ آرائش کا ساماں تھا
فضائے لالہ و ریحان و گل پریوں کی محفل تھی
نسیم صبح کا جھونکا جوتھا تختِ سلیمان تھا
ترنم ریز تھا شاخوں پہ میری طائرِ سدرہ
چمن کا میرے دستِ آموز اک مرغِ غولخواں تھا
جواب خطہ کشمیر میرا کنجِ دلکش تھا
بہارِ سبزہ گل تھی ہجومِ سرور و ریحان تھا
ادھر سنبھل کو تھا ناز اپنے گیسوئے مسلسل پر
ادھر نہ گس کو گلشن میں غرورِ چشمِ فداں تھا
کلی دوشیزہ ناکتخدا اک اک تھی گلشن میں
شگوفہ جو چمن میں تھا عروسِ گل بداماں تھا

یا شفق کا کوئی تکرار ہے زمیں پر جلوہ گر

جام زرین میں ہے یا صہبائے احمر جلوہ گر

گل بداماں ہے شفق میں شعلہ و تنوبر حسن

خونِ عاشق باز میں پر ہے گریباں گیر حسن

یا عقیقِ سرخ کی جھوٹی سی ہے تعمیر حسن

نقشِ نیرنگ فسوں ہے یا کوئی تصویر حسن

جلوہ گل ہے فضائے رادیٰ پر خار میں

سرخِ تکرار ہے قبائے سبزہ کہسار میں

جلوہ گل سے ہے رنگیں روئے زیبائے بہار

نازنین ہے یا کوئی محو تماشاۓ بہار

یا مئے گلرنگ سے گلگون ہے میدانِ بہار

یا ہے آغشتہ بخوں داغِ سویدائے بہار

سبزہ کہسار نے یا لعل ہے اگلا کوئی

چن رہی ہے پھول یا درشیزہ رعنا کوئی

رادیٰ پر خار میں اک مجمر سوزاں ہے تو

دامنِ کہسار میں اک شعلہ عریاں ہے تو

گشت زارِ حسن میں اک دانہ مرجاں ہے تو

یا کسی گلگون قبا کا گوشہ داماں ہے تو

رواں فزائی سحرِ حلال مومن سے
رہا نہ معجزہ باقی لبِ بتاں کے لیئے

اگر غفلت سے باز آیا جفا کسی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی
کیا جب التفات اس نے ذرا سا
پڑی ہم کو حصولِ مدعا کی
مجھے اے دل تری جلدی نے مارا
نہیں تقصیر اُس دیر آشنا کی
جفا سے تھک گئے تو بھی نہ پوچھا
کہ تو نے کس توقع پر وفا کی
کہا اس بُت سے مرتا ہوں تو مومن
کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

سرورِ جہاں آبادی ”بیربھوٹی“

ہے عجب اندازِ تیرے حسن بے انداز کا
سرخِ دورا ہے کسی چشمِ فسوں پر داز کا
قطرہ مضطر ہے خونِ کشتگانِ ناز کا
قلبِ خون گشتہ ہے مڑگاں پر کسی جانباز کا

گر آرزوئے وصل نے بیمار کیا تو
 پرہیز کرینگے پہ مدارا نہ کرینگے
 رکھ لیونگے پتھر مگر ان سنگدلوں کو
 چھاتی سے لگانے کی تمنا نہ کرینگے
 جوں قبلہ نما گرچہ ترپتے ہی کئی عمر
 پر منہ سوئے دیر صنم آرا نہ کرینگے
 لیکن جو بتوں نے ہی بھلا آپ سے کی بات
 پھر آپ ہی فرمائیں کہ کیا کیا نہ کرینگے

دعا بلا تھی شبِ غم سکون جاں کے لیئے
 سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لیئے
 سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں
 کہ سخت چاہیئے دل اپنے رازداں کے لیئے
 ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا
 و گرنہ خراب کہاں چشم پاسیاں کیلئے
 مزایہ شکوہ میں آیا کہ بیمزہ ہوئے وہ
 میں تلخکام رہا لذتِ زباں کے لیئے
 کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ دامِ قفس
 ہے بیم برق بلا روز آسیاں کے لیئے

مَنْتِ حضرتِ عیسیٰ نہ آتھائینگے کہ کبھی
 زندگی کیلئے شرمندہ احسان ہونگے
 چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشین
 ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہونگے
 عمر ساری تو کتنی عشق بتاں میں مومن
 آخری رقت میں کیا خاک مسلمان ہونگے

ہے دلمیں غبار اُس کے گہرا پنا نہ کرینگے
 ہم خاک میں ملنے کی تمنا نہ کرینگے
 کیونکر نہ کہیں مَنْتِ اعدا نہ کرینگے
 کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کرینگے
 توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کرینگے
 رہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کرینگے
 ہنس ہنس کے رہ مجھ سے ہی مرے قتل کی باتیں
 اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا نہ کرینگے
 بیمارِ اجل چارہ کو گر حضرتِ عیسیٰ
 اچھا بھی کرینگے تو کچھ اچھا نہ کرینگے
 تہری ہے کہ تھرائینگے زنجیر سے دل کو
 پر برہمئی زلف کا سودا نہ کرینگے

ذکرِ اشک غیر میں رنگینیاں

بوئے خون آئی تری گفتار سے

عشق میں ناصح بھی ہے کیا مدعی

جرم ثابت ہو گیا انکار سے

گردِ عا کرتا ہوں مومن وصل کی

ہاتھ باندھے رہ بُت زنا سے

فارک اندازِ جدھر دیدہ جاناں ہونگے

نیم بسمل کٹی ہونگے کٹی بے جاں ہونگے

قابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں

ارز بن جائینگے تصویر جو حیراں ہونگے

تو کہاں جائیگی کچھ اپنا تھکانہ کر لے

ہم توکل خوابِ عدم میں شبِ ہجران ہونگے

ناصر کا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم

لاکھ نادان ہوئے کیا تجھ سے بھی نادان ہونگے

کر کے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں

گر وہ ہونگے بھی تو بے وقت پشیمان ہونگے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس

ایک رہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہونگے

آنکھوں سے حیا تپکے ہے انداز تو دیکھو
 ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو
 اُس بت کیلئے میں ہوس حور سے گذرا
 اس عشق خوش انجام کا آغاز تو دیکھو
 چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرت ناصح
 طرز نگہ چشمِ فسونساز تو دیکھو
 مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اُٹھ رہے
 بد نامیِ عشاق کا اعزاز تو دیکھو
 محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے
 منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو
 اُس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دھپک
 شعلہ سا چمک جائے ہے آراز تو دیکھو
 جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے
 جورِ اجل تفرقہ پرداز تو دیکھو

قتل ہو کر ہم بچے آزار سے
 عمر کے دن کٹ گئے تلوار سے
 گر نہ کھیلیں جان پر جی ہار دیں
 عشق بازی سیکھئے اغیار سے

کیا دل کر لے گیا کوئی بیگانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم
لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
چین جلیں کو دیکھ کے دل بستہ تر ہوا
کیسی کشودکار کشاد نقاب میں
رہتے ہیں جمع کوچہ جاناں میں خاص و عام
آباد ایک گھر ہے جہاں خراب میں
ناصر ہے عیب جوئے دل آزار اسقدر
گویا ثواب ہے سخن ناصواب میں
کیا جاوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں
بے بادہ مست ہوں میں شبِ مہتاب میں
ہے منتوں کا وقت شکایت رہی رہی
آئے تو ہیں منانے کو رہ پر عتاب میں
پیہم سجود پائے صنم پر دم و داع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب

غیر اور تم بھلے بھلا صاحب

کیوں لگے دینے خطِ آزادی

کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب

دمِ آخر بھی تم نہیں آئے

بندگی اب کے میں چلا صاحب

ستم آزار ظلم رجور و جفا

جو کیا سو بھلا کیا صاحب

نامِ عشقِ بقاں نہ لو مومن

کیجئے بس خدا خدا صاحب

تہانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم

پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا

لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

بے روئے مثلِ ابر نہ نکلا غبارِ دل

کہتے تھے ان کو برقِ تبسمِ ہنسی سے ہم

منہ دیکھنے سے پہلے بھی کس دن رہ صاف تھے

بے وجہ کیوں غبار رکھیں اُرسی سے ہم

بوسہ صنم کی آنکھ کا لیتے ہی جان دی

مومن کو یاد کیا حجر الاسود آگیا

اثر اسکو ذرا نہیں ہوتا

رنجِ راحت فزا نہیں ہوتا

بی وفا کہنے کی شکایت ہے

تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا

ذکر اغیار سے ہوا معلوم

حرفِ ناصح برا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہوئے

ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

اُس نے کیا جانے کیا کیا لیکر

دل کسی کام کا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرض مضطرب مومن

صنم آخر خدا نہیں ہوتا

تم بھی رہنے لگے خفا صاحب

کہیں سایہ مرا پڑا صاحب

دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب
 تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا
 کشتہ ہوں اُسکی چشم فسونگر کا اے مسیح
 کرنا سمجھ کے دعوے اعجاز دیکھنا
 ترک صنم بھی کم نہیں سوز جہیم سے
 مومن غم مآل کا آغاز دیکھنا

— — —
 اُس وسعت کلام سے جی تنگ آگیا
 ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا گیا
 صد سے رہ پھر رقیب کے گھر میں چلا گیا
 اے رشک میری جان گئی تیرا کیا گیا
 کچھ آنکھ بند ہوتے ہی آنکھیں سی کھل گئیں
 جی اک بلائے جان تھا اچھا ہوا گیا
 آنکھیں جو دھونڈتی تھیں نگہ ہائے التفات
 گم ہونا دل کا رہ مری نظروں سے پا گیا
 اے جذب دل نہ تھم کہ نہ ٹہرا رہ شعلہ رو
 آیا تو گرم گرم رلیکن چلا گیا
 مچھ خانماں خراب کا لکھا کہ جان کر
 رہ نامہ غیر کا مری گھر میں گرا گیا

ہوئی بلبل ثناخوانِ دہانِ تنگ کس گل کی

کہ فروردی میں غنچہ کا منہ اتنا سا نکل آیا

بہت نازاں تھے تو اے قیس پر وحشت دکھاؤنگا

کتابوں میں کبھو قصہ جو مومن کا نکل آیا

مجھ کو تیرے عتاب نے مارا

یہاں میرے اضطراب نے مارا

لے کے دل بھی کبھی نہیں جاتی

زلف کے پیچ و تاب نے مارا

خون کیونکر مرا کھلے کہ مجھے

اک سراپا حجاب نے مارا

جہہ سائسی کا بھی نہیں مقدور

اُن کی عالی جناب نے مارا

مومن از بس ہیں بے شمار گناہ

غم روزِ حساب نے مارا

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا

میری طرف بھی غمزہ غماز دیکھنا

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں

اے ہم نفس نزاکتِ آراز دیکھنا



امیدِ وعدہ دیدارِ حشرِ پر مومن

تو بے مزہ تھا کہ حسرت کشِ بقتاں نہوا

— — —

وعدہِ وصلت سے دل ہوشاد کیا

تم سے دشمن کی مبارکباد کیا

کچھ قفس میں اذدِ نوں لگتا ہے جی

آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

جب مجھے رنجِ دل آزاری نہوا

بی وفا پھر حاصلِ یداد کیا

پاؤں تک پہنچی وہ زلفِ خمِ بغم

سرور کو اب باندھئے آزاد کیا

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس

آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

بتکدہ جنت ہے چائے بے ہراس

لب پہ مومن ہرچہ بادِ اباد کیا

— — —

یہ عذرِ امتحان جذبِ دل کیسا نکل آیا

میں الزام اُسکو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

نکل آیا اگر آنسو تو ظالم مت نکال آنکھیں

سنا معذرتِ رہے مضطر نکل آیا نکل آیا

دیدہ حیراں نے تماشا کیا

دیر تلک رہ مجھ دیکھا کیا

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے

آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا

بچہ کئی اک آہ میں شمع حیات

مجھ کو دم سرد نے تھکا کیا

زندگی ہجر بھی اک موت تھی

مرگ نے کیا کارِ مسیحا کیا

سچ ہی سہی آپکا پیمانہ والے

مرگ نے کب وعدہ فردا کیا

دشمنِ مومن ہی رہے بُتِ صدا

مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا

مرئے نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہ ہوا

بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

دیت میں روزِ جزا لے رہینگے قاتل کو

ہمارا جان کے جانے میں بھی زیاں نہ ہوا

وہ آئے بہرِ عیادت تو تھا میں شادیِ مرگ

کسی نے چارہ بیدادِ آسمان نہ ہوا



بتخانے سے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے

مومن بس اب معاف کہ یاں جی بہل گیا

— — —

اور ایسا کوئی کیا بے سرو ساماں ہوگا

کہ مجھے زہر بھی دے بجئے گا تو احسان ہوگا

آخر امید ہی سے چارہ حرماں ہوگا

مرگ کی آس پہ جینا شب ہجراں ہوگا

ایسی لذت خلشِ دل میں کہاں ہوتی ہے

رہ گیا سینہ میں اُسکا کوئی پیکان ہوگا

حیرتِ حسن نے دیوانہ کیا گراس کا

دیکھنا خانہ آئینہ بھی ریراں ہوگا

ایک ہی جلوہ مہر و میں ہوئے سو تکرے

جامۂ صبر جسے کہتے ہیں کتاں ہوگا

کیونکہ امیدِ وفا سے ہو تسلی دل کو

فکر ہے یہ کہ وہ وعدے سے پشیمان ہوگا

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ رپے میں ساری

چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

دوستی اُس صنمِ آفتِ ایماں سے کرے

مومن ایسا بھی کوئی دشمنِ ایماں ہوگا

— — —

دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ

تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے

جاتے ہو اٹے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق

اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

• ———

انتخاب از کلیات مومن

پہوڑا تھا دل نہ تھا یہ موڑے پر خلل گیا

جب تپیس سانس کی لگی دم ہی نکل گیا

کیا روؤں خیرہ چشمہ بختِ سیاہ کو

واں شغلِ سرمہ ہے ابھی یاں نیل دھل گیا

کی مجھ کو ہاتھ ملنے کی تعلیم رونہ کیوں

غیروں کو آ کے بزم میں رہ عطر مل گیا

اُس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی

کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جہل گیا

اُس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل

میں کوچہ رقیب میں بھی سرے بل گیا

الہی کان میں ہے کیا صنم نے پہونک دیا

کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اداں کیلئے

امید ہو گئی ہم سا یہ ورنہ خانہ یاس

بہشت تھا ہمیں آرامِ جاوہاں کیلئے

بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیونکر ہو

زباں نہ دل کیلئے ہے نہ دل زباں کیلئے

بنایا ذوق جو انساں کو اس نے جزرِ ضعیف

اور اس ضعیف سے کل کامِ درجہاں کیلئے

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے

اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے

پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کم ہونگے اس بساط پر ہم جیسے بد قمار

جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے

ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ

ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہو رہی ہو

دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے

اگر یہ جانتے چُن چُن کے ہم کو توڑینگے
 تو گل کبھرنہ تمنائے رنگ و بو کرتے
 سمجھیں وہاں رسن 'تار و سوزن' اے منصور
 کہ چاک پر دہ حقیقت کا ہیں رفو کرتے
 عجب نہ تھا کہ زمانے کے انقلاب سے ہم
 تیمم آب سے 'ارر خاک سے' وضو کرتے
 سراغِ عمر گزشتہ کا لیجئے گردِ ذوق
 تمام عمر گزر جائے جستجو کرتے
 ثبات کب ہے زمانہ کے غروشاًں کیلئے
 کہ ساتھ ارج کی پستی ہے آسماں کیلئے
 ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جاں کیلئے
 ستم شریک ہوا کون آسماں کیلئے
 فرورغِ عشق سے ہے روشنی جہاں کیلئے
 کہ یہ چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کیلئے
 نہ دینا ہاتھ سے تم راستی کہ عالم میں
 عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کیلئے
 دکانِ حسن میں رکھتے نہیں متاعِ وفا
 وگرنہ لیتے ہم ایک اپنے مہرباں کیلئے

رہے جو شیشہٴ ساعت وہ مَکدِ درونوں
 کبھی مل بھی گئے دِردِ دل جو کدورت والے
 حرص کے پہلاتے ہیں پاؤں بقدرِ وسعت
 تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے
 نازھے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
 اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

ہر ناز میں کرتا ستم ایجادِ غضب ہے
 سرتا بقدم وہ بتِ بیدادِ غضب ہے
 توڑا کمرِ شاخ کو کثرت نے ثمر کی
 دنیا میں گرا نباری کی اولادِ غضب ہے
 شیطان بھی اماں مانگتا ہے اُن کے عمل سے
 کیا حضرتِ آدم کی بھی اولادِ غضب ہے
 ہے سرِ توپا بند غم بے ثمری میں
 کہتے ہیں گرفتار کو آزادِ غضب ہے
 یہ خانہٴ ہستی ہے عجب خانہٴ رنگیں
 اے ذوق مگر سستی بنیادِ غضب ہے

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
 مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

الہی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے
 کہ آج کوچہ میں اُس کے شورِ بایِ ذنبِ قَتَلْتَنی ہے
 بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اُسکی فروتنی ہے
 وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اُسی کے جلوہ کی روشنی ہے
 ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اسقدر آستینِ دامن
 کہ میری تر دامنِ کے آگے عرقِ عرقِ پاکِ دامنِ ہے
 لگانہ اس بتکدہ میں تو دل یہ ہے طلسمِ شکستِ غافل
 کہ کیسا ہی کوئی خوشنما شمایل صنم ہے آخر شکستنی ہے
 نہیں ہے قانع کو خواہشِ زر وہ مفلسی میں بھی ہے تو نگر
 جہاں میں مانند کیمیا گر ہمیشہ محتاجِ دل غنی ہے
 کوئی ہے کافر کوئی مسلمان، جدا ہراک کی ہے راہِ ایمان
 جو اس کے نزدیک رہبری ہے، وہ اُس کے نزدیک رہزنی ہے
 تکلفِ منزلِ محبت نہ کر، چلا چل تو بے تکلف
 کہ جا بجا خارِ زارِ وحشت سے بچہ رہا فرشِ سرزنی ہے
 خدنگِ مڑگان سے ذوقِ اس کے دل اپنا سیدہ سیر ہے جب سے
 مثالِ آئینہ سخت جانی سے سینہ دیوار آہنی ہے

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے

ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

شہیدانِ محبتِ خوب آئینِ وفا سمجھے
 بہا خوں کوئے قاتل میں اسی کو خوں بہا سمجھے
 ستم کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے
 اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اُس بت سے خدا سمجھے
 وہ ہم سے خاکساروں کو گرا پنا خاک پا سمجھے
 ہم اپنی خاکساری اپنے حق میں کیمیا سمجھے
 نعرہ ست بھی سعادت ہو گئی سودے میں زلفوں کے
 گلیم تیرہ بختی سر پہ ہم ظلِّ ہما سمجھے
 سمجھے ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوق اسکی
 کوئی جانے ترکیا جانے کوئی سمجھے تو کہا سمجھے

سرِ بوقتِ ذبح اپنا اُسکے زیرِ پائے ہے
 یہ نصیب، اللہ اکبر لوتنے کی جائے ہے
 رخصت اے زنداں! جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے
 مژدہ خارِ دشتِ پھر تلوارِ مرا کہجلائے ہے
 بل بے استغنا کہ رہیاں آتے آتے رہ گئے
 اُف رے بیتابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے
 نزع میں بھی ذوق کو تیرا ہی بس ہے انتظار
 جانبِ در دیکھ لے ہے جبکہ ہوش آجائے ہے

اس پہ مرتے ہیں کہ کیوں غیر کو تو نے مارا
 وہ نصیب اُسکو ہوئی، تھی جو تمنا ہم کو
 اک حلاوت ہے عداوت میں بھی اُس ظالم کے
 کہہ دیا زہر بھی گرا اُس نے تو میتھا ہم کو
 وہ لکھا آخر نہ کہ پہرے کی طرح پہرت بہے
 ہم بھرے بیتھے تھے کیوں آپ نے چھیرا ہم کو
 کشتہ ہی ہوتا ہے اکسیر کہ مثلِ سیماب
 کچھ کُشدہ سے نہیں خون کا دعویٰ ہم کو

— — —

بجا کہے جسے عالم اُسے بجا سمجھو
 زبانِ خلق کو نقارۂ خداسمجھو
 عزیزو اس کو نہ گہریال کی صدا سمجھو
 یہ عمرِ رفتہ کی اپنی صدائے پا سمجھو
 پرے کتاب کے قصوں میں کیا، کرودل صاب
 صفا ہو دل تو بہ از روضۃ الصفا سمجھو
 د عافیں دیتے ہیں ہم دل سے تیغِ قاتل کو
 لبِ جراحتِ دل کو لبِ دعا سمجھو

— — —

قرے کوچہ کو وہ بیما رنم دارالشفاسمجھو
 اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی درا سمجھو

سرہم نے جب سے پائے صنم پرھے رکھد یا
درفوں جہاں سے دستِ تمنا اُٹھا لیا

وہ دیکھیں بزم سے پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں
معیت آج ترے ہم اُٹر کو دیکھتے ہیں
ہے اُنکی چشم کی گردش پہ گردشِ عالم
جدھر ہو اُنکی نظر سب اُدھر کو دیکھتے ہیں
خدا کا بندہ ہر زاہد خدا کو دیکھ ذرا
کہ زر کے بندے زمانہ میں زر کو دیکھتے ہیں
جہاں کے آئینہ سے دل کا آئینہ ہے جدا
اس آئینہ میں ہم آئینہ گر کو دیکھتے ہیں
عیارِ نقدِ محبت کا دیکھ سختی پر
لگا کے ذوق کسوٹی پہ زر کو دیکھتے ہیں

دانہ خرمن ہے ہمیں - قطرہ ہے دریا ہم کو
اُٹے ہے جزمیں نظر کل کا تماشا ہم کو
اپنا ہے کعبۂ مقصود فقط گروہرِ دل
طوف گردابِ صفت چاہئے اپنا ہم کو
ایک دم عمرِ طبعی ہے یہاں مثلِ حباب
فکرِ امروزہ نے ہے غم فردا ہم کو

ہمیشہ میں ہوں اسی داؤ گہات میں اے ذوق

کہہ رام ہو وہ غزالِ پلنگ خرمیرا

وہ کون ہے جو مجھ پہ تاسف نہیں کرتا

پرمیرا جگر دیکھ کہ میں اُف نہیں کرتا

قا صاف کرے دل نہ مٹے صاف سے صوفی

کچھ سوردِ صفا علمِ تصوف نہیں کرتا

دل فقر کی دولت سے مرا اتنا غنی ہے

دنیا کے زر و مال پہ میں تَف نہیں کرتا

کچھ اور گماں گذرے نہ دل میں ترے کافر

یا د اسیلڈے میں سورۂ یوسف نہیں کرتا

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر

آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

کیا کیا مزہ نہ تیرے ستم کا اُٹھالیا

ہم نے بھی لطفِ زندگی اچھا اُٹھالیا

یوں لائے راں سے ہم دل سپارہ کر کے جمع

دیکھا جہاں پڑا کوئی تیرا اُٹھالیا

جو بار آسماں وزمیں سے نہ اُٹھ سکا

تو نے غضب کیا دلِ شیدا اُٹھالیا

تیرچٹکی میں لیا اس نے پئے جان عدو
 رشک میرے دل میں کیا کیا چٹکیاں لینے لگا
 ہے جو غنچوں کا چٹکنا انگلیوں کی سی چٹک
 یہ بلا ئیں کس کی باغ اے باغباں لینے لگا
 موت اسکو یاد کرتی ہے خدا جانے کہ گور
 یوں ترا بیمار غم جو ہچکیاں لینے لگا
 رات کراے ذوق اس کے نوک مڑگاں کا خیال
 تن پہ ہر مروتے مروتے کارسناں لینے لگا

کہے ہے خنجر قاتل سے یہ گلو میرا
 کمی جو مجھ سے کرے تو پئے لہو میرا
 مجھے وہ پردہ نشیں سامنے کب آنے دے
 جو ذکر آنے نہ دے اپنے رو برو میرا
 نہ پہنچا گردن جاناں تک اور توت کے ہائے
 پترا گلے میں مروتے دست آرزو میرا
 نہیں بلا سے کوئی یار عشق میں اے دل
 کہ غمگسار ہوں میں تیرا اور تو میرا
 ہرنگ آئینہ چشم پر اب سے میرے
 گرا نہ اشک - کیا پاس آبرو میرا

ساغر مئے بھی تیرے کشتہ انداز کو یار

بوسہ لب نہیں بے چشم نمائی دیتا

منہ سے بس کرتے نہ ہر گزیہ خدا کے بندے

گرا نہیں آ کے خدا ساری خدائی دیتا

دیکھ گرد یکھنا ہے ذوق کو کہ وہ پردہ نشیں

دیدہ روزن دل سے دکھائی دیتا

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا

جو آپ ہی مر رہا ہو اُسکو گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفس آمارہ کو گر مارا

نہنگ واژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو جو خاک ہوا کسیر بن جاتا

اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے میں

اگر لا کہوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دل بد خواہ میں تھا مارنا یا چشم بد بین میں

فلک پر ذوق تیر آہ گر مارا تو کیا مارا

نیمچہ جب مول رہ بانکا جواں لینے لگا

موت کے جی میں مزے یہ نیم جاں لینے لگا

مرا گھرتی—را منزل گاہ ہوا ایسے کہاں طالع
 خدا جانے کدھر کا چاند آج اے ماہ رونکلا
 پہرا گر آسماں تو شوق میں تیرے ہے سرگرداں
 اگر خورشید نکلا تیرا گرم جستج—ونکلا
 اے عیار پایا یا رسمجے ذوق ہم جسک—و
 جسے یاں درست اپنا ہم نے جانا رہ عددونکلا

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچہ کی دیواروں کا
 کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا
 محتسب گرچہ دل آزار ہے مئے خواروں کا
 دیجے اک جام ترے یارا بھی یاروں کا
 چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عید سے
 ہوسکا جب نہ مدارا ترے بیماروں کا
 بے سیاہی نہ چلا کام قلم کا اے ذوق
 روسیہا ہی سرور سا ماں ہے سیہ کاروں کا

فالہ اس شور سے کیوں میرا دھائی دیتا
 اے فلک گرتجے اونچا نہ سنائی دیتا
 دیکھ چہوٹوں کو ہے اللہ برا ٹہی دیتا
 آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

سینہ چرخ میں ہر اختر اگر دہے تو کیا

ایک دل ہوتا مگر درد کے قابل ہوتا

ہوتی گر عقدہ کشائی نہ ید اللہ کے ہاتھ

ذوق حل کیونکہ مرا عقدہ مشکل ہوتا

جینا ہمیں اصلاً نظر اپنا نہیں آتا

گر آج بھی وہ رشک مسیحا نہیں آتا

عذ کو رتری بزم میں کسکا نہیں آتا

پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

آیا ہے دم آنکھوں میں دم حسرت دیدار

پر لب پہ کبھی حرف تمنا نہیں آتا

ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں

جو جاتا ہے یاں سے وہ دربارہ نہیں آتا

دنیا ہے وہ صیاد کہ سب دام میں اس کے

آجائے ہیں لیکن کوئی دانا نہیں آتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق و گرنہ

سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

مرے سینے سے تیرا تیر جب اے جنگجو نکلا

دھان زخم سے خوں ہو کے حرف آرزو نکلا

نظیر اسکا کہاں عالم میس اے ذوق
کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

— — —

اس تپش کا ہے مزہ دل ہی کو حاصل ہوتا
کاش میں عشق میں سرتا بقدم دل ہوتا
آسمان درد محبت کے جو قابل ہوتا
تو کسی سوختہ کا آبلہ دل ہوتا
کرتا بیمار محبت کا مسیحا جو علاج
اتنا دق ہوتا کہ جینا اسے مشکل ہوتا
گر سیہ بخت ہی ہونا تھا نصیبوں میں مرے
زلف ہوتا، ترے رخسار پہ یا تل ہوتا
آتا کیوں مصر میں کنعاں سے نکل کر یوسف
جذبہ شوق زلیخا جو نہ کامل ہوتا
موت نے گرد یا ناچار و گر نہ انسان
ہے وہ خود ہیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا
دل گرفتوں کی اگر خاک چمن میں ہوتی
تو جہاں دیکھتے ہو غنچہ وہاں دل ہوتا
آپ آئینہ ہستی میں ہے تو اپنا حریف
ورنہ یاں کون تھا جو تیرے مقابل ہوتا

آتی ہے صدائے جرس ناقہ لیلے

پر حیف کہ مجنوں کا قدم اُتے نہیں سکتا

ہر داغ معاصی مرا اُس دامن تر سے

جوں حرف سر کا غزنم اُتے نہیں سکتا

اتنا ہوں تری تیغ کا شرمندہ احساں

سر میرا ترے سر کی قسم اُتے نہیں سکتا

پردہ در کعبہ سے اُٹھانا ترھے آساں

پر پردہ رخسار صدم اُتے نہیں سکتا

دنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوق

کچھ فائدہ بے دست کرم اُتے نہیں سکتا

اے ہم نے بہت دھونڈا نہ پایا

اگر پایا تو کہ روج اپنا نہ پایا

جس انسان کو سگ دنیا نہ پایا

فرشتہ اسکا ہم پایا نہ پایا

فلک کے گنبد بے در سے ہم تو

نکل جاتے مگر رستا نہ پایا

جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا

کہیں ہم نے تجھے تنہا نہ پایا

آدمی کوئی نہیں مٹل سگ اصحاب کہف
 ہیں سگ دنیا ہزاروں بلعم با عورت
 پید-روزن نے کوہکن کا کام آخر کر دیا
 زور کا کچھ بس نہیں چلتا ہے ہرگز زور سے
 منعم موذی کے گھر کو اہل حاجت لوٹ لیں
 مانگتا ہے کب کوئی جا کر غسل زنبور سے
 بانٹ لے کوئی کسی کا درد یہ ممکن نہیں
 بارِ غم دنیا میں اُٹھواتے نہیں مزدور سے
 دیکھنا اے اہل عبرت انتقام آسماں
 بنتے ہیں جام گدا خاک سرفغفور سے
 جو نظر آیا حرم میں دیر میں دیکھا رہی
 ناسخ اپنی آنکھیں روشن ہیں خدا کے نور سے

انتخاب از دیوان ذوق

لکھتیے اسے خط میں کہ ستم آتے نہیں سکتا
 پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم آتے نہیں سکتا
 بیمار ترا صورت تصویرِ نہالسی
 کیا آتے ہے سرِ بستہ غم آتے نہیں سکتا

کمی ہوتی نہیں نقد سخن کی یاں کبھی ناسخ
ازل سے اپنے قابو میں معانی کا خزانہ ہے

یہ بہار آئی کف ہر شاخ پر پیمانہ ہے
ہر روش میں جلوۂ باد صبا مستانہ ہے

میرے یوسف کی خریداری عزیز ہے محال
نقد جاں ہے اسکی قیمت نقد دل بیعانہ ہے

محو ایسے خانہ رنگیں میں مہماں ہو گئے
یہ نہیں ثابت کسی پر کون صاحب خانہ ہے

ناں گرتا ہے کبھی ارلاش گرتی ہے کبھی
جوز چہ خانہ ہے وہ اک روز ماتم خانہ ہے

پاؤں میں کاتے چبے ہیں پیرھن ہے چاک چاک
باغ میں جو گل ہے تیرے عشق میں دیوانہ ہے

ہو گیا منیا ئے مئے خالی اگر توجان لے
ساقیا لب ریز اپنی عمر کا پیمانہ ہے

اپنے کاموں میں رہو مشغول تم اے غافل
اسکی باتوں پر نجاؤ ناسخ اک دیوانہ ہے

داغ دل چمکا خیال عارض پر نور سے
ہو گیا روشن چراغ اپنا چراغ طور سے

یوں نزاکت سے گراں ہے سرمہ چشم یار کو
 جس طرح ہورات بہاری مردم بیمار کو
 دل میں ایمن ہو نہ جو خونخوار دشمن ہے ضعیف
 مورچا دیکھو تو کھا جاتا ہے کیا تلوار کو
 کیا دلا شکوہ بتوں کا قصہ موسیٰ ہے یا د
 رنج دیتا ہے خدا بھی طالب دیدار کو
 ہے برون کو عیش اور اچھوں کو ہے دنیا میں رنج
 توڑتا ہے گل کو گلچیس چھوڑتا ہے خار کو
 جبکہ بیت اللہ میس ناسخ بتوں کا ہو مقام
 بارکیوں کو ہونہ بزم یار میس اغیار کو

اجل سر پر کھڑی ہے خواب غفلت میں زمانہ ہے
 چھپرکت کے عرض لازم جنازے کا بنانا ہے
 نکلتا ہے جو ہر گل زربکف گلزار عالم میں
 خدا جانے زمین میں دفن یہ کس کا خزانہ ہے
 بگڑتے جاتے ہیں لاکھوں ہزاروں بنتے جاتے ہیں
 جہاں میں رات دن جاری خدا کا کارخانہ ہے
 چھپایا ہے جو منہ پردے میں تو نے اے پری ہم سے
 کفن میں ہم کو اب سارے جہاں سے منہ چھپانا ہے

نہیں ہوتے ہیں فراموش صنم
خاک ہم یاد خدا کرتے ہیں

موسم گل میں بشر ہے معذور
گل تلک چاک قبا کرتے ہیں

در روز ایک رضع پہ رنگ جہاں نہیں
وہ کون سا چمن ہے کہ جسکو خزاں نہیں

دشمن اگر وہ درست ہوا ہے تو کیا عجب
یاں اعتماد درستی جسم رجاں نہیں

آنکھوں سے فائدہ جو نہیں تیری گرد راہ
حاصل جیبیں سے کیا جو ترا آستان نہیں

حاصل تجھے بصارت یعقوب ہو اگر
یوسف بغیر کون یہاں کارواں نہیں

منعم کے شکر میں بھی ہلا ئیں کبھی کبھی
تذہا برائے لذت دنیا زبان نہیں

جنگے سروں پہ آپ مگس راں رہا ہما
اُن کا لحد میں آج کوئی استخوان نہیں

دھوکا نہ کہا ظرورف روضو کو تو دیکھ کر
مسجد میں مئے فروش کی ناسخ دکان نہیں

خبر نہیں جنہیں کچھ انقلاب گردوں کی
 غرور نیّر اقبال و جاہ کرتے ہیں
 غنیم موت ہے اُس سے بھلا لڑے گا کون
 عبث جناب فرا ہم سپاہ کرتے ہیں
 جو ناامید ہیں اہل ورع ہیں اے ناسخ
 امیدوار شفاعت گناہ کرتے ہیں

جان ہم تجھ پہ دیا کرتے ہیں
 نام تیرا ہی لیا کرتے ہیں
 چاک کرنے کے لئے اے ناصح
 ہم گریبان سیا کرتے ہیں
 سا غرچشم سے ہم بادہ پرست
 مٹے دیدار پیا کرتے ہیں
 زندگی زندہ دلی کا ہے نام
 مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں
 سنگ اسود بھی ہے بہاری پتھر
 لوگ جو چوم لیا کرتے ہیں
 ان سے ہیں مخفی عصیاں بہتر
 جو عبادت میں ریا کرتے ہیں

خوش عبث ہوتے ہیں نادان ماہ نو کو دیکھ کر
ایک مہینا عمر کا ہوتا ہے کم ہر ماہ میں
سربتوں کے آستانے سے نہ اُتے حشر تک
یہ دعا ناسخ کی ہے یارب تری درگاہ میں

— — —

مستوں کا عیش تلخ ہے دیر خراب میں
یہ رمز ہے جو ہوتی ہے تلخی شراب میں
بیدار دل جو ہیں انہیں سونے سے کیا ضرر
یوسف ہوا ستاروں کا مسجود خواب میں
لیتے ہیں رنج مرشد کا مل مرید کا
مہتاب میں ہے داغ، جلن آفتاب میں
ہے رات چودھویں مجھے ساقی پلا شراب
روشن ہو آفتاب شب ماہتاب میں

آنا کہ خاک را بنظر کیمیا کنند
نا سخ ہیں خاک رہگذر بو تراب میں
ہماری آہ رہ سنکر جو راہ کرتے ہیں
غزل سرا ہوئے ہیں ہم کہ آہ کرتے ہیں
سزا ملیگی جو انسان چاہ کرتے ہیں
یہاں فرشتوں کو محبوس چاہ کرتے ہیں

ملیگا رزق تقدیری کروں تدبیر کیا نا سبغ

وہ ہرزہ ہے ارادہ جو کرے تحصیل حاصل کا

ماہ نو ہے مثل ابرو لیکن اسکا رو نہیں

ماہ کامل صورت رو ہے مگر ابرو نہیں

مشک میں خوشبو سے پیچ و تاب مثلِ مونہیں

پیچ ہیں سنبل میں مثلِ مونہیں خوشبو نہیں

کون سا تن ہے کہ مثلِ روح اُسمیں تو نہیں

کون ہے گل جو ترا مسکن برنگِ بو نہیں

جامِ نرگس میں کہاں شبنم جو نکلے آفتاب

یار کے آگے مری آنکھوں میں اک آنسو نہیں

کیوں نہ ہو فرہادِ نا کام اور خسرو کا میاب

زورِ زر کے سامنے کچھ قوت بازو نہیں

یاں ازل سے داغِ سودا ہے دل آگاہ میں

سنگِ اسودِ جسطرح ہو نصب بیتِ اللہ میں

دل میں رہتا ہے پر آنکھوں کو نظر آتا نہیں

کیا تفاوت اب رہا اُس بت میں اور اللہ میں

بعدِ مردن اسکو راحت اُسکو ہے حسرت نصیب

فرق اتنا ہی نظر آیا گدا اور شاہ میں

جب خرام ناز کو ترواے پری پیکر اُٹھا
 ہر قدم پر جائے گرد اک فتنہ معشر اُٹھا
 طرفہ گل اس باغ میں ہیں اور شبنم ہے عجیب
 ہنسکے بیٹھا جو تری محفل میں وہ رو کر اُٹھا
 کردیا ہے یاد چشم و گردن جاناں نے مست
 سا منے سے سا قیاب شیشہ رسا غر اُٹھا
 زندگی میں صرف کر، تا ہو سبکدوشی حصول
 مثل قارون خاک میں جا کر نہ ہار زر اُٹھا
 بات جن نازک مزا جوں سے نہ اُٹھتی تھی کبھی
 بوجہ اُن سے سیکڑوں من خاک کا کیونکر اُٹھا
 کیا سخن سنجی سے حاصل جب سخند ان ہی نہیں
 زانرے فکرت سے اے ناسخ تو اپنا سر اُٹھا

پس جما زہ لیلیٰ یہ کہتا ہے جرس دل کا
 ہمارا پردہ غفلت ہی بس پردہ ہے محمل کا
 لگے جو تیر پھر باہر نہ نکلے عشق مڑ گاں میں
 بنائے کوئی تیر انداز گرتودہ مری گل کا
 گنا کرتا ہے کتنے بیگناہوں کا کیا ہے خون
 جو اسکو مشغلہ ہے رات دن عقد انا مل کا



سمجھے میکش دیکھ کر ابرو تری بالا لائے چشم

میکدے سے مرتبہ اعلیٰ ہے بیت اللہ کا

جا بربرا برھے دل مادر میں ہر فرزند کی

رتبہ زیر خاک یکساں ہے گدار شاہ کا

پونچھتا اشک اگر گوشہ دماں ہوتا

چاک کرتا میں جنوں میں جو گریباں ہوتا

اپے ہونٹوں سے جوا کبار لگا لیتا رہ

ہے یقین سا غرمئے چشمہ حیراں ہوتا

نگہت کا کل پیچاں سے جہر دیتے تشبیہ

عطر معمر عہ کا ہرج-زور پریشاں ہوتا

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے

آج آتی شب فرقت میں تو احساں ہوتا

کیا قوی ہے یہ دلیل اسکی پریزادی کی

ربط انسان سے کرتا جورہ انساں ہوتا

اے بتو ہوتی اگر مہر و محبت تم میں

کوئی کا فریبی نہ والا اللہ مسلمان ہوتا

حسرت دل نہیں دیتا ہے نکلنے ناسخ

ہاتھ شل ہوتے میسر جو گریباں ہوتا

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب
ہاں تتبع کرتے ہیں نا سخ ہم اُس مغفور کا

کوئی غارت گر نہیں دیوانوں کے اسباب کا
خانہ زنجیر کو کچھ غم نہیں سیلاب کا
غفلتِ اہلِ جہاں تر دامنِ کی ہے دلیل
غلبہ ہوتا ہے رطوبت سے مقرر خواب کا
پاک طینت جو کہہ ہیں اسے تعلق دور ہے
خار سے کیا الجھے گوشہ چادرِ مہتاب کا
عکس پرتا ہے جو ترے آئینوں میں پیشتر
اضطراب اس واسطے جاتا رہا سیماب کا
جور اعدا پر بھی کر سکتا نہیں ترک وطن
دھیان آتا ہے جو نا سخ فرقتِ احباب کا

وصل کیا ہم خاکساروں کو ہوا اس دلخواہ کا
خاک میں آلودہ ہونا کب ہے ممکن ماء کا
ہے فرور مایوں سے پہلے رنج امیدِ نفع میں
ہاتھ بے منت نہیں آتا ہے پانی چاہ کا
قامت موزوں نظر آئے مجھے جائے الف
تھا شروع عاشقی دن مری بسم اللہ کا

وہ شوخِ فتنہ انگیز اپنی نظروں میں سمایا ہے
 کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جسکے دامن کا
 دیا میرے جنازہ کو جو کاندھا اس پر پروئے
 گمان ہے تختۂ تابوت پر تختِ سلیمان کا
 تہِ شمشیر قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ
 کہ عالم ہر دھان زخم پر تھا روئے خندان کا

کیا اثر میری سیہ بختی کے آگے نور کا
 ماہ ہے ایک خالِ رخسارہ شبِ دیبورو کا
 مرگیا ہوں دیکھ کر جلوہ رخ پر نور کا
 میری لوحِ قبر کو زیبا ہے پتھر طور کا
 ترک لذت کر دلا پہونچے نہ تھکے کچھ گزند
 نوش تو پیچھے ہے پلے نیش ہے زنبور کا
 دعویٰ باطل سے ہو جاتے ہیں اکثر نامور
 شہرہ کیا بانگِ انا الحق نے کیا منصور کا
 ہیں جو صاحبِ درد اُن سے دور ہے سامانِ عیش
 بادہ کہینچا ہے کسی نے زخم کے انگور کا
 کوئے قاتل میں پہنچ کر سر ہوا مجھکو وبال
 ہوجہ اُترنے کی جگہ دم چڑھ گیا مزدور کا



ارل تو ارسکے کرچے میں جانا محال ہے
 اور جائے تو راں سے پھر آنا محال ہے
 سمجھے تو سمجھے کچھ وہ خموشی میں حالِ دل
 فریاد کرے اور سکو جتنا محال ہے
 ہے اوسکا جلوہ گاہ مرا خانہٴ دل اب
 دونوں جہاں میں جسکا سمانا محال ہے
 رونے سے اور آتشِ الفت بھڑک اُٹھی
 اب اس لگی کا دل سے بچھانا محال ہے
 کیا پوچھتا ہے اپنے زخود رستگان کا کہ-روح
 ایسے گئے کہ آپ میں آنا محال ہے
 جرات بہا وہ اشک کہ جسمیں اثر ہو کچھ
 رونا ہے یوں تو سہل رانا محال ہے

انتخاب از دیوانِ ناسخ

مراسینہ ہے مشرقِ آفتابِ داغِ ہجران کا
 طلوعِ صبحِ معشر چاک ہے میرے گریباں کا
 ازل سے دشمنی طاؤس و مار آپس میں رکھتے ہیں
 دل پر داغ کو کیونکر ہے عشق اُس زلف پیچان کا

ہوا یہ آشکارا حضرت یوسف کے قصے سے
کہ دنیا میں نہیں تک دیکھ سکتا بھائی بھائی کو
پڑے مشکل تو کر مشکل کشا کو یاد اے جرأت
کہ خالق نے کیا ہے خلق اسے مشکل کشائی کو

دی تصور نے کسیکے اور بینائی مجھے
بند آنکھوں پر بھی رہ دیتا ہے دکھلائی مجھے
گھر میں کیا بیٹھا ہے ظالم آتماشا تر بھی دیکھ
کھینچ لائی ہے سربازار رسوائی مجھے
لوگ آتے ہیں تماشا کو مرے بے اختیار
عشق نے جسے کیا تیرا تماشا ئی مجھے
حالِ دل اس سے کہوں کیونکر کہ اسکو دیکھ کر
بھول بس جاتی ہے گویا صاف گویائی مجھے
کچھ نظر آتا نہیں یہ معر حیرانی ہوں میں
جیسے اک تصویر سی صورت نظر آئی مجھے
دیکھوں جرأت اسکو تو کہتا ہے یہ منہ پھیرے
کن بری آنکھوں سے دیکھے ہے یہ سودائی مجھے

آنکھوں کی راہ تکلے ہے کیا حسرتوں سے دم
 وہ روبرو جو اپنے دم واپسیس نہیں
 حیرت ہے ہمکو کیونکہ ہے جرأت وہ چین سے
 جس بن قرار جیکو ہمارے کہیں نہیں

شکل دودن سے جو تم نے ہم کو دکھلائی نہیں
 کل سے بیکل ہیں ہمیں کل آج تک آئی نہیں
 اس دلِ وحشی سے جو تم بھاگتے ہو دور دور
 اپنا دیوانہ اسے سمجھو یہ سودائی نہیں
 اُسکے جانے سے مرے دلمیں نہیں کچھ اور سوچ
 ہے یہی حیرت کہ کیوں اب تک اجل آئی نہیں
 گردیکہ-ونگا تمہیں تو اور ہوں گا بیکرار
 اسمیں رسوائی ہے کچھ ملنے میں رسوائی نہیں
 دید کا طالب ہوں تو ہنس کر کہے جرأت وہ شوخ
 خاک دیکھیں گے تری آنکھوں میں بینائی نہیں

سمجھتے ہم جو پہلے معنی لفظ جدائی کو
 تو رکھتے طاقِ نسیاں پر کتابِ آشنائی کو
 نکر صیاد اور نہیں آزاد جو پابند الفت ہیں
 گرفتاری سے بدتر جانتے ہیں وہ رہائی کو

بہلا دیکھو تو ہم تم ایک ہی بستی میں بستے ہیں
 سو تسپر یہ غضب ہے دیکھنے کو بھی ترستے ہیں
 جنوں عشق سے یہ حال ہے اپنا کہ ہم وحشی
 کبھی ہنس ہنس کے روتے ہیں کبھی رور کے ہنستے ہیں
 نہیں لیتا ہے کوئی تھیکروں کے مول بھی ان کو
 دل عشاق کیا کوچے میں اُس قاتل کے سستے ہیں
 کیا ہے ذبح ہم کو آپ کے تیغ تغافل نے
 کمر ہم بسملوں کے قتل پر کیا آپ کستے ہیں
 سنا کرتا تھا جوا شعار اپنے روز و شب جرات
 سواب آراز بھی ہم اسکے سننے کو ترستے ہیں

لگجا گلے سے طاقت اب اے ناز نہیں نہیں
 ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں
 اس بن جہان کچھ نظر آتا ہے اور ہی
 گویا وہ آسمان نہیں رہ زمیں نہیں
 کیا جانے کیا وہ آسمیں ہے لوٹے ہے جسدہ جی
 یوں اور کیا جہان میں کوئی حسدیں نہیں
 سنتا ہے کون کس سے کہوں درد بیکسی
 ہمدم نہیں ہے کوئی مرا ہمنشیں نہیں



مشقِ فریاد و فغاں کرتے ہیں مرغِ چمن
 وضع پر نالونکی میرے کچھ اورا سکتے نہیں
 کوئی اسکی اور ہمارے دیکھو صحبتِ ذرہ
 مل رہے ہیں دل رتے نظریں ملا سکتے نہیں
 دور بیٹھے ارن سے آنکھوں میں یہی کہتے ہیں ہم
 تم بلا سکتے نہیں ہم آپ آسکتے نہیں
 جی میں سو بار آئے ہے جرأت نہ ملئیے یار سے
 پر سمجھ کر دلمیں کچھ سو گند کھا سکتے نہیں

گھر سے نکلا وہ نازنین نہ کہیں
 ورنہ ہم دیکھتے کہیں نہ کہیں
 اسکا عاشق مجھے کہیں ہیں سب
 پرار سے ہووے یہ یقین نہ کہیں
 وعدہ وصل ارس سے لوں کیوں کر
 درہے کر بیٹھے وہ نہیں نہ کہیں
 روئے ہے بات بات پر جرأت
 ہے گرفتار یہ کہیں نہ کہیں

یارو میں کیا کہوں کہ جلا کس طرح پتنگ
 پوچھو زبانِ شمع سے اور سکی لگن کی بات
 شاید کہ اور سکا ذکر ہو یارو میں اسلئے
 سنتا ہوں گوشِ دل سے ہر اک مرد و زن کی بات
 جرات خزاں سے آہ چمن میں نہ کچھ رہا
 اک رہگئی زبان پہ گل اور سمن کی بات

مثلاً آئینہ باصفا ہیں ہم
 دیکھنے ہی کے آشنا ہیں ہم
 نہیں دونوں جہاں سے کام ہمیں
 اک فقط تیرے مبتلا ہیں ہم
 ہم بھی کچھ چیز ہیں میاں لیکن
 یہ نہیں جانتے کہ کیا ہیں ہم
 تک تو کر رحم اے بتِ بے رحم
 آخرش بندہ خدا ہیں ہم
 دل کے ہاتھوں سے اے میاں جرات
 زندگانی سے بھی خفا ہیں ہم

کوچہ جاناں سے جاتے ہیں پہ جاسکتے نہیں
 گو اُٹھاتے ہیں قدم پر دل اُٹھا سکتے نہیں

سرگرم طلب جو تے تری راہ میں ازن کا
 ہے رہبر کونین ہراک نقش قدم کا
 جو پائے اسے دل ہی میں اے برہمن و شیخ
 نہ دیر کا طالب وہ رہے پھر نہ حرم کا
 سمجھے ہیں غرض اہل نظر بود کو نابود
 ہستی میں ہے جو سوسروطن ہے عدم کا
 تم خوب نظر آئے ہمیں قول کے سچے
 کیا کیجے کہ ہے ہم کو لحاظ اپنی قسم کا
 اللہ رے ترے بوقلموں جلوے کا عالم
 ہر رنگ کے عالم میں دکھا جائے ہے جہم کا
 جرأت کی خبر لینا ہر تو جلد لو صاحب
 تم دیتے ہو دم اور سکو بھروسا نہیں دم کا

بلبل سنے قفس میں نہ کیوں کر چمن کی بات
 آزارہ وطن کو لگی خوش وطن کی بات
 ہے موسم بہار میں باصد زباں خموش
 غنچہ نے کیا سنی ہے کسی کے دھن کی بات
 سر دیجے راہ عشق میں پر منہ نہ موز ٹیے
 پتھر کی سی لکیر ہے یہ کوہکن کی بات

شبِ دیجور ہو جاوے، جودن پر
 پڑے میری سیہ بختی کا سایا
 میاں بہر خدا در رخصتِ آہ
 کہ دم گھبرا کے اب ہونٹوں پر آیا
 عجب صحرا میں جرات ہم ہوئے گم
 کہ جوئندہ نے نقشِ پانہ پایا

یاں دم لبوں پہ ہے دل پر اضطراب کا
 ارزاں ہے اب تلک رھی عالم حجاب کا
 خوابِ رخیال ہو گئیں یوں پچھلی صحبتیں
 نقشا ہو جوں خیال میں برسوں کے خواب کا
 یوں داغِ شام ہجر ہے صبحِ فراق میں
 یاد آئے جیسے پیری میں عالمِ شباب کا
 کیجوز میں سے قبر برا بر مری کہ میں
 کشتہ ہوں ایک پردہ نشیں کے حجاب کا

گر کیجے ارادہ تری قدرت کے رقم کا
 تو پہلے ہی سر سجدے میں جھک جائے قلم کا

کوچے میں اسکے میں جو کراہا تو بول اُٹھا
 کیا جانیں اس مریض کو آزار کیا ہوا
 اپنی یہی خوشی ہے کہ تم خوش رہو میاں
 گر ہم ہوئے ہیں زیست سے بیزار کیا ہوا
 جرات کرے ہے کس لئے تو نالہ و فغاں
 کیوں ضبط چہت کیا تجھے اے یار کیا ہوا

شکوہ کیا کیجے نا تو انی کا
 کھر دیا لطف زندگانی کا
 صبح پیری کا گر نہ ہوتا خوف
 تب مزا تھا شب جوانی کا
 دے گیا چلتے رقت دلپر داغ
 میں تو بندہ ہوں اس نشانی کا
 اب تو سب کی زبان پہ ہے جرات
 ذکر اس تیری بے زبانی کا

یہ کس پردہ نشین سے دل لگایا
 کہ اک عالم سے ہم نے منہ چھپایا
 پترے تک کان میں کفر کے آواز
 یہ مجھ بیتیاب کی سن لے خدایا

پزینگے یوں ہی سنگِ تفرقہ گر
 تو اکدن شیشہٴ دل چور ہوگا
 ہوا ہوں مرگ ے نزدیکِ غم سے
 خدا جائے یہ کس دن دور ہوگا
 رہی سمجھینگا میرے زخمِ دل کو
 جگر پر جسکے ایک ناسور ہوگا
 ہمیں پیمانہ تب دیگا یہ ساقی
 کہ جامِ عمر جب معمور ہوگا
 یہی رونما ہے گر منظورِ جرأت
 تو بینائی سے تو معذور ہوگا

کیوں اُٹھ چلا جہاں سے دلِ زار کیا ہوا
 بیٹھے بٹھائے تجھکو یہ آزار کیا ہوا
 اے شوخ تیرے کوچے میں دل نام ایک شخص
 ہر دم کراہتا تھا وہ بیمار کیا ہوا
 صیاد تک قفس کسی خبر لیجیو شتاب
 ہے کیوں خموش مرغِ گرفتار کیا ہوا
 تک درتک اپنے جائے اسیرونکی لے خبر
 یہ شور سا ترے پسِ دیوار کیا ہوا

کافر ہوں کچھ خیال ہو گر عزوجاہ کا
 الفت کا میں غلام ہوں چاکر ہوں چاہ کا
 دل پر لگا اولت کے رہیں تیرآہ کا
 جوں یاد آگیا وہ پلٹنا نگاہ کا
 یوسف سا شخص لائے نیا چاہ میں اسیر
 ہے طرفہ جذب عشق زلیخا کی چاہ کا
 امید مغفرت پہ تو نازاں ہیں ہم رلے
 ارسکو خیال کب ہے ہمارے گناہ کا
 دم مارتے نہیں اور اٹھاتے ہیں ظلم یار
 اپنا جو ایک مزاج پڑا ہے نباہ کا
 یہ بخت سوگئے کہ ترستے ہیں ارسکو بھی
 وہ دیکھنا جو خواب میں تھا گاہ گاہ کا
 آزارہ در بدر ہوں میں جرأت بقول میر
 خانہ خراب ہو جیو اس دلکی چاہ کا

جہاں کچھ درد کا مذکور ہوگا
 ہمارا شعر بھی مشہور ہوگا
 جہاں میں حسن پر در دن کے اے گل
 کوئی تجھ سا بھی کم مغرور ہوگا

کیوں ہوئے رفیقوں سے جدا بیٹھتا حیراں
 اے ضعف اگر میں بھی قدم جلد اٹھاتا
 کچھ کام نہ تھا مجھ کو گرفتاری غم سے
 گرد امِ محبت میں مجھے تو نہ پہنساتا
 ہر چند کروں نالہ شہگیر میں جرأت
 پرچونکے ہے کب نیند سے وہ نیند کا صاتا

سچ تو یہ ہے بے جگہ ربط اندنوں پیدا کیا
 سوچ ہے ہر دم یہی ہم کو کہہ منے کیا کیا
 وہ گیا اُتے کر جدھر کو میں اردھر حیران سا
 ارسکے جانے پر یہی کتنی دیر تک دیکھا کیا
 میری اور اس شوخ کی صاحب سلامت جوں ہوئی
 صبر و طاقت نے کہا لوہم نے تو مجرا کیا
 سوزشِ دل کیا کہوں میں جب تلک جیتا رہا
 ایک انگرا سا پہلو میں مرے دھکا کیا
 عشق بازی میں کہا جرأت کو سب نے دیکھ کر
 یہ عزیز اپنی ہمیشہ جان پر کھیلا کیا

کس طرح یقین آ رہے مجھے آنیکا تیرے
 اک بار اگر ہاں ہے تو سو بار نہیں
 ہوں شعلہ تصویر چراغ شب مہتاب
 جلنے سے مرے کوئی خبردار نہیں ہے
 اے شیخ حرم خرقہ پندار میں تیرے
 رہ کون سا ہے تار کہ زنا رہیں ہے
 تہی دید کی رخصت تو نہ تہی طاقت دیدار
 طاقت ہے تو اب رخصت دیدار نہیں ہے
 ہیں پست و بلند اسمیں بہت دیکھو راسخ
 رہ عشق کے دیوانے کی ہموار نہیں ہے

انتخاب از کلیاتِ جرأت

ہر رنگ میں گر ہمکو رہ جلوہ ندکھاتا
 تو گلشنِ گیتی کا کوئی رنگ نہ بھاتا
 گردِ دستِ قضا تو دلِ عاشق نہ بناتا
 تو پھر یہ غمِ عشق کسی جانہ سما تا

اس شرمگیں نگہ سے جگر سب فگار ہے
 واں تیر نیمکش ہے پہیاں دل کے پار ہے
 اس راہِ عاشقی میں کہ مشکل گزار ہے
 جو سربکف ہے اوسکا قدم استوار ہے
 ہے میرے خاک اوزانے سے وحشت پہ عرصہ تنگ
 جس دشت میں کہ میں ہوں ہوا پر غبار ہے
 منعم ہمارے فکر کو مت چشم کم سے دیکھ
 بے مائگی یہ اپنی بہت مایہ دار ہے
 لے جا تو آن کر مجھے پیش از وداع یار
 اے بیخودی پہونچ کہ ترا انتظار ہے
 دے دن گئے کہ ضبطِ بکا پر تھا اختیار
 اب ہم ہیں اور گریہ بے اختیار ہے
 راسخ تو آہ مرثیہ گو اپنے دل کے ہیں
 رونما رولانا بس یہی انکا شعار ہے

جو بندہ کہ رحمت کا سزاوار نہیں ہے
 اوسکا یہ گنہ ہے کہ گنہگار نہیں ہے
 مت ہم کو ذرا اوس سے گذر جائیگا زاہد
 دن حشر کا فرقت کی شبِ تار نہیں ہے

چہیے ایک جھمکی سی کچھ دکھا' ہنسے اس طرح کہ رلا دیا
 نظر آئے کیوں مجھے برق ساں نمط ابر کی جو رولا گئے
 عبت اس سے بیٹھے ہودل لگا چلو راسخ اب کہیں یانسے تم
 روش آن عزیزوں کی خوب تھی جودل اس چمن سے ارتھا گئے

سب ترے طالب دیدار پریشاں پائے
 جنکو دیدار میسر تھا رے حیراں پائے
 کچھ قرار می نہیں آبادی معمورہ دھر
 جس جگہ شہر تھے راں ہم نے بیاباں پائے
 منزل اس راہ سے نزدیک بہت ہے لیکن
 کم شناسائے رہ چاک گریباں پائے
 تھے بہت مختلف الحال ترے دیوانے
 کئی خنداں نظر آئے کئی گریاں پائے
 اثر عشق نے حاکم کو کیا ہے محکوم
 عبد نا چیز کے شہ تابع فرماں پائے
 لاگ کس شعلہ سرکش سے ہے تبحھ کو راسخ
 تیرے سینے میں تو آتشکدے پنہاں پائے

ہوئے ہیس پیرہم اب دیدنی رونا ہمارا ہے
 پلک پر اپنی آنسو صبح پیری کا ستارا ہے
 خدا جانے نہاں اس آشکارا میں ہے کیا کیا کچھ
 خوشارے اہل دل جن پر نہاں بھی آشکارا ہے
 خلک ایسا ہمارے دریئے ایذا نہ تھا آگے
 یہ بے مہری تمہاری ہے تمہارا ہی اشارا ہے
 یہی کہہ کہہ کے مارا اپنے بیمار محبت کو
 کہ تو مرنے سے ڈرتا ہے بہت جی تجھ کو پیارا ہے
 شروع عشق را سخن کہتے ہو جاتا ہے جی دوبا
 کنارے ہی پہ اس دریا کے حال ایسا تمہارا ہے

مجھے سن فسرده مزاج ساوے بہار کی روش آگئے
 دبی آگ کر گئے مشتعل گہٹی شورشوں کو بڑھا گئے
 انہیں آرزو تھی کہ صدمہ کش رہوں پا ئمالی خلق کا
 مجھے نقش پا کی سی طرح رے سر راہ اپنی بٹھا گئے
 کوئی عضو اس سے لذت نہ تھا میرے جسم نزار میں
 یہی ہے سبب کہ تمہارے غم دل درد مند کو کھا گئے
 نہ کلا لے اپنی گدا گیا نہ شاہ اپنے افسر زر کے تئیں
 یہ ہے وہ جگہ کہ برہنہ سر چلے یا نسے شاہ و گدا گئے

آرائش زلف اپنی کیا ہم کو دکھاتے ہو
 کیوں ہائے درا نے کی زنجیر ہلاتے ہو
 اس باغ میں زیبا تر سب سے نظر آتے ہو
 گل پھول بہت ہیں پر ہم کو تمہیں بہاتے ہو
 اشیائے در عالم پر آنکھ از نکی نہیں پڑتی
 کیا دیکھنے والوں کو تم اپنے دکھاتے ہو
 معصوم جسے کرتے ہو اسرار کا اپنے تم
 حیراں ہوں کہ دیوانہ کیوں اس کو بناتے ہو
 جس پر کہ بٹھاتے ہو نقش اپنی تمنا کا
 اس دل کو در عالم کی خواہش سے اڑھاتے ہو

چاہنے والوں سے اپنے یوں خفا تم کیوں ہوئے
 دشمنِ جانی اربابِ وفا تم کیوں ہوئے
 دل دیا گر اس کو ہمنے مت ملا مت کر ہمیں
 اونسے کہہ نا صبح کہ ایسے دلربا تم کیوں ہوئے
 سرد مہری نے تمہاری یہ ستم تازہ کیا
 میرے ہوتے غیر پر گرم جفا تم کیوں ہوئے
 موردِ رحمت تو اے راسخِ خرابا تھی ہی ہیں
 مے سے توبہ تم نے کیوں کی پار ساتھ کیوں ہوئے

و ارفقہ جلوہ ارس صنم کے
 کب کر سکیں فرق کفر و دین میں
 راسخ کو تم نے مار رکھا
 بس ایک نگاہ شرمگیں میں

پوچھو مت عشق کے ذوقِ غم پنہانی کو
 کیجے کس طرح بیاں لذتِ روحانی کو
 گذری کس لطف سے بے منتِ مخلوق اپنی
 ہم نے سرِ مایہ کیا بے سرو سامانی کو
 دیکھ کر زخمِ جگر میرا سرا ہیں ہیں لوگ
 میں سرا ہوں ہوں تمہاری نمک آفشانی کو
 تن لیلیٰ ہی کی خوبی سے سبب اسکا پوچھ
 ہم کہیں قیس کے کیا باعثِ عریانی کو
 کاش یہ زلفِ دراز اپنی نہ کھولی ہوتی
 تمنے کیوں طول دیا میری پریشانی کو
 سا جداں درجائے کی ہے تقلید بھی خوب
 راسخ آلودہ رکھو گرد سے پیشانی کو

نقش پا سے ہیں تمہاری رہ میں رہنے دو ہمیں
 خاکساروں کے مٹا دینے سے کچھ حاصل نہیں
 کفر ہے علم وجود غیر پیش حق شناس
 یہ نہو اسے شیخ تو پھر کفر بھی باطل نہیں
 مت خیالِ این دآن کو دلمیس اپنے دے جگہ
 یہ تو خلوت خانہ معشوق ہے محفل نہیں
 نقش آئینہ ہے حسن صورت نقاش کا
 حیف مہجوں سوئے لیلی آفریں مائل نہیں
 مرگئے ہیں طالع خوا پیدہ را سخ کے مگر
 ورنہ اتنی دیر خوا بی خواب میں داخل نہیں

جز داغ ہے کیا دل حزیں میں
 لالہ ہی ارگے ہے اس زمیں میں
 انکار ہے ارن کالذت آمیز
 ہے زور مزا نہیں نہیں میں
 رہ خال سیاہ لیگیا دل
 بیطوریہ چورتھا کمیں میں
 دل کیوں نہ عزیز مچھوہو رہے
 ہے نام تمہارا اس نگیں میں

د نیا ہے جسکا نام سو باطن ہے شیخ کا
 ظاہر میں گو کہیں ہیں کہ د نیا سے کیا غرض
 کرتے نہیں دورنگی کو راسخ پسند ہم
 اس باغ کے ہمیں گل رعنا سے کیا غرض

دل بے حضور ہے کہیں جلوہ دکھاؤ تم
 تاریک ہے گہرا سمیں چراغ اب جلاؤ تم
 پہنچو بہت شتاب کہ یاں لگ رہا ہے کوچ
 دیر آئے تو یقیں ہے کہ ہم کو نہ پاؤ تم
 معجزو بی گریہی ہے تو پا جائیگا کوئی
 عمدانہ مجھ سے ہر گھڑی آنکھیں چراؤ تم
 کیا ہے یہ نقد جاں جو بہا ہو وصال کا
 اعلیٰ بہت ہے جنس ابی قیمت بڑھاؤ تم
 مصرف اسیکی ہے یہ تمہاری ردائے فقر
 راسخ اسے شراب کی صافی بناؤ تم

طا لبان یار کی منزل تو غیر از دل نہیں
 کعبہ کہتے ہیں جسے سوراہ ہے منزل نہیں

تا خوابِ مرگ ذکر تھا اون کا زبان پر
 نیند آگئی ہمیں تو اسی داستان پر
 نازان ہوں اپنے قلب شکستہ کی شان پر
 ہے عرشِ کوحسد اسی توتے مکان پر
 بازارِ یانِ عشق کی ہے طرفہ رسمِ دراہ
 رابستہ آہِ سرود ہے ان کا زبان پر
 اپنا بھی ماجرائے دل اک مرثیہ سا ہے
 بے اختیار روتے ہیں لوگ اس بیان پر
 یکبارہ دل ہوائے درِ عالم سے اُٹھ گیا
 بیتے ہم آن کر جو ترے آستان پر
 را سخ یہ کیا ہے عشق کو بد نام مت کرو
 عاشق ہوا در مرتے ہو نام و نشان پر

عاشق کو تیرے مسکن و مآوا سے کیا غرض
 خلد و بہشت و کور و رطوبی سے کیا غرض
 دیوانہ تیرے جلوہ حیرت فزا کا ہوں
 مجھ کو پیری کے جلوہ زیبا سے کیا غرض
 مقصود ذکرِ یار ہے اس پردِ یمیں مجھے
 ورنہ حدِ یث لیلی و عذرا سے کیا غرض

فقط گرد کی تہ تھی پیراہن تن
 نہ کچھ اور پاس اپنے اسکے سوا تھا
 کیا تو نے کیا ہائے اے ہوشیاری
 لباس اپنے تن پر رہی خوشنما تھا
 نہ لاتا تھا شاہونکو خاطر میں راسخ
 سبب اسکا یہ ہے کہ تیرا گدا تھا

اس بزم میں جو مست تھا ہشیار رہی تھا
 تھی بیخبری جسکو خبردار رہی تھا
 آج انکی نظر اور ہے کل تک تو بدستور
 چترن رہی اخلاص رہی پیار رہی تھا
 محرم نہ تے کچھ مدعی محرمی راز
 بے دعوے جو تھا محرم اسرار رہی تھا
 راہ طلب یار میں جس بے سروپا نے
 اپنے تئیں کہو یا تھا طلب گار رہی تھا
 جا تا رہا اس مرحلہ سے قیس صد افسوس
 ہم وحشیوں کا قافلہ سالار رہی تھا
 خاطر کے علاقہ نے نہ راسخ ہی کو عمارا
 مچنوں بھی موا جس سے یہ آزار رہی تھا

تعب کشانِ رہِ عشق کا جگر تو دیکھ
 کہ گل سمجھتے ہیں کا نٹا بھی وہ کفِ پا کا
 ہمارا دامنِ رحمت وسیع ایسا ہے
 کہ جسکے گوشہ میں چھپ جائے طولِ صحرا کا
 اس اپنے دیدہ پر آب کے سوا راسخ
 حباب کب کوئی روکش ہوا ہے دریا کا

جفاؤں کا اور سکی میں شاکر سدا تھا
 پر اپنی وفاداریوں سے گلاتھا
 بڑھی تو تنے سے مرے دل کی قیمت
 یہ شیشہ رگر نہ بہت کم بہاتھا
 (قطعہ)

علائق سے آزاد گی تھی میسر
 جنوں جن دنوں اپنا زنجیر پاتھا
 نہ تھی فکر پوشش کی دیوانگی میں
 اس اندیشہ کو میں نے تہ کر رکھا تھا
 نہ بالیں کی خواہش نہ بستر کی حسرت
 نہ پردا کلمہ کی نہ شوقِ قباتھا

ہستی نے عدم دل سے بہلا ہی دیا راسخ
غربت میں رہے یوں کہ وطن یاد نہ آیا

کوئی دارا ہو گیا یاں کوئی اسکندر ہوا
پوشہ نشہ رہے جو تیرا گدائے در ہوا
شیشہ سے نازک تمہارا دل ہے مانا ہمنے یہ
لیک یہ شیشہ ہمارے حق میں تو پتھر ہوا
کیا بیاں ہو صاحبان ظرف کی تاثیر قرب
آب کا قطرہ صدف تک آنکر گھر ہوا
نسخہ دل کا تھا وہ تار نظر شیرازہ بند
چشم پوشی ازن نے کی مجھ کو یہ ابتر ہوا
نگ بالش اوسکے ہیں راسخ یہ تیرے مشیت پر
صید اوس صیاد کا تو کس تروقہ پر ہوا

خودی ہے تیری نقاب اوسکے روئے زیبا کا
ارتھا دے اسکو اگر شوق ہے تماشا کا
کس طرح نہیں روغن سے یہ فروغ پذیر
چراغ عشق میں خون چاہئے تماشا کا

خون کرتی ہے دل کو ہیبتِ قرب
 شائستہ ہوں گو مصاحبت کا
 دزدن ہے یہ تنہا تنہا تصرف
 تاجند لباس عاریت کا
 بگڑی جب سب سے تب کچھ اڑن سے
 اسلوب بناموا فقرت کا

کب غنچہ کو دیکھ اوسکا دھن یاد نہ آیا
 کسوقت کہ وہ رشک چمن یاد نہ آیا
 تھا جی میں کہ د شوا رئی ہجر اس سے کہی گئے
 پر جب ملے کچھ رنج و معن یاد نہ آیا
 کیا کیا نہ تھے اقرار، یہ دل لیتے ہی تبھکو
 ایک ارنمیں سے اے عہد شکن یاد نہ آیا
 ہے چال تری وہ کہ ہمیں جسکے مقابل
 اس چرخِ جفا جو کا چلن یاد نہ آیا
 دل سے ترے دیوانہ کی پوشش ہے فراموش
 پیدہ راہن تن کیا انہیں تن یاد نہ آیا
 آنکھ کبھی بھول کے بھی تم نہ ادھر ہائے
 میرا تو تمہیں بیتِ حزن یاد نہ آیا

علم ہستی کا حجاب رخِ دلدار ہے آہ
کیا تماشا تہایہ پردہ جرنہ ہائل ہوتا
تمسے کچھ بندہ نے چاہا تو تمہیں کو چاہا
اور کیا مانگتا کس چیز کا سائل ہوتا

امیری کیسی کیا یہ مرتبہ شاہی وزیری کا
تو اے غافل شناسائے مدارج ہو فقیری کا
جوانی ہنس کے کاٹی اب پلک پر اشک چمکے ہے
جورات آخر ہوئی نکلا ستارہ صبح پیری کا
مرے نالوں کے سننے سے تو چپ لگ جا ئیگی تبھکر
نرک آہنگ میرے ساتھ بلبل ہم صفیری کا
گزارنا چاہتا ہے عجب دانش مجھ کو رتبہ سے
جنوں ابھی یہی تو وقت ہے اب دستگیری کا

یہ قلب محل ہے معرفت کا
عارف ہو اسی کسی منزلت کا
ہے عالم جاں بھی طرفہ عالم
جسمیں نہیں داخل شش جہت کا

ظاہر میں ہم اگر نہ پریشاں ہوئے تو کیا
 پہلو میں دل جو تھا سو بہت بے حضور تھا
 میری متاعِ عجز بھی کی ناپسند ہائے
 بولے کہ اس متاع پہ تھکرو غرور تھا
 بے وقریٰ کا ہماری سبب دل ہوا کہ آہ
 تھا جسدِ اعتماد وہی ناصبور تھا
 یوں موردِ جفا اسی تقصیر پر ہوئے
 اہلِ وفا تھے ہم یہ ہمارا قصور تھا
 پہلے مجھی کو لے گئی ساقی کی چشمِ مست
 با آنکہ مجھ کو سب سے زیادہ شعور تھا
 راسخ نے بادشاہ کو دیکھا نہ آنکہ اڑتا
 کیارہ گدا بھی صاحبِ طبع غیور تھا

کاش یوں تیرہ نہ یہ آئینہ دل ہوتا
 صاف ہوتا تو رخِ یار کے قابل ہوتا
 کامل اپنے تئیں جانا رہا ناقص زاہد
 نقص پر اپنے نظر ہوتی تو کامل ہوتا
 ترک لذات کی لذت نہوئی ہم کو نصیب
 یہ مزا کاش ہمارے تئیں حاصل ہوتا

نتیجہ ہے فقط یہ عجز کا جو شاہ شاہاں ہیں
 شرف بخشا ہے مشّت خاک کو اپنی خلافت کا
 مجاز آئینہ دارِ حسنِ محبوبِ حقیقی ہے
 وہ بیمعنی ہے جسکے تئیں نہو شوقِ اچھی صورت کا
 عبارت ہے فراقِ دوستِ دلی بے حضوری سے
 وصالِ دوست کیا ہے درمیاں سے اُٹھنا غفلت کا
 نہو ہمقدرِ بلبلِ صعوہ پر نالان رہ اے راسخ
 کہ تا تو تہمتی ہو شیوہِ اہلِ محبت کا

بالطبع دل طرب سے ہمارا نفور تھا
 اپنا تو غم ہی مایہٴ عیشِ سرور تھا
 ہم بوریٰ نشینوں کی اللہ ری شانِ فقر
 فرشِ حصید-رر و کشِ فرشِ سم-ور تھا
 ہجدہ ہزار آئینوں میں جلوہ گر ہوا
 ارسِ خورشما کو میرے یہ شوقِ ظہور تھا
 اکثر یہ خرقہ والے لبداسی نظر پڑے
 ہم سمجھے بے ریا جسے وہ جملہ زور تھا
 اپنے توجی کو لاگ تھی حورِ آفرین کیسا تہ
 زاہدِ قصور فہم سے شیدائے حور تھا

مشکل طہارتِ نفس اچھائے مردہ سہل
 انفاس پاک ہوتے تو تو بھی مسیح تھا
 حسنِ ملیح کا ہے ہمارے تو دل میں شور
 کہتے ہیں حسنِ یوسفِ مصری صبیح تھا
 محسود ہیں فصیحی و سحران کے راسخ اب
 گریہ بہت بلیغ بہت رہ فصیح تھا

خطرہم میکشوں کر کیا ہے خورشیدِ قیامت کا
 کہہ راں سر پر ہمارے سایہ ہوگا ابرِ رحمت کا
 نہ ہرگز ہو سکا اے انقلابِ آسمان تجھے
 طرف ہم غمزدوں کے پھیرنا ار سکی طبیعت کا
 مبادا رنجہ ہو قاتل کا دستِ بازوئے نازک
 اس اندیشہ میں گذرا ہے وقتِ اپنی شہادت کا
 یہ صحرائے وسیعِ قلب مملو ہے عجائب سے
 اسیکو سیر کر گر شوق ہے تجھ کو سیاحت کا
 نظر کس شکل آئے روئے معشوق اسمیں اے زاہد
 ہے آئینہ ترا دل تو رخِ حورانِ جنت کا
 ہمارے رونے سے دریائے رحمت جوش میں آیا
 رہا ہر آن ہر ساعت ہر دم اشکِ ندامت کا

انتخاب از کلیات راسخ

مدعا عالم سے اپنا ہی فقط دیدار تھا
دید کو اپنی یہ آئینہ اسے درکار تھا
دل سے آگے کیسوں بڑھا تو اسے طلبہ گار وصال
پھر اردھر ہی جا رہی گھر جلوہ گاہ یار تھا
واقف راز اس کے انسان ہی نہیں تنہا کہ مور
کچھ سلیمان سے زیادہ محروم اسرار تھا
کفر بھی اک شان جلوے کی اوسی دلبر کے ھے
شیخ کیسوں تو برہمن سے برسر اندکار تھا
مدعی فہم و دانش دور پائے عقل سے
اپنے تو نزدیک دیوانہ بہت ہشیار تھا
دل ہوس والوں کے محروم اس کے پر تو سے رہے
جلوہ گاہ داغِ جانان سینہ ابرار تھا
کب دیت خواہ اپنا راسخ اپنے قاتل سے ہوا
وہ تو دست و تیغ قاتل ہی کا جانب دار تھا

مت کہہ کہ ترک لذتِ حسی قیدیم تھا
وہ سمجھتے یہ مزا جنہیں ذوقِ صحیح تھا



کبھی اے حقیقت منتظر! نظر آ لباس مجاز میں
 نہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
 طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے محرم گوش ہو
 وہ سرود کیا کہ چہپا ہوا ہو سکوت پردہ ساز میں
 تو بچا بچائے نہ رکے اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
 کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں
 دم طوف کرمک شمع نے یہ کہا کہ وہ اثر کہن
 نہ تری حکایت سوز میں، نہ مری حدیث گداز میں
 نہ کہیں جہاں میں امان ملی، جو امان ملی تو کہاں ملی
 مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں
 نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
 نہ وہ غزویں میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں
 جو میں سربہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
 ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

چمک تیري عیاں بجلی میں ' آتش میں ' شرارے میں
 جھلک تیري ہویدا چاند میں ' سورج میں ' تارے میں
 بلندی آسمانوں میں ' زمینوں میں تری پستی
 روانی بحر میں ' افتادگی تیري کنارے میں
 شریعت کیوں کر بیاں گیر ہو ذوق تکلم کی
 چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں
 جو ہے بیدار انسان میں وہ گہری نیند سوتا ہے
 شجر میں ' پھول میں ' حیواں میں ' پتھر میں ' ستارے میں
 مجمع پہونکا ہے سوز قطرہ اشک محبت نے
 غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سی شرارے میں
 نہیں جنس ثواب آخرت کی آرزو مجھ کو
 وہ سوداگر ہوں میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں
 سکون نا آشنا رہنا ہے سامان ہستی ہے
 تڑپ کس دل کی یارب چھپکے آبیٹھی ہے پارے میں
 صدائے لن ترانی سنکے اے اقبال میں چپ ہوں
 تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں؟
 نگہ کو نظارے کی تمنا ہے، دل کو سودا ہے جستجو کا
 چمن میں گلچیں سے غنچہ کہتا تھا، اتنا بیدرد کیوں ہے انسان؟
 تری نگاہوں میں ہے تبسم شکستہ ہونا مرے سب کو کا
 ریاض ہستی کے ذرے ذرے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
 حقیقت کل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا
 تمام مضمون مرے پرانے، کلام میرا خطا سراپا
 ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جو کا
 سپاس شرط ادب ہے ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھکر
 ذرا سا اک دل دیا ہے، وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا
 کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوک نشتر سے تو جو چھیڑے
 یقین ہے مجھ کو گرے رگ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا
 گیا ہے تقلید کا زمانہ، مجاز رخت سفر اٹھالے
 ہولی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا؟
 جو گھر سے اقبال دور ہوں میں، تو ہوں نہ معزوں عزیز میرے
 مثال گوہر وطن کی فرقت کمال ہے میری ابرو کا

چہیز آہستہ سے دیتی ہے مرا تار حیات
جس سے ہوتی ہے رہا روح گرفتار حیات
نغمہ یاس کی دھیمی سی صدا اُٹھتی ہے
اشک کے قافلے کو بانگ درا اُٹھتی ہے
جس طرح رفعت شبنم ہے مذاق رم سے
میری فطرت کی بلندی ہے نوالے غم سے !

غزلیات

زمانہ دیکھ گا جب مرے دل سے معشر اُٹھے گا گفتگو کا
میری خموشی نہیں ہے ، گویا مزار ہے حرف آرزو کا
جو موج دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان میری
گھر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھکو سامان اُبرو کا !
نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سر سبز رہ کے پانی میں عکس سرو کفار جو کا
کوئی دل ایسا نظر نہ آیا ، نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الہی تیرا جہان کیا ہے ، نگارخانہ ہے آرزو کا !
کہلا یہ مرکز کہ زندگی اپنی تھی طلسم ہوس سراپا
جسے سمجھتے تھے جسم خاکی ، غبار تھا کولے آرزو کا

سوتوں کو نندیوں کا شوق ، بھر کا نندیوں کو عشق
 موجہ بھر کو تپش ماہ تمام کے لئے
 حسن ازل کہ پردہ لالہ و گل میں ہے نہاں
 کہتے ہیں بیقرار ہے جلوہ عام کے لئے
 راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے
 زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

نوائے غم

زندگانی ہے مری مثل رباب خاموش
 جس کے ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش
 بربط کون و مکان جس کی خموشی پہ نثار
 جسکے ہر تار میں ہیں سیکڑوں نغموں کے مزار
 محشرستان نوا کا ہے امیں جس کا سکوت
 اور ملت کش ہنگامہ نہیں جس کا سکوت
 اہ ! امید محبت کی برائی نہ کبھی
 چوٹ مضراب کی اس ساز نے کھائی نہ کبھی
 مگر آتی ہے نسیم چمن طور کبھی
 سمت گردوں سے ہوائے نفس حور کبھی

ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی
 ملک سے عاجزی ، افتادگی تقدیرِ شبِ دم سے
 پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیا کے پانی میں
 مرکب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے
 مہوس نے یہ پانی ہستیِ نوخیز پر چھڑکا
 گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم سے
 ہوئی جنبشِ عیاں ، ذروں نے لطفِ خواب کو چھوڑا
 گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
 خرامِ ناز پایا آفتابوں نے ، ستاروں سے
 چٹک غنچوں نے پائی ، داغِ پائے لالہ زاروں سے

کوششِ ناتمام

فرقتِ آفتاب میں کہاتی ہے پیچ و تاب صبح
 چشمِ شفق ہے خوں فشاں اخترِ شام کے لئے
 رہتی ہے قیسِ روز کو لیلیٰ شام کی ہوس
 اخترِ صبح مضطربِ تابِ دوام کے لئے
 کہتا تھا قطبِ آسمان قافلۂ نجوم سے
 ہمرہو ! میں ترس گیا لطفِ خرام کے لئے

ابھی امکان کے ظلمت خانے سے ابھری ہی تھی دنیا
 مذاق زندگی پوشیدہ تھا پلہائے عالم سے
 کمال نظم ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
 ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشم خاتم سے
 سنا ھے عالم بالا میں کوئی کیمیاگر تھا
 صفا تھی جس کی خاک پا میں بڑھکر ساغر جم سے
 لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ
 چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشم روح آدم سے
 نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیاگر کی
 وہ اس نسخے کو بڑھکر جانتا تھا اسم اعظم سے
 بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
 تمنائے دلی آخر ہر آلی سعی پیہم سے
 پھرایا فکر اجزا نے اسے میدان امکان میں
 چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہ حق کے معبر سے
 چمک تارے سے مانگی ، چاند سے داغ جگر مانگا
 ازالی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے
 تڑپ بھلی سے پالی ، حور سے پاکیزگی پالی
 حرارت لی نفسہائے مسیح ابن مریم سے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
 خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
 'ا' غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
 بچھڑوں کو پھر ملا دیں 'نقشِ دولی' مٹا دیں
 سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
 'ا' اک نیا سوالہ اس دیس میں بنا دیں
 دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
 دامنِ آسمان سے اس کا کس ملا دیں
 ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
 سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
 شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
 دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

صحبت

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے
 ستارے آسمان کے بے خبر تھے لذتِ رم سے
 قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
 نہ تھا واقف ابھی گردش کے اُلیں مسلم سے

ھولی بام حرم پر آکے یوں گویا مؤذن سے
 نہیں کہٹکا ترے دل میں نمود مہرتاباں کا
 پکاری اس طرح دیوار گلشن پر کھڑے ہو کر
 چٹک او غنچہ گل! تو مؤذن ہے گلستان کا
 دیا یہ حکم صحرا میں ' چلو اے قافلے والو!
 چمکنے کو ہے جگنو بن کے ہر ذرہ بیاباں کا
 سوئے گور غریباں جب گئی زندوں کی بستی سے
 تو یوں بولی نظارہ دیکھ کر شہر خموشاں کا
 ابھی آرام سے لیٹے رہو میں پھر بھی اڑنگی
 سلا دونگی جہاں کو ' خواب سے تم کو جگاؤنگی

نیا سوال

سچ کہدوں اے برہمن! کر تو برا نہ مانے
 تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
 اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
 جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
 تنگی آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
 واعظ کا وعظ چھوڑا ' چھوڑے ترے فسانے

اے اے راز عیاں کے نہ سمجھنے والے
 حلقہ دام تمنا میں الجھنے والے
 ہائے غفلت ! کہ تری آنکھ ہے پابند مجاز
 ناز زیبا تھا تجھے تو ہے مگر گرم نیاز
 تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
 نہ سیہ روز رہے پھر نہ سیہ کار رہے

پیام صبح

(ماخوذ از لانگ فیلو)

اجالا جب ہوا رخصت جبین شب کی افشاں کا
 نسیم زندگی پیغام لائی صبح خنداں کا
 جگایا بلبل رنگیں نوا کو آشیانے میں
 کنارے کھیت کے شانہ ہلایا اس نے دھقان کا
 طلسم ظلمت شب سورۃ والنور سے توڑا
 اندھیرے میں ازایا تاج زر شمع شبستاں کا
 پڑھا خوابیدگان دیر پر افسون بیداری
 برہمن کو دیا پیغام خورشید درخشاں کا

صبح اک گیت سراپا ہے تری سطوت کا
 زیر خورشید نشان تک بھی نہیں ظلمت کا
 میں بھی آباد ہوں اس نور کی بستی میں مگر
 جل کیا پھر مری تقدیر کا اختر کیونکر؟

نور سے دور ہوں ظلمت میں گرفتار ہوں میں

کیوں سیہ روز، سیہ بخت، سیہ کار ہوں میں؟

میں یہ کہتا تھا کہ آواز کہیں سے آئی
 بام گردوں سے و یا صحن زمیں سے آئی
 ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود
 باغباں ہے تری ہستی پئے گلزار وجود
 انجمن حسن کی ہے تو، تری تصویر ہوں میں
 عشق کا تو ہے صحیفہ تری تفسیر ہوں میں
 میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے
 بار جو مجھ سے نہ اٹھا، وہ اٹھایا تو نے
 نور خورشید کی محتاج ہے ہستی میری
 اور بے منت خورشید چمک ہے تیری
 ہو نہ خورشید تو ویراں ہو گلستان میرا
 منزل عیش کی جا، نام ہو زنداں میرا

انسان اور بزم قدرت

صبح خورشید درخشاں کو جو دیکھا میں نے
 بزم معمور ہستی سے یہ پوچھا میں نے
 پرتو مہر کے دم سے ہے اجالا تیرا
 سیم سیال ہے پانی ترے دریاؤں کا
 مہر نے نور کا زیور تجھے پہنایا ہے
 تیری محفل کو اسی شمع نے چمکایا ہے
 گل و گلزار ترے خلد کی تصویریں ہیں
 یہ سبھی سورہ والشمس کی تفسیریں ہیں
 سرخ پوشاک ہے پھولوں کی 'درختوں کی ہری
 تیری محفل میں کوئی سبز کوئی لال پری
 ہے ترے خیمہ گردوں کی طلائی جہاں
 بدلیاں لال سی آتی ہیں افق پر جو نظر
 کیا بھلی لگتی ہے آنکھوں کو شفق کی لالی
 ملے گرننگ خم شام میں تو نے ڈھالی
 رتبہ تیرا ہے بڑا 'شان بڑی ہے تیری
 پردہ نور میں مستور ہے ہر شے تیری

سالا نو

ثوٽ ڪر خورشيد ڪي ڪشتي هولي غرقاب نيل
 ايڪ ٽڪرا تيرتا پهرتا ه رولے اب نيل
 طشت گردون ميں ٽپتا ه شفق ڪا خون ناب
 نشتر قدرت نے ڪيا ڪهولي ه فصد آفتاب؟
 چرخ نے بالي چرالي ه عروس شام ڪي؟
 نيل ڪے پاني ميں يا مچھلي ه سيم خام ڪي؟
 قافله تيرا رواں بے منت بانگ درا
 گوش انساں سن نهين سکتا تري آواز پا
 گھٽلے بڙهنے ڪا سماں آنڪھون ڪو دکھلاتا ه تو
 ه وطن تيرا ڪدھر؟ ڪس ديس ڪو جاتا ه تو
 ساٿم اے سياره ثابت نما ليچل مجمع
 خار حسرت ڪي خلش رڪھتي ه اب بيڪل مجمع
 نور ڪا طالب هون گھبراتا هون اس بستي ميں ميں
 طفلك سيماب پا هون مڪتب هستي ميں ميں

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زبان
 چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں
 وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
 دیکھ ! کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے
 محفل نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
 رنگ پر جواب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ
 تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا
 ہے دلیری دست ارباب سیاست کا عصا
 عرض مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
 نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے
 بندہ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
 قوت فرماں روا کے سامنے بیباک ہے
 ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامہ معجز رقم
 شیشہ دل ہو اگر تیرا مثال جام جم
 پاک رکھ اپنی زبان ، تلمیذ رحمانی ہے تو
 ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو
 سونے والوں کو جگادے شعر کے اعجاز سے
 خرمن باطل جلادے شعلہ آواز سے

تجھ پہ برساتا ہے شبلم دیدہ گریاں مرا
 ہے نہاں تیری اداسی میں دل ویراں مرا
 میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اک تصویر تو
 خواب میری زندگی تھی جس کی ہے تعبیر تو
 ہمشو نے از نیستان خود حکایت می کنم
 بشنوائے گل! از جدائیہا شکایت می کنم!

سید کی لوح تربت

اے کہ تیرا مرغ جاں تار نفس میں ہے اسیر
 اے کہ تیری روح کا طائر نفس میں ہے اسیر
 اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ
 شہر جو اجڑا ہوا تھا اس کی آبادی تو دیکھ
 فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی
 صبر و استقلال کی کہیتی کا حاصل ہے یہی
 سنگ تربت ہے مرا گرویدہ تقریر دیکھ
 چشم باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ
 مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں
 ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھانا کہیں

غافل ہے تجھ سے حیرت علم آفریدہ دیکھ !
 جو یا نہیں تری نگہ نارسیدہ دیکھ !
 رہنے دے جستجو میں خیال بلند کو
 حیرت میں چھوڑ دیدہ حکمت پسند کو
 جس کی بہار تو ہو یہ ایسا چمن نہیں
 قابل تری نمود کے یہ انجمن نہیں
 یہ انجمن ہے کشتہ نظارہ مجاز
 مقصد تری نگاہ کا خلوت سرائے راز
 ہر دل مئے خیال کی مستی سے چور ہے
 کچھ اور آجکل کے کلیموں کا طور ہے

گل پژمردہ

کس زباں سے اے گل پژمردہ تجھ کو گل کہوں
 کس طرح تجھ کو تمنائے دل بلبل کہوں ؟
 تھی کبھی موج صبا گہوارہ جذباں ترا
 نام تھا صحن گلستاں میں گل خنداں ترا
 تیرے احساں کا نسیم صبح کو اقرار تھا
 باغ تیرے دم سے گویا طبلۂ عطار تھا

درد عشق

اے درد عشق! ھے گھر آب دار تو
 نا معر موم میں دیکھ نہ ہو آشکار تو!
 پنہاں تہ نقاب تری جلوہ گاہ ھے
 ظاہر پرست معفل نو کی نگاہ ھے
 آلی نئی ہوا چمن ہست و بود میں
 اے درد عشق! اب نہیں لذت نمود میں
 ہاں! خود نمائیوں کی تجھے جستجو نہ ہوا
 منت پذیر نالہ بلبل کا تو نہ ہوا
 خالی شراب عشق سے لالے کا جام ہو
 پانی کی بوند گریۂ شبنم کا نام ہو
 پنہاں درون سینہ کہیں راز ہو ترا
 اشک جگر گداز نہ غماز ہو ترا
 گویا زبان شاعر، نگیں بیاں نہ ہو
 آواز نے میں شکوہ فرقت نہاں نہ ہو
 یہ دور نکتہ چیں ھے کہیں چھپکے بیٹھ رہ
 جس دل میں تو مکیں ھے وہیں چھپکے بیٹھ رہ

صدمہ آجائے ہوا سے گل کی پتی کو اگر
 اشک بن کر میری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر
 دل میں ہو سوز محبت کا وہ چھوٹا سا شرر
 نور سے جس کے ملے راز حقیقت کی خبر
 شاہد قدرت کا آئینہ ہو دل میرا نہ ہو!
 سر میں جز ہمدردی انسان کوئی سودا نہ ہو!
 تو اگر زحمت کش ہنگامہ عالم نہیں
 یہ فضیلت کا نشان اے نیر اعظم نہیں
 اپنے حسن عالم آرا سے جو تو محرم نہیں
 ہمسر یک ذرہ خاک در آدم نہیں
 نور مسجود ملک گرم تماشا ہی رہا
 اور تو منت پذیر صبح فردا ہی رہا
 آرزو نور حقیقت کی ہمارے دل میں ہے
 لیلیٰ ذوق طلب کا گھر اسی محفل میں ہے
 کس قدر لذت کشود عقدہ مشکل میں ہے
 لطف صد حاصل ہماری سعی بیعاصل میں ہے
 درد استفہام سے واقف ترا پہلو نہیں
 جستجوئے راز قدرت کا شناسا تو نہیں

حسن تیرا جب ہوا بام فلک سے جلوہ گر
 آنکھ سے اڑتا ہے یکدم خواب کی مے کا اثر
 نور سے معمور ہو جاتا ہے دامن نظر
 کھولتی ہے چشم ظاہر کو ضیا تیری مگر
 دھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ تماشا چاہے
 چشم باطن جس سے کھل جائے وہ جلو چاہے
 شوق آزادی کے دنیا میں نہ نکلے حوصلے
 زندگی بھر قید زنجیر تعلق میں رہے
 زیر و بالا ایک ہیں تیری نگاہوں کے لئے
 آرزو ہے کچھ اسی چشم تماشا کی مجھے
 آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو
 امتیاز ملت و آئیں سے دل آزاد ہو
 بستہ رنگ خصوصیت نہ ہو میری زباں
 نوع انسان قوم ہو میری 'وطن میرا جہاں
 دیدہ باطن پہ راز نظم قدرت ہو عیاں
 ہوشناسائے فلک شمع تخیل کا دھواں
 عقدہ اضمداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے
 حسن عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے

پچھلے پھر کی کولل وہ صبح کی مژدن
 میں اس کا ہمنوا ہوں ' وہ میری ہمنوا ہو
 کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں
 روزن ہی جھونپڑی کا مجھکو سحر نما ہو
 پھولوں کو آئے جس دم شبِ نیم وضو کرانے
 رونا مرا وضو ہو نالہ مری دعا ہو
 اس خامشی میں جالیں اتنے بلند نالے
 تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو
 ہر درد مند دل کو رونا مرا رلا دے
 بیہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

آفتاب صبح

شورش میخانۂ انساں سے بالاتر ہے تو
 زینت بزم فلک ہو جس سے وہ ساغر ہے تو
 ہو در گوشِ عروس صبح وہ گوہر ہے تو
 جس پہ سیمائے افق نازاں ہو وہ زیور ہے تو
 صفحۂ ایام سے داغِ مداد شبِ مٹا
 آسماں سے نقشِ باطل کی طرح کوکب مٹا

ہو ہاتھ کا سرہانا سبزہ کا ہو بچھونا
 شرمالے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو
 مانوس اسقدر ہو صورت سے میری بلبل
 نغمے سے دل میں اس کے کہتا نہ کچھ مرا ہو
 صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
 ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
 ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
 پانی بھی موج بنکر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
 آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
 پھر پھر کے جہازیوں میں پانی چمک رہا ہو
 پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
 جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
 مہندی لگالے سورج جب شام کی دلہن کو
 سرخی لئے سنہری ہر پہول کی قبا ہو
 راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جسد
 امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
 بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے
 جب آسمان پہ ہر سو بادل گہرا ہوا ہو

انتخاب از بانگ درا

مصنفہ

سر محمد اقبال بیرسٹراٹ لا مرحوم

ایک آرزو

دنیا کی محفلوں سے اکتا کیا ہوں یارب
 کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بچھ گیا ہو
 شورش سے بہاگتا ہوں دل دھونڈھتا ہے میرا
 ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
 مرتا ہوں خامھی پر، یہ آرزو ہے میری
 دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
 آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں
 دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
 لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چھچھوں میں
 چشمے کی شورشوں میں باجا سا بجم رہا ہو
 گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
 ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو

سب تیری زندگی کا روشن ہے مجھ پہ حال
 معلوم خوب ہے ترا ہر عیب ہر کمال
 طفلی ہی سے تو عیش خیالی میں مست تھا
 خواب مسرت ابدی دیکھتا رہا
 منصوبے باندھتا تھا ہزاروں مگر کبھی
 اے نامراد فکر عمل ایک دم نہ کی
 اول تو خواہشیں ہی تری بے شمار تھیں
 اور پھر نکلنے کے لئے سب بیقرار تھیں
 آخر بنی نہ بات طلسم خیال کی
 یعنی فضول تھی طلب امر محال کی
 معلوم کر سکا نہ تو اے بے خبر کبھی
 وہ کون شے ہے جسکی ضرورت ہے واقعی
 مقصد ترے جہان میں آنے سے کچھ تو تھا
 بیصرفہ تو نے عمر گزارے ' ستم کیا
 ہاں کشتہ امید بجا کہ رہا ہے تو
 "اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو"

مرتعش کیوں ہے رگ جاں ' دل کو ہے کیوں اضطراب
 کچھ تو آخر اُس نگاہ ناز کا پیغام ہے
 سرگزشت دل کہوں تو کیا کہوں ' کس سے کہوں
 خستہ ہے ' مظلوم ہے ' افسردہ ہے : ناکام ہے
 میری معویت نہیں ہے پردہ دار راز عشق
 دل میں جسکی یاد ہے لب پر اُسی کا نام ہے
 دل کا ملنا تو کہاں جب آنکھ تک ملتی نہیں
 مجھ سے اُس نا آشنا کا ربط اک الزام ہے
 فتنے برپا کر رہا ہے دمبدم نیرنگ حسن
 اور وحشت مفت کوئے حسن میں بدنام ہے

ساتم آرزو

رحمت خدا کی تجھ پہ ہو ناکام آرزو
 اے خاطر ستمکش ایام آرزو
 اہ اے فریب خوردہ نقش امید اہ
 کیا کیا تری ہوس نے نہ تجھ کو کیا تباہ
 طول امل کے دام میں تو پھنس کے رہ گیا
 افسوس بر نہ آیا کوئی تیرا مدعا

بھانا چشم بد سے اے خدا اُس شمع معفل کو
 نظر پڑتی ہے اُس پر ہر طرف سے اہل معفل کی
 ہمارا نالہ موزوں ہے جس کو شعر کہتے ہیں
 غزل کی شکل میں ہوتی ہے وحشت گفتگو دل کی

کر گزر بے خوف، اگر کرنے کے قابل کام ہے
 رد نہ کر اے دل اسے، ہمت کا یہ پیغام ہے
 ذکر آزادی عبث، ممکن جب آزادی نہیں
 کیوں اسے تڑپائے کوئی جو اسیر دام ہے
 بہر آغاز عمل درکار ہے ہمت کا جوش
 اور تو افسردہ اندیشہ انجام ہے
 کامیابی کے وسائل پر بھی ڈالی ہے نظر؟
 قابل الزام تو خود ہے اگر ناکام ہے
 ظرف جو رکھتے ہیں وہ ہوتے نہیں محتاج ظرف
 کوئی مست شوق ہے اور کوئی مست جام ہے
 رونق صبح جوانی کی عبث ہے اب تلاش
 آمد پیری نہیں ہے، زندگی کی شام ہے

نہ کوئی ہوس ہے نہ ولولہ یہ ہے حال وحشت خستہ کا
 ہے فریب خوردہ آرزو ، وہ بنا ہے دشمن آرزو

یقین نامرادی پر بھی حالت ہے وہی دل کی
 تمہیں سے چاہتا ہوں داد اپنی سعی باطل کی

توجہ کے جو قابل ہو حقیقت کیا مرے دل کی
 تری برق نظر کو جستجو ہے کس کے حاصل کی

کیا ہے مجھ کو بے حس تو نے اے افسردگی دل کی
 نہ غم ہے بعد منزل کا نہ عشرت قرب منزل کی

کہا کس نے تجھے اے شوق پابند ادب ہو جا
 یہی آخر ہوا دل میں تمنا رہ گئی دل کی

تلاطم تھا بہت موجیں بہا کر لی گئیں مجھ کو
 وگرنہ آرزو تھی کس خرد دشمن کو ساحل کی

مری ہستی کی کیا ہستی مگر اے دیدہ بیدش
 ذرا رنگینیاں تو دیکھنا اس نقش باطل کی

قدم اٹھتا ہے بیتابانہ ، نظریں بھی پریشان ہیں
 خبر دیتی ہے خود بیتابی دل قرب منزل کی

مجمع تو خود نظر آتا ہے تو اک خاک کا تودہ
 کراچی کس پہ برق نالہ آتش فشاں تو نے
 تری فریاد نے کہیںچا دل شیخ و برہمن کو
 طلسم تازہ باندھا وحشت جادو بیاں تو نے

تری بزم ناز میں تھا جو دل کبھی شمع روشن آرزو
 ستم زمانہ سے بن گیا وہی آج مدفن آرزو
 مراد دل ازل کا فسرده ہے مجمع شوق سے سروکار کیا
 نہ ہوائے میکدہ ہوس نہ دماغ گلشن آرزو
 وہ امیدیں خاک میں مل گئیں وہ تمام نشہ اتر گیا
 نظر اس نے کی جو عتاب کی ہوئی برق خرمین آرزو
 گئی یک بیک مری خستگی ہوئی دور ساری شکستگی
 کبھی الٹی بھول کے سولے دل جو نسیم گلشن آرزو
 نہ خدنگ ناز نے رخ کیا کبھی جانب دل بینوا
 نہ گل مراد سے پر ہوا کبھی اپنا دامن آرزو
 مجمع یاد آتا ہے اپنا دل کہ بہار جس سے تھی منفعل

وہ نہال تازہ رنگ و بو وہ چراغ روشن آرزو

ستم برپا کیا پھر اے دل نا شاد ماں تو نے
 کہ چھیڑی عہد ماضی کی غم افزا داستان تو نے
 ترمی غفلت پرستی نے رکھا معو طرب تجھکو
 سنی گو بارہا بانگ دراے کارواں تو نے
 ترمی تفریح دم بھر کی ترا سرمایہ عشرت
 نہ پایا بیخبر ذوق نشاط جاوداں تو نے
 نہ سمجھا معنی نفع و ضرر بازار ہستی میں
 ہواے سود میں دیکھا فقط روے زیاں تو نے
 ترمی لائی ہوئی تھی جو بلا ٹوٹی ترے سر پر
 عبث چھیڑا ہے یہ ذکر جفاے آسماں تو نے
 کوئی ہمدرد بھی دیکھا کوئی غمخوار بھی پایا
 سنائی تو سبھوں کو درد و غم کی داستان تو نے
 زبان آفرین خلق سے کچھ کام بھی نکلا
 دکھالیں تو زمانے کو بہت رنگینیاں تو نے
 مصیبت کیا پڑی تجھپر کہ گویا دست و پا تو نے
 دکھائی سخت کمزوری بوقت امتحان تو نے
 نہی ہوگا کہ آلودہ کرے اس خاک اقدس کو
 اگر پیدا کیا شوق سجدہ آستان تو نے

کبھی ہو جو اتنی جرأت کہوں سا قیٰ حسیں سے
 ہوس ایک جام کی ہے ترے دست نازنیں سے
 مری کیا خطا جو واقف نہو تیرا ناز خود ہیں
 کہ مری نیاز مندی ہے عیاں مری جبین سے
 مجمعے رات اُسکی محفل نظر آئی ایک نیرنگ
 چمک اُٹھی زلف شبگون جو تعلیمی جبین سے
 مرے دیدہ ہائے تر کو رہی اک نیاز مندی
 کبھی تیرے استاں سے کبھی میری استیں سے
 خبر شکستگی نہی مرے جام آرزو کی
 وہ صداے حسرت افزا جو اُٹھی دل حزیں سے
 وہ تعلقات باہم وہ حقوق اشنائی
 مرے سر کو نسبتیں ہیں ترے پائے نازنیں سے
 ہے بساط دل مرقع ترے نقش خال و خط کا
 ہے مشام جاں معطر تری زلف عنبریں سے
 یہ ہے دفتر محبت جو رقم ہوا ہے وحشت
 ہے زمانہ مست لذت مرے شعر دل نشیں سے

سر شاخ اشیاء بھی مجھے خوف تھا قفس کا
 نہوئی نصیب دل کو کبھی راحت اشیاء کی
 مجھے ہمنوا نہ دینا کہیں زحمت تکم
 کبھی جالیگی قفس میں نہ حکایت اشیاء کی
 نہ ہوئی خبر جب اُنکے دل غفلت آشنا کو
 وہیں کھل گئی حقیقت مرے نالہ و فغاں کی
 مجھے اب شگفتگی کی ہو قفس میں کیا توقع
 گئی ساتھ اشیاء کے جو تھی بات اشیاء کی
 ہوئی مانع رسائی مری ناتوانی ورنہ
 مجھے کہیں نہ چھٹی رہی ہے کشش اُسکے آستان کی
 کبھی مل تو جائے موقع مجھے شرح آرزو کا
 مرے سر کو حسرتیں ہیں ترے سنگ آستان کی
 ہو رسائی کیا وہاں تک مجھے آسرا بھی ہے
 کہ انہیں کو یاد آئے کبھی اپنے ناتواں کی
 نہیں اہل فن میں وحشت مجھے ایک سے بھی چشمک
 کہ ہے قدر میرے دل میں شعرائے نکتہ دار کی

نہ پروا کی ہماری کارواں نے جب تو پھر ہم بھی
 بچہ-ر کر کارواں سے کیا تلاش کارواں کرتے
 ہم اپنے دیدہ مشتاق ہی سے کام لیتے ہیں
 حجاب آتا ہے اُن سے آرزوں کا بیاں کرتے
 ہمیں بے فائدہ تجدید غم کی کیا ضرورت ہے
 پس از بربادی گلشن جو یاد اشیاں کرتے
 حرم کیا دیر کیا یکساں کشش تھی سارے عالم میں
 خدائی جمع ہوتی خود نمائی تم جہاں کرتے
 کیا موقوف ہم نے قصہ درد نہاں وحشت
 کہاں تک خامہ حسرت رقم کو خونچکاں کرتے

شب و روز ایک حالت ہے مرے دل تپاں کی
 اسے جستجو ہے کس کی اسے فکر ہے کہاں کی
 ہوئیں باعث تردد نہ جفائیں آسماں کی
 ترے غم نے تہنیت دی مجھے عیش جاوداں کی
 انہیں علم ہو چکا ہے مری طاقت و توان کا
 وہ کرینگے خاک پروا مرے نالہ و فغاں کی

ہماری دور بینی ہے ہمارے امن کی دشمن
 نہوتی فکر مستقبل تو عیش جاوداں کرتے
 پتا ملتا نہیں جنس وفا کا اب زمانے میں
 کہیں سے ہاتھ اگر لگتی تو نذر دوستاں کرتے
 حرم میں بھی جب اپنے ساتھ تھی قسمت کی معرومی
 تو ہم کس منہ سے آخر شکوہ جور بتاں کرتے
 نہ تھی منظور ہم کو شمع کی تقلید رسوالی
 کہ محفل میں بیان لذت سوز نہاں کرتے
 ابھی ہیں قوتیں نا آزمودہ حسن و الفت کی
 جو تم کھینچتے تو ہم بھی جذب دل کا امتحاں کرتے
 مزا آتا اگر گزری ہوئی باتوں کا افسانہ
 کہیں سے ہم بیاں کرتے کہیں سے تم بیاں کرتے
 اگر کچھ التفات ناز ہوتا حوصلہ افزا
 تو شرح آرزو ہم داستاں در داستاں کرتے
 قفس میں پرفشانی کا نتیجہ تھا پشیمانی
 بجز آہ و فغاں کیا اور ہم سے ناتواں کرتے
 دل افسردہ کو اپنے جو احساس طرب ہوتا
 تو ہم بھی دو گھڑی سیر بہار بوستاں کرتے

کچھ کام لے سکے نہ کبھی جستجو سے ہم
 شرمندہ ہی رہے ہیں تری آرزو سے ہم
 کچھ اور ہی سبب ہے کہ بیزار گل سے ہیں
 نا آشنا نہیں چمن رنگ و بو سے ہم
 حیرت کی ہے قسم کہ ہیں سرتاسر آئینہ
 ہو کر دو چار اُس بت آئینہ رو سے ہم
 ہر اک بقدر ظرف ہے خواہاں نشاط کا
 مے سے قدح سے جام و سبو اور سبو سے ہم
 یارب ہمیں نصیب نہو لذت خلش
 رسوا کریں جو زخم جگر کو رفو سے ہم
 مطلوب ہے سرور، عبادت کے ذوق میں
 اک دن وضو کریں گے ملے مشکبو سے ہم
 وحشت نہ پوچھ حال پریشانی دماغ
 ہیں ناوک بلا کے ہدف چار سو سے ہم

قفس میں عمر گزری نالہ و آہ و فغاں کرتے
 ہم آخر کس توقع پر خیال اشیاں کرتے

جتنے ادا شناس تم ہو گئے مست بے پیلے
 ساقی بزم ناز کو بادہ گسار دیکھ کر
 وحشت خستہ ہاں سنا مچھکو وہ شمس کی غزل
 رونے لگے وہ زار زار سوے مزار دیکھ کر

تو ہے افریدہ پلے طرب مرے غم سے چشم کو تر نہ کر
 مری خستگی سے حزیں نہو مری بیکسی پہ نظر نہ کر
 نہ اٹھ اے خروش سحر گہی غم نیم شب تو اثر نہ کر
 ہے دل اسکا نازک و بیخبر اے میرے دل کی خبر نہ کر
 ہوس وصال بلا ہے تو تری کاوشوں نے ستم کیا
 تو نہال گلشن یاس ہے عبث آرزوے ثمر نہ کر
 نہیں پائمالی عاشقان بجز اک نظر کا معاملہ
 ترے اختیار کی بات ہے جو کرے یہ کام مگر نہ کر
 ہے تغافل ایک ادا ولے یہ سکھایا کس نے بھلا تجھے
 کہ کسی ستمکش شوق پر کبھی بھول کر بھی نظر نہ کر
 خلش امید ہے جانگزا کوئی کہدے وحشت خستہ سے
 کہ یہ شام شام فراق ہے عبث آرزوے سحر نہ کر



مجسم مہر ہے ' ہر چند مہر اُسکی بلا نمکلی
 تری چشم حیا پرور کہ عالم ہے خراب اُسکا
 ہے ارزاں اسقدر دیدار جاناں ہم نہ مانینگے
 زلیخا کیا سناتی ہے خیال اُسکا ہے خواب اُسکا
 وہ زلف خم بزم کب ہاتھ اٹھاتی ہے مرے سر سے
 گرہ ہو کر رہا ہے میرے دل میں پیچ و تاب اُسکا
 کلام عرفی شیراز ہے تقلید کے قابل
 ہمارے ریختے میں دیکھ لے وحشت جواب اُسکا

اُٹھ نہ سکا قدم مرا خانہ یار دیکھ کر
 رہ گئی چشم آرزو نقش و نگار دیکھ کر
 بزم نشاط سے کبھی مجھ کو بھی تھی مناسبت
 آج ہوئی ہے چشم تر ابر بہار دیکھ کر
 رشک کہاں حسد کسے اور مجھے خوشی ہوئی
 غم میں ترے رقیب کو سینہ فگار دیکھ کر
 حال چمن خزاں میں بھی ایسا کبھی ہوا نہ تھا
 اپنا جو حال ہو گیا رنگ بہار دیکھ کر

کو تہی نصیب نے دور رکھا تو کیا ہوا
 بندہ خانہ زاد ہوں اُس کے قد دراز کا
 شوق ترا ہے موزن ذوق ترا بہانہ جو
 کھول نہ دیں بہرم کہیں پردگیان راز کا
 خاک میں مل گئے ولے اُنکے اُٹھی نہ شرم سے
 ہم سے ہوا نہ حق ادا اُسکی نگاہ ناز کا
 مطرب خلد کیا سنالے وحشت خستہ کیا سنے
 معتقد قدیم ہے زمزمۂ حجاز کا

حریف دیدہ دیدار جو کیا ہو حجاب اُسکا
 نگاہ آشنا ہے مجھکو ہر تار نقاب اُسکا
 غضب ساقی کی بد مستی ' ستم جوش شباب اُسکا
 چہلک پرتا ہے اُسکے ہاتھ سے جام شراب اُسکا
 ہے اَلینہ عرق اَلود ' تھا پاس حجاب اُسکا
 یہ میری سادگی تھی میں نے دھونڈا تھا جواب اُسکا
 ہزاروں اُسکے قدموں پر تے مشتاق گرفتاری
 مرے ہی دل کو چھانٹا دیکھا تو نے انتخاب اُسکا

مبارک ہے یہ شب پی پی کے میخانہ میں اے مستو
 گزارے جو شب آدینہ آدینہ اسی کا ہے
 کدورت سے دل اپنا پاک رکھ اے شاد پیری میں
 کہ جسکو منہ دکھانا ہے یہ آئینہ اسی کا ہے

کلام وحشت

آئینہ خیال تھا عکس پذیر راز کا
 طور شہید ہو گیا جلوہ دلنواز کا
 پایہ بہت کیا بلند اس نے حریم ناز کا
 تا نہ پہنچ سکے غبار رہگزر نیاز کا
 خستگی کلیم نے نکتہ عجب سجھا دیا
 ورنہ حریف میں بھی تھا اس مژہ دراز کا
 دیر ملا تھا راہ میں کعبے کو ہم نکل گئے
 جذبہ شوق میں دماغ کسکو ہو امتیاز کا
 بندگی اور صاحبی اصل میں دونوں ایک ہیں
 جسکا غلام ایاز تھا وہ ہے غلام ایاز کا

مشقت کے سوا کیا مل گیا مشق سخن کر کے
 عدو چاروں طرف پیدا کئے ہم نے یہ فن کر کے
 کہا سب کچھ حریفوں نے ادھر روئے سخن کر کے
 مگر بیٹھے ہیں خاموشی کو ہم قفل دھن کر کے
 قفس میں سوز غم سے میں اگر صیاد مرجاؤں
 آزارنا خاک میری رو بد دیوار چمن کر کے
 ملے آرام شاید شاد دل کو دشت غربت میں
 ارادہ ہے کہ کچھ دن دیکھ لوں ترک وطن کر کے

رہے ہر حال میں جو مطمئن جینا اُسی کا ہے
 پلائے جسکو خود پیرمغان پینا اُسی کا ہے
 یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے معرومی
 جو بڑھکر خود اُٹھالے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے
 جہاں چاہے بشر کو لیکے جالے ہمت عالی
 جسے کہتا ہے زاہد عرش یہ زینہ اُسی کا ہے
 مُکدّر یا مصفا جسکو یہ دونوں ہی یکساں ہوں
 حقیقت میں وہی میخوار ہے پینا اُسی کا ہے

بہت کچھ پاؤں پھیلا کر بھی دیکھا شاد دنیا میں
مگر آخر جگہ ہم نے نہ دو گز کے سوا پائی

آنکھوں سے سدھاری بینائی سننے سے معطل گوش ہوئے
جب ہوش تے تب مدہوش رہے جب ہوش نہیں تب ہوش ہوئے
شب عمر کی گزری ہمبزموگر چپ نہ رہیں کیا منہ سے کہیں
تے شمع صفت اس محفل میں جب صبح ہوئی خاموش ہوئے
غفلت کدہ ہے یہ میخانہ ساقی ہے یہاں کا بے پروا
کیوں شاد تمہیں آئی نہ حیا کیا سوچ کے تم میںدوش ہوئے

ہزاروں آرزوئیں ساتھ ہیں اس پر اکیلی ہے
ہماری روح بے بوجہی ہوئی اب تک پھیلی ہے
اجل بھی تل گئی دیکھی گئی حالت نہ آنکھوں سے
شب غم میں مصیبت سی مصیبت ہم نے جھیلی ہے
عدم کا تھا سفر درپیش ' توشہ جب نہ ہاتھ آیا
بہت سی نا مرادی چلتے چلتے ساتھ لے لی ہے
نہ پوچھو شاد ویرانی کو دل کی کیا بتاؤں میں
تمنا جا چکی حسرت غریب اس میں اکیلی ہے

نقاب اک دن الٹ دینا تھا اس روئے دل آرا کو
 ہم اپنا سا بنا لیتے کبھی تو اہل دنیا کو
 نگاہ شوق مجنوں فرش سے تا عرش جاتی ہے
 کہاں تک پردہء معمل چھپائے روئے لیلیٰ کو
 لباس اہل تقویٰ پر نہیں کچھ منحصر واعظ
 کہیں کیا ہم کہ کس کس بھیس میں دیکھا ہے دنیا کو
 زمانہ چاہتا ہے وزن ہر شے کا برابر ہو
 گھٹنا دیتا ہے اعلیٰ کو بڑھا دیتا ہے ادنیٰ کو
 جو آنکو بے حجاب اے شاد دیکھا چاہتے ہو تم
 جلا دو اور بھی الینڈۂ قلب مصفا کو

نہ چین اس عقل کے ہاتھوں نہ اسالش ذرا پائی
 بشر کے جسم میں اے روح کیوں کیسی سزا پائی
 نہ دیکھے اے چمن دو پھول تجھ میں ایک صورت کے
 جو صورت ملگئی ' ہو باس دونوں کی جدا پائی
 اسی کے پاس بیٹھے سرد سرد آہیں جو بہرتا تھا
 وہیں بستر لگایا جس جگہ تھنڈھی ہوا پائی

نگاہ ناز سے قیمت چکاتے ہم نہیں دل کی
 غرض ہے جس گہری جو کچھ ملے وہ دام لیتے ہیں
 کبھی مضطر کبھی معزوں کبھی وحشی کبھی بیخود
 تعجب ہے ہم ایسے دل سے کیونکر کام لیتے ہیں
 نئے دکھ میں پہنساتا ہے فلک اے شاد یا قسمت
 جو بھولے سے بھی نام راحت و آرام لیتے ہیں

جہاں تک ہو بسر کر زندگی عالی خیالوں میں
 بنا دیتا ہے کامل بیٹھنا صاحب کمالوں میں
 مری آنکھوں سے دیکھو حسن صورت کے علاوہ بھی
 بہت سی خوبیاں ہیں اور بھی صاحب جمالوں میں
 مرے پہلو سے آخر اُٹھ گیا غمخوار گہرا کر
 بہت مشکل ہے اگر بیٹھنا آشفته حالوں میں
 جو آنکھیں ہوں تو چشم غور سے اوراق گل دیکھو
 کسی کے حسن کی شرحیں لکھی ہیں ان رسالوں میں
 خوشا وہ صدر میں جنکو جگہ وہ شاہ خوباں دے
 ہمارا ذکر کیا اے شاد ہم ہیں خستہ حالوں میں

کس خوشی سے تہنیت دیدیکے یوں کہتا ہے دل
وصل کی شب ہے مبارک دوست کو پہلوے دوست
شاد اہل شک یونہی شک میں پڑے رہجالیں گے
ہم انہیں آنکھوں سے اک دن دیکھ لیں گے روے دوست

ناز کرشمہ ساز کیوں غمزہ دلفناز کیوں
سب تو ہیں تیرے مبتلا اس پہ یہ امتیاز کیوں
قامت فتنہ خیز کو خواہش حشر کس لئے
بازی نو کی فکر میں نرگس نیم باز کیوں
اسکے اُجارتے کی فکر خود ہمیں مدتوں سے تھی
دل کا مرے عدو ہوا نالہ جانگداز کیوں
شاد سخن کی جان ہے بادہ و نغمہ و سرود
آپ تو شعر کہتے ہیں آپ کو احتراز کیوں

انہیں دیکھو کہ اب تک غفلتوں سے کام لیتے ہیں
ہمیں دیکھو کہ بے دیکھے انہیں کا نام لیتے ہیں
کہا دل نے مرے ہنسکر جو نقد داغ ہاتھ آیا
ادھر ہم کام کرتے ہیں ادھر انعام لیتے ہیں

بچا دل کو نہ غافل آتش مہر و محبت سے
 جبھی تک ہے فروغ اس سوز سے جبتک ہے ساز اسکا
 کریں دیندار مے کی حلت و حرمت پہ تقریریں
 مجھے تو ملگیا ساقي سے فتوے جواز اسکا
 نہ چھوڑے جستجوے یار خضر شوق سے کھدو
 کسی دن خود لگا لیکگی پتا عمر دراز اسکا
 کہاں یہ تاب و طاقت ہے کہ ہم قفل دھن کھولیں
 خزانہ کی طرح دل میں لئے بیٹھے ہیں راز اسکا

معسو ہیں اپنی جگہ اسودگان کوے دوست
 آرزو دل میں ہے دل آنکھوں میں آنکھیں سوے دوست
 نکلے آتے ہیں زمیں سے پھول کس کس رنگ کے
 شعبدے دکھلا رہی ہے فرگس جادوے دوست
 کس کی قدرت کون سمجھے ان اشاروں کو بہلا
 خلوت اُسرار دل ہے گوشۂ ابروے دوست
 دھر میں کیا کیا ہوئے ہیں انقلابات عظیم
 آسمان بدلا زمیں بدلی نہ بدلی خوے دوست

شاد صد شکر کٹی عمر مگر آج تلک
طرز یاران طریقت نہ فراموش رہا

محببت میں نہ کیوں جی سے گزرتا
مثل سچ ہے کہ مرتا کیا نہ کرتا
تڑپتا گر نہ زیر تیغ بسمل
لہو سے کیوں کسی کا ہاتھ بھرتا
مزا کیا ہے حباب اس زندگی کا
کہ تو دم بھر کسی کا دم تو بھرتا
غضب گھرا تھا بحر عشق اے شاد
جو دوبا اس میں پھر کیونکر ابھرتا

رہے دل بستگی غم سے بڑھے سوز و گداز اسکا
گرہ کھل جائیگی دل کی تو کھل جائیگا راز اسکا
زمانہ چاہئے دل کو کہ حاصل ہو نیاز اسکا
بہت دیر آشنا ہے اے جبین شوق ناز اسکا
کہاں ہے اسکا کوچہ کون ہے وہ کیا خبر قاصد
پر اتنا جانتا ہوں نام ہے عاشق نواز اسکا

تابوت پہ میرے آلے جو وہ مٹی میں ملایا یوں کہہ کر
 پھیلا دیئے دست و پا تو نے اتنے ہی میں بس جی چھوٹ گیا
 نازک تھا بہت ہی دل میرا اے شاد تحمل ہو نہ سکا
 اک تھیس لگی تھی یوں ہی سی کیا جلد یہ شیشہ توڑ گیا

آدمی لذت فانی سے ہم آغوش رہا
 ہوش رکھتا تھا پر افسوس کہ بے ہوش رہا
 مدت العمر پہ مُشتاق نگاہیں جو ملیں
 میں جدا یار جدا بزم میں مدہوش رہا
 درد و صافی کا لحاظ آفت جاں تھا ساقی
 واے ان بادہ کشوں پر جنہیں یہ ہوش رہا
 لڑکھڑا کر جو گرا پاؤں پہ ساقی کے گرا
 اپنی مستی کے تصدق یہ مجھے ہوش رہا
 آخری جام میں کیا بات تھی ایسی ساقی
 ہو گیا پیسے جو خاموش وہ خاموش رہا
 صدقے اس بزم مقدس کے جہاں راتوں کو
 ذکر بدمستی یاران قدح نوش رہا

موج فنا مٹا نہ دے نام و نشان وجود کا
 دیکھ حباب کی طرح شوق نکر نمود کا
 ناز کر اے جبیں شوق طالع ارجمند پر
 سنگ در نیاز پر نقش رہا سجود کا
 اب تو امید ہے نہ یاس جی میں ہراس ہے نہ شوق
 دل نے خیال اٹھا دیا اپنے زیاں و سود کا

دے کے تھی سبو مجھے صبر کا حوصلہ دیا
 جسکی طلب تھی ساقیا اُس سے کہیں سوا دیا
 کچھ نہ کہلا کہ ہے پسند کیوں اُسے بے تعلقی
 جس نے تعلقات میں دل کو مرے پھنسا دیا
 درد شب فراق کا میں نہ اٹھا سکا مزا
 تو نے تھپک کے اے اجل جلد مجھے سلا دیا
 اب نہ پلٹ کے اُلٹگی عمر عزیز شاد حیف
 دولت لازوال تھی تو نے جسے گنوا دیا

نالوں کی کشاکش سہم نہ سکا خود تار نفس بھی ٹوٹ گیا
 اک عمر سے تھی تسک حیف جسے کل شب کو وہ قید دی چھوٹ گیا

کودے غواص و آشنا سارے
 تا بمقدور دست و پا مارے
 کہینچ کے کوفت سب ہوے بیتاب
 نہ لگا ہاتھ وہ دُرِ نایاب
 جا ہم آغوشِ مردہ یار ہوئی
 تہ میں دریا کے ہمکنار ہوئی

انتخاب از کلام شاد عظیم آبادی

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا
 زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا، میں باز آیا
 یاد نے اُس نگہ ناز کی ماری برجھی
 پاس اپنے جو نیا کوئی فسوں ساز آیا
 دل جو گہبرائے قفس میں تو ذرا پر کھولوں
 زور اتنا بھی نہ اے حسرت پرواز آیا
 بے انیس اب چمن نظم ہے ویراں اے شاد
 اب تک ایسا نہ کوئی زمزمہ پرداز آیا

لہجہ کیا لطمہ کسکو کہتے ہیں
 گھر میں ہم نام سنتے رہتے ہیں
 مگر میں گرچہ دایہ تھی کامل
 لیک تہ سے سخن کے تھی غافل
 یہ نہ سمجھی کہ ہے فریب عشق
 ہے یہ مہ پارہ نا شکیب عشق
 بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف
 یاں ہوا تھا وہ ماجراے شگرف
 یاں وہ بیٹھا حباب کے مانند
 پھر نہ تھا وہ سراب کے مانند
 سنتے ہی یہ کہاں کہاں کر کر
 گر پڑی قصد ترک جاں کر کر
 موج ہریک کمند شوق تھی آہ
 لپٹی اسکو برنگ مار سیاہ
 دام گستر وہ عشق تھا تہ آب
 جس کے حلقے تمام تھے گرداب
 کشش عشق آخر اس مہ کو
 لیگلی کہینچتے ہوئے تہ کو

جَذْب سے اپنے جب کرے ھے کام
 عاشقِ مردہ سے بھی لے ھے کام
 صبح گاہاں وہ غیرتِ خورشید
 اس جگہ سے رواں ہوئی نومید
 پہونچے نصفِ النہار دریا پر
 روئی بے اختیار دریا پر
 حد سے افزوں جو بیقرار ہوئی
 دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی
 حرفِ زن یوں ہوئی کہ اے دایہ
 یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ
 موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش
 تھا تلاطم سے کس طرف ہمدوش
 تجھ کو آیا نظر کہاں آکر
 پھر جو دوبا تو کس جگہ جا کر
 مجھ کو دیجو نشان اس جا کا
 میں بھی دیکھوں خروشِ دریا کا
 ہوں میں نا آشناے سیرِ آب
 نا شناساے موجہ و گرداب

گاہ باشد کہ دل مرا وا ہو
 ورنہ کیا جائے کہ پھر کیا ہو
 دایہ بولی کہ اے سراپا ناز
 حسن کا درپہ تیرے روئے نیاز
 ابتو میں فتنے کو سلایا آئی
 اس بلا کے تئیں بٹھایا آئی
 کون مانع ہے گھر کے چلنے کا
 سد رہ کون ہے نکلنے کا
 ہو معافے میں دل خوشی سے سوار
 شاد شاداں کر اب سے تو گزار
 دل سے اپنے پدر کے غم کم کر
 مادر مہرباں کو خرم کر
 کر ملاقات ہمدموں سے تو
 گرم بازی ہو معرموں سے تو
 یہ نہ سوچی کہ بد بلا ہے عشق
 گہات میں اپنی لگ رہا ہے عشق
 جس کسو سے یہ پیار رکھتا ہے
 عاقبت اس کو مار رکھتا ہے

تہ جو ہنگامے اسکے حد سے زیاد
 ساتھ اُسکے گئے وہ شور و فساد
 شور فتنے تہ اُس تلک سارے
 ابتو بدنامیاں نہیں بارے
 دل ترپتا ھے متصل میرا
 مرغ بسمل ھے اب تو دل میرا
 وحشت طبع ابتو افزوں ھے
 حال جی کا مرے دگر گوں ھے
 بیدماغی کمال ہوتی ھے
 جان تن کی وبال ہوتی ھے
 دل گولی دم کو خون ہوے گا
 آج کل میں جنون ہوے گا
 بیکلی جی کو تاب دیتی ھے
 طاقت دل جواب دیتی ھے
 جی میں آتا ھے ہوں بیابانی
 پر کہوں ہوں کہ ھے یہ نادانی
 مصلحت ھے کہ مجھکو لیچل گھر
 ایک دو دم رھینگے دریا پر

دایہ ہیلہ گر ہوئی دلشاد
 واں سے کشتی چلی برنگ باد
 خار خار دلی سے فارغ ہو
 لیگئی پار اس گل نو کو
 یہ نہ سمجھی کہ عشق آفت ہے
 فتنہ سازی میں اک قیامت ہے
 خاک ہو کیوں نہ عاشق بیدل
 کام سے اپنے یہ نہیں غافل
 وصل جیتے نہو میسر اگر
 لاوے معشوق کو یہ تربت پر
 یاں سے عاشق اگر گئے ناشاد
 خاک خوباں بھی ان نے کی برباد
 قصہ کوتاہ بعد یک ہفتہ
 آئی وہ رشک مہ ز خود رفتہ
 کہنے لگی کہ اب تو اے دایہ
 ہو گیا غرق وہ فرو مایہ
 اب تو وہ ننگ درمیاں سے گیا
 آرزومند اس جہاں سے کیا

جی اگر تھا عزیز اے ناکام
 کیوں عبث عشق کو کیا بدنام
 سن کے یہ حرف دایۂ مکار
 دل سے اس کے گیا شکیب و قرار
 بے خبر کار عشق کی تہ سے
 جست کی اُن نے اپنی جاگہ سے
 تھا سفینے میں یا کہ دریا میں
 موج زنجیر ہو گئی پا میں
 کہنچ گیا قعر گویا گوہر ناب
 تہی کشش عشق کی مگر تہ آب
 کہتے ہیں دوبتے اچھلتے ہیں
 دوبے ایسے کہیں نکلتے ہیں
 دوبے جویاں کہیں وہ جا نکلے
 غرق دریاے عشق کیا نکلے
 عشق نے آہ کہو دیا اس کو
 آخر آخر دبو دیا اس کو
 جبکہ دریا میں دوب کر وہ جوان
 کہو گیا گوہر گرامی جان

اس سفینے میں جلد جا پہونچا
 یہ بھی واں ساتھ ہی لگا پہونچا
 بیچ دریا کے دایہ نے جا کر
 کفش اس گل کی اسکو دکھلا کر
 پھینکی پانی کی سطح پر ایکبار
 اور بولی کہ او جگر افگار
 حیف تیری نگار کی پاپوش
 موج دریا سے ہووے ہم آغوش
 غیرت عشق ہے تو لا اُس کو
 چہر مت یوں برہنہ پا اس کو
 اُس طرف اب کے اوترنا ہے
 اس نواحی کی سیر کرنا ہے
 پانوں اُسکے جو ہیں نگار اُلود
 ظلم ہے ہوویں گر غبار اُلود
 جس کف پا کو رنگ گل ہو بار
 منصفی ہے کہ خار سے ہونگار
 یہ روا ہے تو اپنے حال پہ رو
 مفت ناموس عشق کو مت کہو

دیکر اسکو فریب ساتھ لیا

دل عاشق کو اپنے ہاتھ لیا

لیک درپردہ آن نے یہ تھانی

کیجئے اس سے خصمی جانی

یہ تو دل تفتہٴ محبت تھا

سخت وارفٹہٴ محبت تھا

وقت نزدیک تھا جو آپہونچا

تا سر آب پا بپا پہونچا

آب کیا تھا کہ بحر تھا ذخار

تند و مواج و تیرہ و تہ دار

موج کا ہر کنایہ طوفان پر

مارے چشمک حباب عماں پر

ہمکنار بلا ہراک گرداب

لجہ سرمایہ بخش تیرہ سحاب

کشتی اک آن کر ہوئی موجود

ہو فلک سے ہلال جیسے نمود

کی کنارے پہ لائے استادہ

تھا معافہ رکوب آمادہ

بستر خواب پر تجھے آرام
 مجھ کو خمیازہ کہیں چہ سے ہے کام
 اب تغافل نہ کر تلطف کر
 حال پر میرے تک تاسف کر
 گوش زد دایہ کے ہوئے یہ سخن
 تھی وہ استاد کار حیلہ و فن
 پاس اُس کو بلا تسلی کی
 وعدہ وصل سے تشفی دی
 گئے ستم دیدہ غم دوری
 ہو چکا اب زمان مہجوری
 زار نالی نہ کر شکیبا ہو
 عشق کا راز تا نہ رسوا ہو
 سخت دل تنگ تھی یہ غیرت ماہ
 قطع تجھ بن نہو سکے تھی راہ
 گرچہ یہ حسن اتفاق سے ہے
 اُسکی بھی جذب اشتیاق سے ہے
 تیرے آنے سے دل کشادہ ہوا
 تشنہ دوستی زیادہ ہوا

اضطراب دلی نے زور کیا
ان نے بے اختیار شور کیا
دل کے غم کو زبان پر لایا
آفت تازہ جان پر لایا
گائے جفا پیشہ و تغافل کیش
اک نظر سے زیان نہیں کچھم بیش
منہم چھپایا ہے تو نے اسپر بھی
نگہ التفات ایدھر بھی
صبر کس کس بلا سے کر گزروں
چارہ اس بن نہیں کہ مر گزروں
ہے تو نزدیک دل سے اے طنناز
ایک تجھ تک سفر ہے دور دراز
ناز نے یک نفس نہ رخصت دی
آئینے نے تجھے نہ فرصت دی
تو تو وان زلف کو بنایا کی
جان یاں پیچ و تاب کھایا کی
تجھ کو مدّ نظر تھی اپنی چال
میں ستمکش ہوا کیا پامال

گھر سے باہر معافہ جب نکلا
 اس جواں پاس ہو کے تب نکلا
 طیش دل سے ہو کے یہ آگاہ
 ہولیا ساتھ اس کے بھر کر آہ
 واں کے رھنے سے اسکو کام نہ تھا
 وہ گلی اسکا کچھ مقام نہ تھا
 جس سے جی کو کمال ہو الفت
 جس سے دل کی درست ہو نسبت
 جنبش اسکی پلک کو گر واں ہو
 دل میں یاں کاوش نمایاں ہو
 واں اگر پاؤں میں لگے ھے خار
 دل سے یاں سر نکالے ھے یکبار
 دست افشاں وہ پائے کوباں یہ
 تھا معافے کے ساتھ گرم رہ
 ہر قدم تھا زبان پر جاری
 خواب ھے یہ کہ ھے یہ بیداری
 ہمسری اس کی تھی میسر کب
 ھے مجمعِ بخت واژگون سے عجب

دیکھ کر اسکو بیخور و بیخواب
 جانا ہر اک نے عاشق بیتاب
 منہ پر اس کے جو رنگ خون نہیں
 عشق ہے اسکو یہ جنون نہیں
 ہے نگہ اسکی جس طرف مائل
 اس طرف ہی گیا ہے اسکا دل
 جب ہوا ذکر اقل و اکثر میں
 چاہ ثابت ہوئی اسی گھر میں
 عشق بے پردہ جب فسانہ ہوا
 مضطرب کد خدائے خانہ ہوا
 گھر میں جا بہر دفع رسوائی
 بیٹھ کر مشورت یہ تہرائی
 یاں سے یہ غیرت مہ تاباں
 جا کے چندے کہیں رہے پنہاں
 شبِ محافے میں اسکو کر کے سوار
 ساتھ دی ایک دایۂ غدار
 گھر تھا اک آشنا کا مدّ نگاہ
 واں ہو روپوش تا یہ غیرت ماہ

سنگباران سے سخت ہوں دلتنگ
 شیشہ دل نہیں ہے پارہ سنگ
 معصوم یک نگاہ بیش نہیں
 کم ہے سینے میں جا کہ ریش نہیں
 کیونکہ کہئے کہ تو نہیں آگاہ
 اک قیامت بپا ہے یاں سرِ راہ
 کچھ چھپا تو نہیں رہا یہ راز
 اک جہاں اس سے ہے خبر پرداز
 بس تغافل ہوا ترحم کر
 کوش دل جانب تظلم کر
 کون کہتا ہے رہ نہ معوناز
 پر نہ اتنا کہ جس سے جائے نیاز
 اُن بلاؤں پہ اُن نے صبر کیا
 اختیار اپنے جی پہ جبر کیا
 اس طرف کا نہ دیکھنا چہرہ
 اس کے اندوہ سے نہ ملہم موزا
 اور یہ ماجرا ہوا مشہور
 شور رسوائیوں کا پہونچا دور

نام کو بھی ترے نجانا آہ
 تجھ سے کیونکر سخن کی نکلے راہ
 نامیدانہ کر کروں ہوں نگاہ
 دیکھتا ہوں ہزار روز سیاہ
 سخت مشکل ہے سخت ہے بیداد
 ایک میں خوں گرفتہ سو جلاں
 کوئی مُشفق نہیں کہ ہووے شفیق
 بیگسی بن نہیں ہے کوئی رفیق
 نالہ ہوتا ہے کہ کہے دل جو
 گریہ آنسو سے پونچھتا ہے کبھو
 آہ جو ہمدمی سی کرتی ہے
 ابتو وہ بھی کمی سی کرتی ہے
 چشم رکھتا ہے وصل کی یہ دل
 جی ہے اس سے اسیر آب و گل
 ورنہ ترکیب یہ کہاں ہوتی
 صورت اک معنی نہاں ہوتی
 اب ٹھہرتا نہیں ہے پائے ثبات
 ایک میں اور کتنے تصدیعات

معوتھا اُس کے یہ خیال کے بیچ
 تھا گرفتار اپنے حال کے بیچ
 ایکدم آہ سرد بھر اوٹھنا
 فالہ گرم گاہ کر اوٹھنا
 جی میں کہتا کہ آہ مشکل ہے
 اس طرف یک نگاہ مشکل ہے
 دوست کو میرے نام سے ہے ننگی
 دشمنوں سے ہے جی پہ عرصہ تنگی
 چشم تر سے لہو بہا کرتا
 صبح کے باد سے کہا کرتا
 گلے نسیم سحر یہ اُس سے کہہ
 مست تغافل کر اور عاقل رہ
 اُن بلاؤں میں کوئی کیونکہ جیے
 جان پر ابنی ہے تیرے لیے
 جان دوں تیرے واسطے سو تو
 اُنکھ اُٹھا کر ادھر ندیمے کبھو
 رفتہ رفتہ ہوا ہوں سوداگی
 دور پہونچتی ہے میری رسوائی

کیا گنہ تھا کہ یہ جواں مارا
 کن نے مارا اُسے کہاں مارا
 ہووے یہ خون خفتہ گر بیدار
 کہینچنی ہووے خفت بسیار
 کیجئے ایک دہب سے اسکو تنگی
 تا نہ عاید ہو اپنی جانب تنگی
 تہمت خط رکھئے اُسکے سر
 کیجئے سنگسار اُس کو پھر
 دیکے دیوانہ اُس جواں کو قرار
 ہو گئے سارے دریئے ازار
 ایک نے سخت کہے تنگی کیا
 ایک نے اُکے زیر سنی کیا
 ایک آیا تو ہاتھ میں شمشیر
 ایک بولا کہ اب ھ کیا تاخیر
 کی اشارت کہ کودکان شہر
 اُلے لبریز غصہ و پر قہر
 گرچہ ہنگامہ اُسکے سر پر تھا
 لیک روے دل اُسکا اودھر تھا



بستر خاک پر گرا وہ زار
 درد کا گھر ہوا دل بیمار
 جا کے اُس کے قریب در بیٹھا
 قصد مرنے کا اپنے کر بیٹھا
 دل نہ سمجھا کہ اضطراب کیا
 شوق نے کام کو خراب کیا
 جو کہ سمجھے تھے اُسکو دیوانہ
 رحم کرتے تھے اُشایانہ
 عاشق اُسکو کسو کا جان گئے
 سب برا اس ادا سے مان گئے
 کیونکہ باہم معاش تھی سبکی
 ایک جا بود و باش تھی سبکی
 وارث اُسکے بھی بدگمان ہوئے
 درپئے دشمنی جان ہوئے
 مہورت تھی کہ مار ہی ڈالیں
 دفعۃً اُس بلا کے تئیں ڈالیں
 پھر یہ ٹھہری کہ ہونگے ہم بدنام
 سنکے آخر کہیں گے خاص و عام

پڙگئي اُس پر اک نظر اُسکي

پهر نه آئي اُس خبر اُسکي

تھي نظر يا ڪه جي ڪي آفت تھي

وہ نظر بهي وداع طاقت تھي

هوش جاتا رها نگاه ڪے ساٿھ

مٻر رخصت هوا اک آہ ڪے ساٿھ

بيقراراري ۽ ڪم ادائي ڪي

تاب و طاقت ۽ بيوفائي ڪي

منھ جو اُسڪا طرف ۽ اُسڪے پھرا

مضطرب هوڪے خاڪ پر يہ گرا

جهاز دامن ڪے تئس وہ مہ پارہ

اُٿم گئي سامڻي ۽ يڪبارہ

وہ گئي اُس ڪے سر بلا آئي

خاڪ ميں مل گئي وہ رعنائي

هاٿھ جانے لگا ڪريبارن تڪ

چاڪ پھيلائے پانڻون دامن تڪ

طبع ۽ اک جنون ڪيا پيدا

اشڪ ۽ رنگ خون ڪيا پيدا

سر میں تھا شوق شوق دل میں تھا
 عشق ہی اُسکے اب و گل میں تھا
 الغرض وہ جوان خوش اسلوب
 نا شکبہا رہا تھا بے محبوب
 ایک دن بیٹکی سے کہہ برایا
 سیر کرنے کو باغ میں آیا
 کسو گل پاس وہ صنم ٹھہرا
 کہیں سبزے میں ایکدم ٹھہرا
 اک خیابان میں سے ہو نکلا
 ایک سائے تلے سے رو نکلا
 نہ تسلی ہوا دل بیتاب
 نہ تہما چشم تر سے خون تاب
 دیکھ گلشن کو نا امیدانہ
 منہم کیا اُن نے جانب خانہ
 ناگہ اک کوچہ سے گذار ہوا
 آفت تازہ سے دو چار ہوا
 ایک غرفے سے ایک مہ پارہ
 تہی طرف اُس کے گرم نظارہ

آغاز قصہ جانگداز

ایک جا اک جوان رعنا تھا
 لالہ رخسار سرو بالا تھا
 عشق رکھتا تھا اُسکی چہاتی گرم
 دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
 شوق تھا اسکو صورت خوش سے
 اُنس رکھتا تھا وضع دلکش سے
 تھا طرحدار آپ بھی لیکن
 رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن
 کوئی ترکیب اگر نظر آتی
 صورت حال اور ہوجاتی
 دیکھتا گر وہ کوئی خوش پرکار
 رہتا خمیازہ کش ہی لیل و نہار
 زلف ہوتی کسوی گر برہم
 دیکھتے اس کے حال کو درہم
 دیکھتا گر کہیں وہ چشم سیاہ
 دل سے بے اختیار کرتا آہ

منتخب از کلیات میر



مثنوی دریاۓ عشق

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال
 ہر جگہ اسکی اک نئی ہے چال
 دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا
 کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
 کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا
 کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
 کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا
 کہیں موجب شکستہ رنگی کا
 طور پر جا کے شعلہ پیشہ رہا
 بستیوں میں شرار تیشہ رہا
 کہیں بھیون ہے اہل ماتم کا
 کہیں نوحہ ہے جان پر غم کا

هنگامه معشر کي بهي ڪجهه تجکو خبر ه
دوزخ ترا مسکن ه تو جنت مرا گهر ه
کيا غم ه جو لاشه په نه بهالي نه پسر ه
زانوے مبارک په علي کے مرا سر ه

توقير شهيدون ميں مجھے آج مليکي
جب نيزے په سر هوگا تو معراج مليکي

غش هوکيا يه کهکے جو حر جگر افگار
سر کاٹ لو اس کا يه پکارا وه ستمگار
جلاد بتره تيم که هوا شور يه اکبار
بهاگو که حسين آئے هيں کهينچے هوئے تلوار

آٿهنے کي نهين ضرب ولي ابن ولي کي
ديکھو کهيں بجلي نه گرے تيغ علي کي

آمد جو سني شير کي پسپا هوے روباہ
لاشه په کيا راحت جان اسد الله
ريتي په ترپتا تھا وه حضرت کا هوا خواہ
مہماں سے لپٹ کر يه پکارے شه ذيباہ

ٽڪرے هيں بدن زخم عجب کھائے هيں بهالي
لے هوش ميں لاش په هم آئے هيں بهالي



گردن کو اوٹھا کر یہ پکارا حر دیندار
کیا ہرزہ درائی ہے یہ او ظالم غدار
پاس آئے سخن کر تو سنوں میں تری گفتار
زخمی ہوں مگر ہاتھ سے چھوٹی نہیں تلوار

بڑھتا نہیں یہ خوف و خطر طاری ہے تجھ پر
مرتا ہوں یہ مردہ بھی بہت بہاری ہے تجھ پر
رتبہ جو ملا ہے مجھے تو کیا اُسے جانے
خود کور ہے آنکھیں تجھے کب دی ہیں خدا نے
گھیرا ہے مجھے رحمت رب دوسرا نے
پہلو میں معتمد ہیں ید اللہ سرہانے

سرعرش پہ اُنکا ہے جو رتبے میں بڑے ہیں
ہدیے لئے ہاتھوں میں ملک گرد کھڑے ہیں
مجھسا بھی زمانے میں کوئی ہوتا ہے دانا
اک جو کے برابر تری دنیا کو نہ مانا
نعمت کے مزے دے گیا یہ برچھیاں کھانا
صدقے ہوا اُس پر کہ نبی جس کے ہیں نانا

بینا ہے تو خلعت کو نہ انعام کو دیکھے
عقل او سے کہتے ہیں جو انجام کو دیکھے

پیاسا ہو تو پانی تجھے کوثر کا پلا لیں
 بہو کا ہے تو فردوس کے میوے ابھی آئیں
 مشتاق ہو کر اونکا تو حوروں کو بلا لیں
 جو باغ تجھے حق نے دیا ہے وہ دکھالیں
 یہ ہاتھ کہیں بند نہیں عقدہ کشا ہیں
 جس درد کا درمان نہیں ہم اُسکی دوا ہیں
 اعدا نے اُدھر فتح کے باجے جو بجالے
 نکلا پسر سعد لعین چتر لگالے
 یہ دور سے ہر کو سخن طغز سنالے
 کیوں ترک رفاقت کے مزے خوب اُٹھالے
 اس وقت کوئی آ کے حمایت نہیں کرتا
 جاہل بھی کوئی ایسی حمایت نہیں کرتا
 افسوس صد افسوس عبث جان گنوا لیں
 اب رونے کو لاشے پہ نہ بیٹا ہے نہ بہا لیں
 بتلا مجھے وہ کونسی دولت ہے جو پالی
 مہمانی میں تلوار پہ تلوار تو کھالی
 ہاں مرتبہ اوسوقت شہیدوں میں بڑھیکا
 جب نوک سناں پر ترا سرکٹ کے چڑھیکا

جب تک کہ جرمی پاؤں رکابوں سے نکالے
 مہمان کے سینے پہ کئی چل گئے بھالے
 خود سنبھلے کہ گرتے ہوئے گھوڑے کو سنبھالے
 مرکب سے جو کودا تو بڑھے برچھیوں والے

دیکھا جو فرس نے مرا مالک نہیں زیں پر
 اللہ ری وفا مر گیا گرتے ہی زمیں پر

روتا تھا وفاداری مرکب پہ یہ صفدر
 جو فرق پہ پیچھے سے پڑا گرز گراں سر
 حضرت کو پکارا وہ جرمی خاک اوزا کر
 مہمان کی خبر لیجئے یا سبط پیمبر

خادم نہیں بھائی نہیں پیارا نہیں میرا
 مولا کے سوا کوئی سہارا نہیں میرا

آواز علی اُلی کہ اے حر دلاور
 تیار ہے فردوس معلیٰ میں تیرا گھر
 بالیں پہ ترے میں تو ہوں شپیر نہیں گر
 سر رکھ لے کہ زانو مرا حاضر ہے برادر

میں پاس ہوں پھر کس لئے گھبراتا ہے بھائی
 روتا ہوا صاحب بھی ترا آتا ہے بھائی

کہہ کر یہ سخن قلب میں لشکر کے در آیا
 سمٹا ہوا لشکر تہ و بالا نظر آیا
 رھوار تڑپ کر ادھر آیا اودھر آیا
 مضطر ہوئے سب ایک نہ صفدر سے بر آیا
 باندھے تھے کمر شمر و عمر خیرہ سری پر
 بوچھاڑ ہوئی دور سے تیروں کی جری پر
 پیہم جو لگے تیر فرس بن گیا طاؤس
 دم بھر میں لہو ہو گیا جرار کا ملبوس
 سینہ ہے کہ تودا ہے نہ ہوتا تھا یہ محسوس
 غش آنے لگے شیر ہوا جنگ سے مایوس
 رخ زرد تھا گلزار تھی پوشاک لہو سے
 فوارہ خوں چھوٹتے تھے ہر بن مو سے
 اس حال میں بھی رکتی نہ تھی شیر کی تلوار
 جو آگیا زد پر او سے بھیجا طرف نار
 پے کر دیا گھوڑے کو جفا کاروں نے اکبار
 معجروح سے اب کیا ہو فرس ہو گیا بیکار
 جب وقت برابر ہوا پھر ٹل نہیں سکتا
 گھوڑے کا اشارا تھا کہ اب چل نہیں سکتا

آواز یہ دی کرنے کہ اے ظالم غدار
غیرت ہے تو آسامنے تو چہیز کے رھوار
بتلا انہیں انداز و غا کہینچ کے تلوار
کیوں صورت رو باہ دہکتا ہے جفاکار
تو دشمن لغت جگر شیر خدا ہے
اُس صف سے نکل کر جو ادھر آ تو مزا ہے

بندہ ہوں میں انکا کہ جو شیرو نسے لڑے ہیں
پتھر پہ نشان دین کے لشکر کے گڑے ہیں
لوہے کو وہ مانے ہیں بہادر جو بڑے ہیں
سکے اسد اللہ کی ضربت کے پڑے ہیں

شمشیر شہ قلعہ شکن ہے اسی گھر میں
اُس ضرب کے سکے کا چلن ہے اسی گھر میں

وہ قلب ہے جس قلب میں بغض اُنکا بہرا ہے
ٹکسال سے باہر ہے سقی دوسرا ہے
ہر طرح پرکھ لیگا جسے فہم ذرا ہے
کھوٹا ہے سو کھوٹا ہے کھرا ہے سو کھرا ہے

بازار کے دن کوئی نہ فریاد سنے کا
وہ سامنے مالک کے جہنم میں بہنے کا

رہوار کی وہ چال وہ تلوار کا چلنا
بھاگتے وہ پیادوں کی صفوں کا وہ کچلنا
غصے میں وہ شدید کی آنکھوں کا ابلنا
کف منہ سے گرا کر وہ کنوٹی کا بدلنا

مارا تھا قدم اوسنے شجاعت کے چلن پر
یوں گھوڑے پہ جاتا تھا اسد جیسے ہرن پر

لڑنے میں سمجھتا تھا فرس دل کا اشارا
رہوار نے کچلا اوسے حرنے جسے مارا
وہ جست وہ چھل بل وہ دپٹ اور وہ طرارا
مڑنے میں نظر شوخ کی اور نے میں چکارا

ایسا تو سبک رو فرس برق سفر ہو
پتلی پہ ہو پتلی تو نہ آنکھوں کو خبر ہو

کہانے لگی گھونگھٹ جو سپاہ ستم آرا
بڑھ کر عمر سعد جوانوں کو پکارا
جاتے ہو کہاں چھوڑ کے دریا کا کنارا
گھیرو اسے نیزوں میں یہ دشمن ہے ہمارا

دولا کہم جواں ایک کا سر لا نہیں سکتے
ہاں نیزے امگاڑ جو قریں جا نہیں سکتے

جو دشمن دین تھا اُسے پہچانتی تھی وہ
 مغفر کو حباب لب جو جانتی تھی وہ
 چار ائینہ و خود کو کب مانتی تھی وہ
 ہر وار میں جوشن کا جگر چھانتی تھی وہ
 اژدر تھا کہ تلوار تھی دم تھا کہ ستم تھا
 تابیں تھیں کہ گھر موت کا پانی تھا کہ سم تھا
 بے حال عدو ہول کے مارے نظر آئے
 جو کہاں پہ تھے گور کنارے نظر آئے
 جب سن سے چلی صاف شرارے نظر آئے
 جوہر کبھی چمکے تو ستارے نظر آئے
 اُس تیغ کا پھل کھا کے عدو خوں میں تپاں تھے
 جب سامنے تیغ اگئی سب پھول خزاں تھے
 کہ حلق کے نزدیک کبھی دل کے برابر
 پانی میں اثر زہر ہلاہل کے برابر
 رن میں کوئی زخمی کوئی ساحل کے برابر
 بسمل بھی نظر آتا تھا بسمل کے برابر
 سر پر تھی وہ جب تک کہ عدو راہ عدم لے
 کیا دخل جو بے دم لئے دم بھر کہیں دم لے

ہربار تھا حملہ عمر سعد نجس پر
 آڑ جاتا تھا سر تیغ چمک جاتی تھی جس پر
 رعب اُسکا نہ چھایا ہوا تھا فوج میں کس پر
 بھاگتے میں یہ گرتا تھا جو اُس پر تو وہ اس پر

سر پاؤں تلے لپٹے تھے بیداد گروں کے
 ٹکرانے سے بال اگٹے کاسوں میں سروں کے

غل تھا کہ شجاعت کا دھنی کہتے ہیں اسکو
 تلوار یہ ہے تیغزنی کہتے ہیں اسکو
 دل تو زردی صف شکنی کہتے ہیں اسکو
 ششدر ہیں پرے پنجتنی کہتے ہیں اسکو

حیدر کے محبوبوں میں نیا دھنگ ہے اسکا
 جو راکب و مرکب ہے وہ چورنگ ہے اسکا

بے سر نظر آیا وہ جسے پاکٹی شمشیر
 دم بھر میں لہو خاک پہ برسا گئی شمشیر
 چمکی تو ادھر اور ادھر اگٹی شمشیر
 کیا منہ تھا کہ فولاد کو بھی کھا گئی شمشیر

سکہ تھا ہر اک دل پہ عجب ضرب پڑی تھی
 پرزے کیا اُسکو بھی زرہ لاکھ کڑی تھی

چلے سے اگر تیر کوئی جوڑ کے نکلا
انبوہ سے شب‌دیز کو یہ موڑ کے نکلا
چورنگ کے دو ہاتھ جدھر چھوڑ کے نکلا
جب شیر سا نکلا تو صفیں توڑ کے نکلا

تلوار چمکتی تھی صف لشکر کیس پر
گھوڑے کے کہیں پاؤں نہ لگتے تھے زمیں پر

لشکر سے جو نکلا وہ قریب آئے نہ ٹھہرا
تلوار کا اک وار کوئی کہا کے نہ ٹھہرا
چہرے پہ سیہ کار سپر لائے نہ ٹھہرا
نامرد لڑائی کی جگہ پائے نہ ٹھہرا

جم جالے جہاں کوہ وہاں کاہ سے کیا ہو
جب شیر کو غیظ آئے تو روباہ سے کیا ہو

کس صف پہ چلی تیغ کہ آفت نہ دکھائی
کس غول پہ چمکی کہ قیامت نہ دکھائی
کس کس کو پریمی بنے شرارت نہ دکھائی
جلوہ کیا سو بار پہ صورت نہ دکھائی

پہل اس کا نظر بندی اعدا پہ تلا تھا
اسمیں کوئی پردہ نہیں منہ صاف کھلا تھا

حصہ نظم

انتخاب از صراٹھی صیر انیس



لاشوں کو اٹھا لے گئے جب قبلہ عالم
چھیڑا حر جرار نے شب دیز صبادم
بھائی کا بھی اندوہ تھا بیٹے کا بھی تھا غم
پر صبر تو دیکھو کہ نہ آنکھیں ہوئیں پر نم

چمکا کے فرس لڑنے لگا فوج گراں سے
مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ گیا کون جہاں سے

اللہ رے مہمان شہ دین کی لڑائی
فرست نہ سنبھلنے کی خطا کاروں نے پالی
اک برق گرمی تیغ چمک کر جدھر آئی
برباد کیا پھونک دیا آگ لگائی

پانی میں وہ آتش تھی کہ کھبرائے تھے اعدا
جلتے ہوئے دوزخ میں چلے جاتے تھے اعدا

زمانہٴ جہالت میں - در بعد اسلام - ایام جاہلیت کی بیبیاں قتلہ
 اور ام رومان تھیں - قتلہ قبیلہ بنی عامر سے تھیں - اسلام سے
 مشرف نہیں ہوئیں - ام رومان مالک بن کنان کی اولاد سے تھیں -
 اسلام لائیں - ہجرت کے وقت حضرت ابوبکر انکرومکہ میں چھوڑ
 گئے تھے - چند روز کے بعد مدینہ بلا لیا - زمانہٴ اسلام میں ایک
 شادی ام رومان کی وفات کے بعد اسماء بنت عمیس سے سنہ ۸ ھ
 میں کی - دوسری شادی حبیبہ بنت خاریجہ انصاریہ سے - حضرت
 ابوبکر کی وفات کے وقت یہ دونوں زندہ تھیں - اولاد تین لڑکے
 اور تین لڑکیاں - اولاد میں سب سے بڑے حضرت عبد الرحمن ام
 رومان کے بطن سے تھے سنہ ۵۳ ھ میں وفات پائی - دوسرے لڑکے عبد اللہ
 قتلہ کے بطن سے - غزوہٴ طائف میں رسول اللہ کے ہمراہ شریک
 تھے - تیر کا زخم پاؤں میں لگا - اس کے صدمہ سے شوال سنہ ۱۱ ھ
 میں انتقال ہوا - تیسرے لڑکے محمد ہیں - یہ مدینہ میں پیدا
 ہوئے - انکی والدہ اسماء بنت عمیس تھیں - لڑکیوں میں سب
 سے بڑی حضرت اسماء تھیں - انکی والدہ قتلہ تھیں - حضرت زبیر کے
 ساتھ شادی ہوئی - سترہ آدمیوں کے بعد اسلام لائیں - دوسری
 لڑکی حضرت عائشہ صدیقہ تھیں - حضرت عبد الرحمن کی حقیقی
 بہن - تمام اراج مطہرات میں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم
 کو زیادہ محبوب تھیں - انکا علم و فضل مسلم ہے - تیسری لڑکی
 ام کلثوم ہیں - انکی والدہ بنت خاریجہ اپنے والد کی وفات کے
 بعد پیدا ہوئیں - لڑکوں میں سلسلہٴ نسل حضرت عبد الرحمن اور
 محمد سے چلا - حضرت عبد اللہ کا سلسلہ ختم ہو گیا -



ہے۔ انہوں نے مصعب زبیری سے حاصل کیا۔ مصعب نے بہ یک واسطہ مطعم بن جبیر سے مطعم نے حضرت ابوبکر سے۔

بلاغت خطب: — مؤرخین کا قول ہے کہ صحابہ کرام میں فصاحت خطبہ میں دو صحابی سب سے ممتاز تھے ایک حضرت ابوبکر دوسرے حضرت علی مرتضیٰ۔

صحبت رسول: — حضرت صدیق اکبر صحبت رسول میں غرق تھے۔ حضرت عروہ نے روایت کی ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دوسرے سال حضرت ابوبکر نے ایک روز خطبہ دیا جس میں پارساں کا لفظ آگیا۔ اس لفظ سے حادثہ وفات یاد آگیا بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بیتاب ہو گئے۔ سنبھل کر پھر خطبہ کا سلسلہ درست کیا۔ پھر ان الفاظ سے دل پر چوت لگی اور اضطراب ہو گئے۔ تیسری دفعہ ضبط کی کوشش کی اور خطبہ ختم کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی انا حضرت ام ایمن کے پاس تشریف لیجایا کرتے تھے۔ بعد خلافت حضرت ابوبکر نے ایک روز حضرت عمر سے کہا۔ چلو سنت نبوی کی پیروی کریں اور ام ایمن سے چلکر ملیں۔ وہاں پہنچے تو وہ رونے لگیں دونوں نے کہا روتی کیوں ہو۔ اللہ کا تقرب رسول کے واسطے بہتر ہے۔ کہا یہ میں بھی جانتی ہوں۔ صدمہ اسکا ہے کہ وحی آسمانی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ یہ سنکر دونوں رونے لگے۔ امام سیوطی نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر کا اصلی سبب وفات رسول اللہ کی رحلت تھی۔ اس صدمے سے گھلتے رہے۔ یہاں تک کہ انتقال ہو گیا۔

ازواج و اولاد: — حضرت ابوبکر نے چار شادیاں کیں۔ دو

ہیں۔ مثلاً توکل، احتیاط، تواضع، خدا کی مخلوق پر شفقت، رضا، خوف الہی وغیرہ۔ نماز میں خشیت الہی کا یہ عالم ہوتا کہ ایک چوب خشک کی طرح کھڑے ہوتے۔ طریقہ نقش بند یہ جو آج تک عالم میں فیض رساں ہے اسکا سلسلہ بواسطہ حضرت امام جعفر صادق حضرت ابوبکر صدیق تک پہنچتا ہے۔

عقائد :- عقائد کے متعلق حضرت ابوبکر نے سب سے اول توحید رسالت کا امتیاز علی الاعلان اُس وقت ظاہر کیا جبکہ خود صحابہ کرام متحیر تھے۔ یعنی بعد وفات حضرت رسول اللہ اس موقع کا خطبہ قیامت تک یاد رہیگا۔ بعد بیعت رسالت و خلافت کے حدود صاف صاف علیحدہ قائم کر دیئے۔ خلیفہ ہونیکے بعد ایک خطبہ خاص اس مبحث کے متعلق دیا۔ اسمیں یہ وضاحت بیان کیا کہ دو باتیں رسول اللہ کیساتھ مخصوص تھیں وہ مجھ سے طلب نہ کرنا۔ ایک وحی دوسری عصمت اسکو اس کثرت کے ساتھ خطبوں میں ظاہر کیا کہ سامعین کے ذہن میں راسخ ہو گیا۔ علاوہ خطبوں کے اور مواقع پر بھی اسکا لحاظ اہتمام کے ساتھ رکھا۔

ایکبار کسی پر غصہ ہو رہے تھے ایک شخص نے کہا حکم ہو تو اسکی گردن اڑا دوں فوراً کہا کہ یہ رتبہ خدا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا۔ زکوٰۃ و نماز میں جو تفریق قائم کرنے کی کوشش کی گئی اسکو آغاز خلافت میں کس شدت سے روکا۔

علم الانساب :- شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ آج انساب قریش کے متعلق جس قدر علم ہے وہ بروایت زبیر بن بکّار محفوظ



آمہات مسائل میں حضرت ابوبکر کی روایتیں سب سے زیادہ مستند روایت ہیں۔ مثلاً طریقہ نماز حضرت ابوبکر سے ابن زبیر نے حاصل کیا ان سے امام عطاء نے۔ ان سے ابن الجریج نے۔ ابن الجریج کی نسبت یہ قول ہے کہ ان کے زمانہ میں ان سے بہتر نماز کا ادا کرنے والا نہ تھا۔ اہل مکہ اداۓ نماز میں طریقہ صدیقیہ کے پابند تھے۔ زکوٰۃ کی مقدار کی بابت سب سے زیادہ مستند روایت حضرت صدیق کی ہے۔

فقہ :- فقہ کے متعلق اجتہاد کا قاعدہ مقرر کیا جو سارے مجتہدوں کا دستور العمل بن گیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ ”رے رضی اللہ عنہ“ شیخ و استاد جمیع مجتہدین شد بوضع این قاعدہ“ فقہ کے جو مشکل مسائل پیش آئے ان کو حل کیا۔ مثلاً میراث جدہ۔ میراث جد۔ تفسیر کلالہ۔ حد شرب خمر۔ مہم۔ شام کی روانگی کے وقت جو احکام امرا نے لشکر کو دئے وہ صدیوں تک امرا نے اسلام کا دستور العمل رہے۔

تعبیر رویا :- یہ بھی ایک علم الہی ہے جس کا ادراک جدید روشنی میں مشکل ہے۔ وجہ یہ کہ جو لوگ نہیں سمجھتے یا نہیں سمجھا سکتے وہ نور و صفائی باطن سے محروم ہیں۔ جس کی ضرورت اس فن کیلئے ہے۔ کشف المحجوب میں ہے طریقہ تصوف کے امام ابوبکر ہیں۔ ان حضرات نے پوچھا اہل رعیال کیلئے کیا چہرہ آئے کہا اللہ اور اس کا رسول۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے تصوف صدیقی کے ذیل میں حضرت صدیق اکبر کے ان تمام اوصاف کی تفصیل کی ہے جو اساس تصوف

زید بن ثابت اُن اجزاء کا مقابلہ بار بار اُن صحابہ سے کرتے جن کو کل یا جز کلام مجید یاد تھا۔ اور جب کوشش کا کوئی دقیقہ باقی نہ رہا تب کاغذ پر نقل کرتے۔ غرض اسی جانفشانی و تحقیق کے ساتھ حضرت زید بن ثابت نے تمام کلام مجید کاغذ پر لکھ کر ایک جگہ جمع کر دیا۔ حضرت ابوبکر نے اس کا نام مصحف رکھا۔ یہ نسخہ خاص حضرت ابوبکر کی تحویل میں رہا۔ حضرت ابوبکر خود بھی حافظ قرآن تھے۔ اور حضرت رسول اللہ کے عہد میں کاتبان وحی کے زمرہ میں شامل۔ لکھنا اس زمانہ میں اسقدر کم یاب تھا کہ قریش کے اتنے بڑے قبیلے میں بقول علامہ بلاذری آغاز اسلام میں صرف سترہ آدمیوں کو لکھنا آتا تھا۔ زمانۂ خلافت میں جو اشکال معانی کلام مجید کے متعلق پیش آیا اس کو حل کیا۔

حدیث: متعدد احادیث ایسی ہیں جو حضرت ابوبکر کے سوال کے جواب میں ارشاد ہوئیں۔ اس طرح وہ ان کے عالم وجود میں آنیکے باعث ہوئے۔ ایک سریالیس حدیثیں بروایت حضرت صدیق مہرری ہیں۔ ان کو امام سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ قلت روایت کے اسباب شاہ ولی اللہ صاحب نے یہ لکھے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہت کم زندہ رہے۔ وہ تھوڑا زمانہ بھی اور قسم کی مہمات کے طے کرنے میں گزر گیا انکے معاصر قریباً سب صحابہ تھے۔ جو خود عالم حدیث و روایت حدیث سے مستغنی تھے۔ تابعین بہت ہی کم تھے۔ واقعات بھی زیادہ پیش نہیں آئے۔ باوجود قلت روایت کے



معرکہ مذکور میں کس کثرت سے مہاجرین و انصار شہید ہوئے اُن میں کثرت سے ایسے تھے جو کل یا جز قرآن کے حافظ (قراء) تھے۔ حضرت عمر نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر حضرت ابوبکر سے کہا کہ مسلمانوں کو ابھی بہت سے معرکے سر کرنے ہیں اگر ہر معرکے میں اسی کثرت سے حافظ شہید ہوئے تو قرآن کا خدا حافظ ہے۔ آپ حکم دیجئے کہ کلام مجید ایک جگہ ضبط تحریر میں آجائے۔ ارل حضرت صدیق نے اس بنیاد پر تامل کیا کہ جو فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا کس طرح کریں۔ مگر بحث کے بعد حضرت ابوبکر پر منکشف ہو گیا کہ حضرت عمر کی رائے صحیح ہے۔ حضرت زید بن ثابت کو طلب کر کے ارل اپنی ارل حضرت عمر کی گفتگو کو سنایا پھر کہا تم جوان ذی ہوش ہو کوئی الزام تم پر نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں رحی لکھا بھی کرتے تھے۔ لہذا تم کلام مجید لکھ کر ایک جگہ جمع کر دو ارل حضرت زید بن ثابت کو بھی رہی تامل ہوا جو حضرت صدیق کو ہوا تھا۔ لیکن مباحثہ کے بعد اطمینان ہو گیا ارل انہوں نے خدمت قبول کی۔ حضرت زید کا مقولہ ہے کہ اگر پہاڑ کو اُٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھ دینا میرے سپرد کیا جاتا تو وہ آسان ہوتا بمقابلہ اس کے کہ جمع قرآن کا برجہ میرے سر پر رکھا گیا۔ اس سے اُس احساس کا اندازہ ہو سکتا ہے جو حضرت زید بن ثابت کو خدمت مقروضہ کی ذمہ داری کا تھا۔ کاشانہ نبوت سے تحریر شدہ اجزاء برآمد کئے گئے۔ مزید احتیاط و غایت اہتمام صحت کے لحاظ سے حضرت

تھا، پہرہ نہ تھا، لوگوں نے کہا کہ پہرہ رکھئے تو جواب دیا قفل کافی ہے۔ جب مدینہ کی سکونت اختیار کی تو خزانہ مدینہ چلا آیا۔ قاضی حضرت عمرؓ تھے۔ اس عہد کی صفائی معاملات کا یہ عالم تھا کہ ایک سال تک ایک مدعی بھی حضرت عمرؓ کے سامنے نہ آیا۔ کاتب حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت عثمٰنؓ تھے۔ معمولی خط و کتابت کا کام جو حاضر ہوتا اُس سے لے لیا جاتا۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اُس زمانے میں ان خدمات کا معارضہ لینا سخت برا سمجھا جاتا تھا۔ جو کام کرتے محض حسبہ اللہ۔

علمی کمالات و علمی خدمات :- قرآن - قرآن شریف

بطور وحی تینیس برس تک تھوڑا تھوڑا حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا۔ بہت سے صحابہ کرام ایسے تھے جن کو کلام مجید پورا حفظ تھا۔ نہایت کثرت سے ایسے تھے جنکو مختلف حصے یاد تھے۔ جب وحی نازل ہوتی تھی تو حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کاتبانِ وحی میں سے کسی کو طلب فرماتے اور لکھوا دیتے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کو یہ سعادت اکثر حاصل ہوتی۔ کاغذ نایاب تھا۔ اس لئے علامہ کاغذ کے وحی چمڑے کے ٹکڑوں، کھجور کی چھال، بکری کے شانہ کی ہڈی، سپید پتھر کے ٹکڑوں پر بھی لکھی جاتی اور یہ لکھ ہوئے اجزا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس محفوظ رہتے۔ ع

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

یمنامہ کے پر شر معرکہ سے یہ نتیجہ خیر نکلا کہ کلام مجید ایک جگہ تحریر ہو کر بشکل کتاب محفوظ ہو گیا۔ اُردو سن چکے ہو کہ



بعد عام ہدایت کی کہ آئندہ صرف فتح کی خبر بھیجی جائے دشمن کا سر نہ بھیجا جائے۔ عمال کی بابت یہ اصول تھا کہ جو عامل حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ تھے۔ وہ بدستور قائم و برقرار رہے۔ سادگی اسلام کو ہمیشہ اپنا شعار رکھا۔ اس سادگی و وقار پر ہزار تکلف اور شان و شوکت نثار تھے۔ اہل ارتداد کے مقابلے سے جب اسلام کے لشکر لوٹے تو ان کے ہمراہ ذوالکلاع حمیری بھی یمن سے آئے۔ یہ اس شاہی خاندان حمیری کی یادگار تھے جو مدتوں یمن پر جاہ و جلال کے ساتھ فرمانروا رہ چکا تھا۔ شاہی خاندان کے دورِ آخر کے تکلفات و ناز و نعمت کا پورا جلوہ ذوالکلاع میں نظر آتا تھا۔ سر پر جواہر نگار تاج تھا۔ بدن میں زرین پوشاک۔ طلائی پیٹی کمر میں۔ ہمراہی بھی زرق برق لباس میں تھے۔ مدینہ آ کر خلیفہ کو دیکھا تو گھبرا چادریں ایک باندھے ایک اڑھے۔ اسلامی وقار و تمکین کا رفتہ رفتہ یہ اثر ہوا کہ ذوالکلاع نے لباس شاہی چھوڑ کر دلق درویشی اختیار کر لی۔ ایک روز مدینہ کے بازار میں نکلے تو کمر سے چمڑے کی معمولی پیٹی بندھی تھی۔ ایک ہمراہی نے دیکھ کر حسرت سے کہا کہ یہ کیا شکل بذالی۔ جواب دیا کہ اسلامی اثر سے لایعنٰی تکلفات بے لطف ہو گئے۔

عمال و کاتب: حضرت ابو عبیدہ بن الجراح خزانہ کے مہتمم تھے اور جزیہ کی آمدنی کا حساب انکے سپرد تھا۔ بیعت کے بعد انہوں نے کہا کہ مال کا کام خلیفہ کی طرف سے میں انجام دوں گا۔ خزانہ جب تک حضرت ابوبکرؓ میں رہے وہاں رہا۔ قفل پڑا رہتا

اصول حکومت :- بنیاد حکومت قرآن و حدیث تھی ۔
 جب کوئی معاملہ پیش آتا اور قرآن کی طرف رجوع کرتے ۔ اگر
 کلام مجید میں نہ ملتا حدیث کی طرف ترجہ کرتے ۔ اگر خود
 حدیث نہ معلوم ہوتی مجمع میں آکر دریافت کرتے کہ فلاں معاملہ
 میں کسی کو حدیث یاد ہے ۔ اکثر ایسا ہوتا کہ بہت سے آدمیوں
 کو حدیث معلوم ہوتی اس پر شکر کرتے کہ میری مدد کیواسطے اس
 قدر سنت رسول کے جاننے والے موجود ہیں ۔ جب حدیث بھی
 نہ ملتی تو صحابہ میں جو اہل الرائے اور منتخب بزرگ تھے ان کو
 جمع کر کے مشورہ کرتے جس رائے پر اجماع ہو جاتا اسی پر کاربند
 ہوتے ۔ اسلام نے جو مسارات کی روح پھونکی تھی اُس کو آخر
 عہد تک نہایت اہتمام سے قائم رکھنے کی کوشش کی ۔ بیت المال
 کی آمدنی مساری طور پر تقسیم کیجاتی تھی ۔ اسمیں جوان
 بزرگے ، مرد یا عورت کا کچھ امتیاز نہ تھا ۔

ایک مرتبہ مجمع میں بیٹھے تھے ایک شخص نے آکر کہا ”السلام
 علیکم یا خلیفۃ رسول اللہ“ سنکر کہا تمام مجمع میں خصوصیت کے
 ساتھ مجھ کو سلام کیوں کیا ؟ خلافت کے بعد اول مرتبہ ادائے عمرہ
 کے واسطے مکہ گئے تو لوگ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے ۔ سب کو علیحدہ
 کیا اور کہا اپنی اپنی راہ چلو ۔ شان تکبر سے ہمیشہ احتراز رکھا ۔
 ایک مرتبہ ایک فاتح امیر نے نامہ فتح کے ساتھ دشمن کا سر بھیجا تو
 بہت ناخوش ہوئے ۔ لانیوالے نے عذر کیا کہ ہمارے دشمنوں کا یہی
 طرز عمل ہے ۔ فرمایا کہ ہم روم و فارس کے مقلد نہیں ۔ اس کے



تعریف کرتا تو کہتے اے اللہ تو میرا حال مجھ سے بہتر جانتا ہے اور
تعریف کرنے والوں سے میں اپنا حال بہتر جانتا ہوں۔ جو ان کا
گمان میری نسبت ہے اس سے اچھا سمجھو کر دے۔ اور میرے وہ
گناہ بخشدے جنکو یہ نہیں جانتے اور جو یہ کہتے ہیں اس کا مواخذہ
مجھ سے مت کیجئے۔ اپنا سب کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔
دوسروں سے کام لینے سے سخت احتراز تھا۔ انتہا یہ کہ اونٹ کی
نکیل ہاتھ سے گریزتی تو خود اُنر کر نکیل اُٹھاتے۔

امام زہری کا قول ہے کہ بال گھونگر والے تھے۔ آواز دردناک
تھی۔ بات بہت کم کرتے تھے جو کہتے سنجیدہ کہتے۔ انداز کلام ذوق
و محویت کی شان لئے ہوئے تھا۔ قلب نہایت رقیق و نرم تھا۔ اسی
لئے ”ارّاه“ لقب تھا۔ سخی، با وقار، حلیم و شجاع تھے۔ رائے نہایت
سدید و صائب تھی۔ اُسکا جوہر وہ نور ایمانی تھا جسکا نام اصلاح
شرع میں فراست مؤمن ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب ازالۃ الخفا میں لکھتے ہیں (خلاصۃ)
حضرت ابوبکر (رض) علم کتاب و سنت میں مثل دیگر علمائے صحابہ کے
تھے۔ جس صفت میں سب سے ممتاز تھے وہ یہ تھی کہ جب کوئی
مشکل مسئلہ یا مشورہ پیش آتا رہ اپنی فراست کو اس پر غور کرنے
میں صرف کرتے۔ خداوند تعالیٰ غیب سے ایک شعاع اُنکے دل پر
دالتا جس سے حقیقت حال روشن ہو جاتی۔ اس شعاع کا ظہور
لطیفۂ قلبیہ سے ہوتا۔ لہذا حقیقت حال بصورت عزیمت ظاہر ہوتی۔
نہ برنگ تخیل۔“

ایک روز حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو مخاطب کر کے دریافت فرمایا - آج تم میں سے روزہ کس نے رکھا - حضرت ابوبکر نے کہا میں نے - پھر پوچھا جنازہ کے ساتھ کون گیا - حضرت ابوبکر - ”میں“ - محتاج کو کھانا کس نے کھلایا - حضرت ابوبکر - ”میں نے“ - بیمار کی عیادت کس نے کی - حضرت ابوبکر - ”میں نے“ - سکر ارشاد فرمایا کہ یہ اوصاف جسمیں جمع ہونگے وہ جنتی ہے -

مدینہ کے کفارے پر ایک برہیا اندھی محتاج رہتی تھی - حضرت عمر ہمیشہ اس کے یہاں اس ارادہ سے جاتے کہ کچھ خدمت کریں - مگر جب پہنچتے تو معلوم ہوتا کہ کوئی آدمی اُن سے پہلے آکر خدمت کر گیا - ایک روز دروازے میں چھپ کر کھڑے ہو گئے - رقت مقررہ پر وہ شخص آیا - دیکھا تو حضرت ابوبکر تھے - یہ خلافت کا زمانہ تھا - مقررہ وظیفہ کے خرچ میں کس قدر احتیاط تھی اسکا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے -

ایک روز انکی بی بی نے شیرینی کی فرمائش کی - جواب دیا میرے پاس کچھ نہیں - اُنہوں نے کہا کہ اجازت ہو تو میں خرچ روزمرہ میں سے کچھ دزم بچا کر جمع کر لوں - فرمایا جمع کرو - کچھ روز میں چند پیسے جمع ہو گئے تو حضرت ابوبکر کو دیئے کہ شیرینی لادو - پیسے لیکر کہا - معلوم ہوا کہ یہ خرچ ضروری سے زیادہ ہیں - لہذا بیت المال کا حق ہیں - چنانچہ وہ پیسے خزانے میں جمع کرا دیئے اور اسی قدر اپنا وظیفہ کم کر دیا - منہ پر کوئی

کچھ ارپہر سوا در سال کا وظیفہ چھ ہزار درہم ہوا ۔

خلافت سے پہلے سُرخ میں رہتے تھے ۔ وہیں انکی بی بی حضرت حبیبہ خارجہ انصاریہ کی سکونت تھی ۔ ایک چھوٹا خیمہ یا حجرہ مکان کی بساط صرف اس قدر تھی ۔ چھ مہینے تک زمانہ خلافت میں بھی اُسی میں قیام رہا ۔ جس روز وہاں جانے کی باری ہوتی ۔ اکثر پیدل جاتے ۔ کبھی اپنے ذاتی گھوڑے پر ۔ عشا کے بعد جاتے اور صبح کو واپس آجاتے ۔ خلافت سے پہلے محلہ کی لڑکیاں اُنکے پاس بکریاں لاتیں اور وہ درودھہ درہہ دیتے ۔ جب خلیفہ ہو کر محلے میں گئے تو لڑکیوں نے دیکھ کر کہا اب یہ درودھہ نہیں درہینگے ۔ سنکر کہا ضرور درہونگا ۔ مجھ کو خدا کی ذات سے اُمید ہے کہ اس منصب سے میری کسی عادت میں فرق نہیں آئیگا ۔ چنانچہ جب محلہ میں آتے تو دریافت کرتے درودھہ درہہ دروں ۔ یا بکریاں چرا لاؤں جیسا لڑکیاں کہہ دیتیں اُسکے مطابق تعمیل کرتے ۔ خود انکی بکریاں بھی تھیں ۔ کبھی کبھی ان کو بھی لیجا کر چراتے ۔ شفقت کا یہ عالم تھا کہ جب محلے میں نکلتے تو بچے با با کہہ کر دوڑتے اور آکر لپٹ جاتے ۔ جمعہ کے دن صبح کو سُرخ میں تپہر کر سر اور داڑھی میں سرخ خضاب لگاتے ، غسل کرتے ، کپڑے بدل کر مدینہ آتے اور نماز جمعہ پڑھاتے ۔ چھ مہینے کے بعد سُرخ کی سکونت ترک کر کے مدینہ کے مکان میں متصل مسجد نبوی سکونت اختیار کی ۔ ان بزرگوں کی روزانہ زندگی کا اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے ۔



رہا۔ رضی اللہ عنہ۔ عمر ۶۳ سال کی تھی۔ ایام خلافت دو برس
تین مہینے گیارہ دن۔

قبول اسلام کے وقت مالی سرمایہ چالیس ہزار درہم تھا۔
تجارت ذریعہ معاش تھی۔ اس سرمایہ کو خدمت اسلام میں
صرف کرتے رہے جب ہجرت کر کے مدینہ کو چلے تو پانچ ہزار درہم
باقی تھے سب ساتھ لے آئے اور مدینہ میں تجارت اور مالی خدمت
اسلام کا شغل جاری رہا۔ وفات کے وقت نقد ایک حبہ نہ تھا۔
خلافت کے بعد بھی شغل تجارت قائم رہا۔ روزانہ چادریں اپنے
کندھے پر لاد کر بازار کو لے جاتے اور خرید و فروخت کرتے۔ چھ
مہینے تک یہی عمل رہا۔ جب مشاغل خلافت بڑھے اور فرصت
مفقود ہوئی تو صحابہ کو جمع کیا اور کہا کہ خلافت کے کاروبار اب
تجارت کی مہلت نہیں دیتے اور میں اہل و عیال کی پرورش کا
سامان مہیا نہیں کر سکتا۔ یہ سن کر صحابہ کرام نے انکے مصارف
خزانہ سے مقرر کر دیے۔ بعد غور معیار مصارف مدینہ کے ایک
مہاجر کا خرچ رکھا گیا۔ اسمیں اختلاف ہے کہ مقدار وظیفہ کی
کیا تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ ادھی بکری کا گوشت روزانہ۔
معمولی لباس۔ شرط یہ تھی کہ پرانا لباس بیت المال میں داخل
کر دیا جائے۔ بعض نے نقد وظیفہ کا تقرر لکھا ہے۔ نقد کی مقدار
با اختلاف روایت تھائی ہزار درہم سالانہ سے چھ ہزار درہم تک
بتائی گئی ہے۔ میں کم و بیش تھائی ہزار کو ترجیح دیتا ہوں۔
وجہ یہ کہ وفات کے وقت جو حساب وظیفہ کا کیا گیا اسکے بموجب

کردوں - جب محمد بن یونیورسیتی بنے تو ایک کالج خاص طور پر مسلمان خاتونوں کیلئے تیار کیا جائے - ایک لاکھ کی جائداد ہے - میرے خیال میں کالج کی ابتدائی اخراجات کیلئے کافی ہوگی - تمہاری کیا رائے ہے - "میں نے کہا - "ضرور واللہ ضرور - خدا تمہارے ارادے میں برکت دے - کل قوم احسان مند ہوگی، مگر شب بخیر نیت شب حرام - چلئے رات بہت آئی ہے - لو ایک بچ گیا اب چلکے سونا چاہئے -"

یہ کہہ کے ہم کوٹھی میں داخل ہوئے - اب کوٹھی کی ہر ایک چیز مجھے عجیب معلوم ہوتی اور میرے دل پر عجیب اثر ڈالتی تھی - ہے یوں کہ -

کسی کا ہو رہے آتش کسی کو کر رکھے
دو روزہ عمر کو انسان نہ زائیکان کاٹے

انتخاب از سیرۃ الصدیق - از مولانا حبیب الرحمن خان شروانی

حضرت ابوبکر صدیق (رض)

ذاتی حالات

۲۲ - جمادی الآخر سنہ ۱۳ھ در شنبہ کا دن گزرنے پر عشاء

مغرب کے درمیان حضرت ابوبکر نے وفات پائی - نماز جنازہ کی امامت حضرت عمر نے کی اور اسی شب کو حضرت عائشہ کے حجرہ میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے قریب اس طرح دفن کئے گئے کہ ان کا سر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ کے برابر

پیغام آئے - مگر میں نے دل میں تھان لی تھی کہ جب تک کوئی
مجھے صرف میرے لئے نہ بیاہے گا میں کسی سے شادی نہ کروں گی -
اس لئے غریب بنی اور حیدر آباد گئی اور صدق اس کی کریمی کے
کہ اللہ نے تم جیسا پیارا خاوند مجھے دیا - جس نے مجھے میری
درت کے لئے نہیں بیاہا - بلکہ صرف میرے لئے - ساری دنیا مجھے
برا کہتی تھی - میری طرف سے بدگمانی تھی - پھر بھی تم نے
مجھ سے شادی کی اور میں نے تمہارے ساتھ ساری مصیبتیں
جھیلیں، صرف یہ دیکھنے کیلئے آیا تمہیں مجھ سے اصلی محبت ہے یا
اکتا جاؤ گے - اپنی کوٹھی پر میں برابر حالات لکھتی رہتی تھی -
اس وجہ سے خالو کو سب حال معلوم تھا -

اس کے بعد ہم ہنسی خوشی رہنے لگے -

یہ کہہ کے نعیم رکا اور پھر بھراٹی ہوئی آواز سے کہنے لگا ”مشیت
ایزدی میں کس کو دخل ہے - آٹھ سال بعد، اللہ نے قمر النساء کو بھی
مجھ سے چھین لیا - اب وہ جنت میں ہے اور میں یہاں زندگی کے
دن پورے کر رہا ہوں - ایک اس کی یاد ہے اور وہی میری
زندگی کا سہارا ہے یعنی میری پیاری بیٹی نغم النساء جو ہمارے
پتنے آنے کے بعد پانچ مہینے کے اندر دنیا میں آئی - اللہ اسے جیتا
رکے - میری طبابت بھی یہاں خوب چمکی اور میری ذاتی
جائداد بہت کچھ ہے - اس لئے میرا ارادہ ہے کہ قمر النساء کی
جائداد کسی کار خیر کیلئے وقف کر دوں -

عزم یہ ہے کہ کل جائداد عورتوں کی تعلیم کے واسطے وقف

حالت میں تھا کہ یکایک سامنے کا دروازہ کھلا اور شاہزادیوں کے لباس میں ملبوس ایک خاتون کمرے میں داخل ہوئی۔ میں جھجک کے چاہتا تھا کہ کمرے سے باہر نکل جاؤں اور اس خیال سے میں باہر کی طرف لپکا بھی کہ اس خاتون نے کہا۔ ”پیارے نعیم۔“ پھر غور سے دیکھتا ہوں تو میری پیاری قمر النساء بادشاہی زادی بنی کھڑی ہے۔ بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا:—

”میں خواب دیکھ رہا ہوں یا میری آنکھیں دھوکہ دے رہی ہیں۔“

قمر النساء نے ہنس کر کہا:— ”نہیں تم جاگتے ہو اور میں ہی تمہاری قمر النساء ہوں۔ اللہ اللہ مجھے تم پہچانتے بھی نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری مصیبتیں دور ہوئیں میرے پاس بڑی ریاست ہے اور ہم اب عمر بھر یہیں رہیں گے“ میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا ”تو تم نے حیدر آباد میں نوکری کیوں کی تھی؟“ ”سب بتاتی ہوں۔ بے صبر کیوں ہوئے جاتے ہو۔ میرے والد مرحوم نہایت روشن خیال آدمی تھے انہوں نے میری تعلیم نہایت اعلیٰ درجے کی کی تھی۔ اور کہتے تھے کہ اولاد کو تعلیم دینا والدین کا فرض۔ سوائے میرے اُن کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اور خدا کی مرضی یہ ہوئی کہ میرے بارہویں سال میں، اللہ بخشے ابّا کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا۔ ساری جائداد کی میں ہی مالک ہوئی۔ میں نے اپنے سر پرست سے کہا کہ میں نے ڈاکٹری پڑھونگی۔ چنانچہ میں لاہور بھیجی گئی۔ وہاں سے آئی تو بڑے بڑے گھرانوں سے میرے لئے

میں رات دن گھلتا تھا اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ میرا کوئی رشتہ دار بھی نہ تھا کہ جس کے یہاں جا پڑتا اور قمر النساء بھی کہتی تھی کہ ”میں یتیم اور بالکل بے والی وارث ہوں۔“ لیکن ایک دن خود ہی اُس نے کہا کہ ”پتنہ میں میرے ایک دور کے رشتہ دار ہیں۔ شاید وہ زندہ ہوں۔ چلو دھیں چلیں۔“ مجھ کو اس بات کا خیال کرتے بھی شرم آتی تھی کہ میں انکے یہاں جا کے پڑوں گا۔ لیکن کیا کرتا قمر النساء کی جان بھی پیاری تھی۔ گیا مگر بادل ناخواستہ جب ہم پتنہ پہنچے تو قمر النساء پتنہ پوچھتی ہوئی ایک نہایت معمولی درجے کے مکان میں مجھے لے گئی۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک بزرگ صورت باہر آئے۔ قمر النساء کو دیکھتے ہی متعجب ہوئے۔ پھر خوشی خوشی گھر میں لے گئے۔ گھر میں ایک بڑی بی تھیں جو ہم دونوں پر صدقے ہوئیں۔ اور قمر النساء سے کہنے لگیں کہ۔ ”میری بھانجی! تمہیں تو ہم مردہ خیال کر چکے تھے۔“ در تین دن میں یہاں رہا۔ ایک دن قمر النساء کے خالو، ہمارے میزبان نے مجھ سے کہا :- ”یہاں ایک نواب صاحب ہیں“ میں ان کی سرکار میں نوکر ہوں۔ چلئے آپ کو بھی ان سے ملاؤں۔“ پھر ایک عالیشان کوٹھی میں مجھے لے گئے اور گول کمرے میں مجھے بٹھائے کہا کہ۔ ”تم یہیں بیٹھے رہنا“ میں ابھی آتا ہوں“ نواب صاحب بھی اس وقت تشریف لائیں گے محل میں ہیں۔“ میں اکیلا بیٹھا رہا، کوٹھی کی ایک ایک چیز کو دیکھتا تھا اور عیش عیش کرتا تھا۔ لیکن ایک بات سے حیرت تھی ساری کوٹھی میں سناٹا تھا۔ میں ایسی

قمر النساء نے مجھ سے ابدیدہ ہو کر کہا - ”دیکھا ! میری وجہ سے تم پر یہ مصیبت نازل ہوئی -“ لیکن مجھے بخدا ! ذرا بھی جو اس کا خیال ہو کہ مجھ پر یہ مصیبت ہے میں اپنے تئیں دنیا میں سب سے بڑا خوش قسمت سمجھتا تھا کیونکہ میری قمر النساء میرے ساتھ تھی - میں حیدرآباد سے سیدھا لکھنؤ پہنچا اور یہاں میں نے اپنا مطب جاری کر دیا - سچ کہا ہے کہ مصیبت تنہا نہیں آتی - حیدرآباد سے یوں نکلا - یہاں پہنچ کر بالکل نا اُمیدی ہو گئی - کئی مہینے گزر گئے اور آمدنی عنقا ! اور ایک دم چلتی بھی کس کی ہے ؟ یہ تو ایک سوداگری ہے ؟ ظاہری ٹیپ ٹاپ جب تک نہ ہو کون آتا ہے ؟ اور میرے پاس کیا تھا ؟ جب حیدرآباد میں رہا کبھی کچھ پس انداز ہی نہ کیا - جس کا خمیازہ اب بھگتنا پڑا - کہتے ہوئے شرم آتی ہے مگر کہنا ہی پڑتا ہے - یہ حالت ہو گئی تھی کہ ایک ما ما تک رکھنے کی قدرت نہ رہی - قمر النساء بیچارہ سارے کام گھر کے کرتی تھی اور جب میں گھر میں آتا تو نہایت خندہ پیشانی سے کہتی کہ :- ”کہانا پکانا اور گھر کا کام کرنا مجھے بہت اچھا معلوم ہوتا ہے -“ اس کا یہ کہنا گروہ دل سے ہی ہوتا تھا، مجھ پر تیر کا کام کرتا تھا - میں کہتا تھا کہ - ”ہاٹے میں کمبخت ہی تو اس بیچارہ پر ان مصیبتوں کے پڑنے کا باعث ہوا ہوں -“ خدا کی شان اسی زمانے میں قمر النساء امید سے ہو گئی - اب تو مجھے بے حد فکر ہو گئی - ہر وقت یہ خیال کہ ایسے ایسے سخت کام کرتی ہے - کہیں جھٹکا رٹکا آجائے تو اور مشکل آ پڑے اسی فکر

کیسی الٹا میں کسی کام کے قابل نہ رہا۔ اُٹھتے بیٹھتے یہی دھن تھی کہ وہ کسی طرح میڈری التجا کو قبول کر لے۔ میڈری یہ حالت کہ ضرورت ہو یا نہ ہو اس کے شفا خانے کا معائنہ ضرور کرتا اور کسی نہ کسی طرح عرض حال کرتا۔ کچھ عرصے کے بعد میں نے دیکھا کہ رفتہ رفتہ اُسکی پہلی بہرک میں بھی کمی ہوتی گئی اور قصے کو طول کیا دوں ایک دن وہ آیا کہ میں اور وہ دلہا اور دلہن ہو گئے۔ لیکن میڈری اور قمر النساء (یہ اس کا نام تھا) کی شادی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ حیدر آباد بھر میں اس کا چرچا ہوا۔ اگرچہ ہم نے سادے طور پر شادی کی تھی مگر اپنی اپنی قسمت ہے کوئی ہزاروں روپیہ خرچ کرتا ہے اور دھوم دھڑکے سے بیاہ رچاتا ہے۔ تاہم شہرت اس کی عشرِ عشیر بھی نہیں ہوتی جو ہماری غریبی کی شادی کی ہوئی۔ مگر جو سنتا تھا کانوں پر ہاتھ دھرتا تھا۔ ہم پر لعن طعن کرتا تھا۔ ہم عیش سے زندگی بسر کرتے تھے، کیا خبر تھی کہ ہم پر یوں ظلم ہوگا۔

درتا ہوں آسماں سے بجلی نہ گر پڑے

صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں —

دشمنوں نے ہمارے افسرِ بالا کے کان بھرے اور ایک دن مرگ عفا جات کی طرح ہمارے پاس یہ حکم آیا کہ دونوں حدود ریاست سے باہر ۴۸ گھنٹے میں نکل جائیں۔ ہم کرہی کیا سکتے تھے۔ سنگ آمد و سخت آمد ہم اپنے قلیل تعداد ہمدردوں کے افسوس اور قذی دل دشمنوں کی خوشیوں میں حیدر آباد سے رخصت ہوئے۔

تمنّا اُتھا، آنکھیں جو حسیات روح کی بے زبا ترجمان ہیں، پُغضب
 ہو گئیں اور نہایت غصہ بھری آواز سے اس نے مجھے جواب دیا :-
 ”جناب میں نہیں جانتی آپ کیا ارشاد فرما رہے ہیں - آپ
 میرے افسر ہیں مجھ آپ سے اس قسم کی باتوں کی اُمید نہ تھی۔“
 ”بجائے اس کے میں اس جواب سے اپنے ہوش میں آتا - نہ
 معلوم وہ کیا بات تھی کہ جس نے مجھے اور بیخود کر دیا اور بیتاب
 ہو کر نہایت عاجزی سے التجا کرنے لگا - اس نے خاموشی اختیار
 کی - اور مجھے اس رقت یقین ہوا کہ :-

عشق اول درد دل معشوق پیدا می شود

گر نہ سوزد شمع نئے پروانہ شیدا می شود

جب میں اپنی جذوں اُمیز گفتگو ختم کر چکا تو مجھے یقین تھا کہ
 شاید اس رقت عتاب کی انتہا نہ رہے گی لیکن میرے نصیب کہ
 اُس نے نہایت آہستگی سے کہا :-

”خود آپ خیال کیجئے کہ میں ایک معمولی درجہ کی عورت
 ہوں آپ اللہ رکھے اتنے بڑے عہدے پر ہیں - کہاں میں، کہاں آپ،
 مجھے یقین ہے کہ جب آپ اپنی کوٹھی پر جائیں گے تو آپ کہیں گے کہ
 لاجول ولاقوۃ مجھ سے بھی کیا یہودگی ہوئی ہے ایک ادنیٰ درجے کی
 عورت سے کیا کیا باتیں کہی ہیں - اس لئے مجھے میرے حال پر
 رہنے دیجئے۔“

یہ جواب شاید تمہارے نزدیک مایوسی دلانے والا ہو، مگر
 مجھے پھر تو اس نے الٹا اثر کیا - میں گھر گیا تو ان خیالات میں کمی

چاہے اسے مزاج کی سنجیدگی کہئے، یا غرور حسن خیال کی بجائے کچھ ہو۔ نتیجہ یہ تھا کہ کسی کی مجال نہ تھی کہ آنکھ بھر کر دیکھ سکے۔ کام اتنا عمدہ کہ کل ریاست کے زنا نہ شفا خانوں میں اس کا شفا خانہ اول رہتا تھا۔ میرا بہ حال تھا کہ اگر کوئی کہیں اس کی ذرا سی بھی برائی کرتا تو مجھے تاب نہ رہتی تھی میں کہتا کہ بہ پہلی مثال ہے کہ ایک مسلمان عورت نے ڈاکڑی کا امتحان پاس کیا اور وہ پہلی مثال بھی اتنی عمدہ ہے، یہ بھی اُسے بُرا کہا جاتا ہے۔ غرض کہ میں لوگوں سے اسکی حمایت میں لڑا کرتا تھا۔ تھوڑے دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ مجھے محض اس سے محبت ہی نہیں عشق ہے۔ کیونکہ روز بروز اس کا خیال دل میں گہر کرتا جاتا تھا۔ اس خیال کو جتنا میں نے ہٹانا چاہا اتنے ہی زیادہ زور سے وہ دل میں متمکن ہوتا گیا۔ میں اپنے دل سے کہتا تھا ”دنیا کیا کہیگی“ عزیز و اقارب کیا کہیں گے“ دل کہتا تھا کہ عشق میں ان باتوں کا کیا خیال؟ کیا یہ کافی نہیں کہ وہ شریف ہے، نیک ہے، لاکھوں میں انتخاب ہے، جب خدا اور رسول نہیں روکتے تو اور روئے والا کون ہوتا ہے۔“ میں انہیں خیالات میں مسغرق رہتا تھا اور کوئی تصفیہ نہیں کر سکتا تھا کہ مجھے معلوم نہیں کس طرح اور کس بیخودی کی حالت میں ایک دن میں اس سے بہ کہہ گئی :-

”آپکی شادی ہو گئی ہے اور اگر نہیں ہو دیا آپکی زوجیت ہی

عزت مجھے حاصل ہو سکتی ہے؟“

آف! اس فقرے کا اثر اس پر کیسا ہوا ہے؟ چہرا یکایک

اور ریاست میں سول سرجن مقرر کیا گیا۔ اس کے ایک سال بعد ہی والد ماجد کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا۔ والد مرحوم کی تمنا یہ تھی کہ میری شادی ان کی زندگی ہی میں ہو جاتی، مگر ہائے ایسے باپ کسے نصیب ہوئے ہیں۔ انہوں نے کبھی مجھے جبر نہیں کیا، اور اس کو میری مرضی پر چھوڑ دیا۔ شادی کے بارے میں میرے خیالات اس وقت کچھ اور تھے اور میں ان پر ہنسنا تھا جو خواہ مخواہ شادی کر کے مصیبت میں پڑتے تھے اور اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ میں کہتا تھا کہ اس سے بڑھکر بھی کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کہ جان بوجھکر انسان اپنے پاؤں میں پتلیاں ڈال لے۔ کیا معاموں تھا کہ تھوڑے دنوں بعد لوگ مجھے ہنسیں گے۔ جو شفا خانے میری زبردستی تھے ان میں سے تین چار زمانے شفا خانے بھی تھے اور یہ نہایت حیرت انگیز بات تھی کہ ان میں ایک ڈاکٹر فی مسلمان تھے لاہور میں تعلیم پائی تھی اور حیدر آباد مقرر ہو کر آئی تھی۔ چونکہ یہ بالکل نئی بات تھی اس لئے حیدر آباد میں اس مسلمان لیڈی ڈاکٹر کا شہہ تھا۔ ہندوستانوں کی بدنکمانی! آپ جابیں بہ اسی کے حق میں کلمہ ذخیرہ ہوا ہی کہیں گے۔ کسی کو اسکی پاکدامنی پر شبہ تھا۔ کوئی کہتا تھا جانے کس ذہل قوم کی ہے۔ غرض کہ جتنے مذہب اتنی ہی باتیں تھیں۔ لیکن اس کا حسن سب کو خبر نہ ہوئے تھا۔ کیونکہ وہ پردہ بالکل نہیں کرتی تھی۔ مجھ کو اپنے عہدے کی حیثیت سے اکثر ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ مگر اس رکھ رکھاؤ کی عورت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔

عشق کی طغیل میں نصیب ہو سکتا ہے روپیہ کے لئے شادی
 مت کیجئے، بلکہ عشق کے لئے اور پھر میرا دعویٰ ہے کہ ایک
 ایک لفظ نارلوں کا آپ کو صحیح معلوم ہوگا۔ لیجئے میری ہی
 سرگذشت سنئے اور بتائیے کیا یہ نارل نہیں؟“
 یہاں نعیم یکا یک رک گیا، کچھ دیر تک متاثر حالت میں
 سگار کے دھوئیں کو دیکھا کیا، گویا نظر وہاں ہے اور خیال
 کہیں اور، پھر کہنے لگا:—

”کیا اس سے بھی بڑھکے کوڑا افسانہ ہو سکتا ہے۔“

میں نے بڑے اشتیاق سے کہا:—

”خدا کے لئے سناؤ۔“

”سناؤں تو، مگر کیا میں سنا سکوں گا؟“

میں نے ذرا چلا کر کہا۔ ”میرے اشتیاق کو مت بہر کاؤ کہو تو۔“

”بھائی اصل یہ ہے کہ یہ سرگذشت ایسی نہیں (نعیم کی

آواز یہاں رقت بھری تھی) کہ میں تھندے دل سے بیان

کر سکوں مجھے معاف کرنا اگر کہیں دارفتگی کی حالت طاری

ہو جائے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ جب ہم تم کالج میں پڑھا کرتے

تھے تو میں ہمیشہ ولایت جانے کی تمنا ظاہر کیا کرتا تھا۔ جب

تم کالج چھوڑ کر چلے گئے، اس کے کچھ دنوں بعد والد مرحوم مجھے

ولایت بھیجئے پر راضی ہو گئے، حیدرآباد میں تو نوکر تھے ہی

وہاں کوشش کر کے ریاست کی طرف سے مجھے بھیجوا یا۔ پانچ برس

کی محنت شاقہ کے بعد بفضل خدا میں ایم۔ ڈی ہو کر واپس آ گیا

آدھہ جگہ مسکرایا - مجھے حیرت تھی کہ یہ کیوں اپنی رائے ظاہر نہیں کرتے - خیر جب میں سب کچھ کہہ چکا تو ندم نے ایک اور مضمون پیش کیا - کہنے لگے :-

”آج کل پردے کی بحث چھڑی ہوئی ہے - تمہاری اس کے متعلق کیا رائے ہے - جدید خیال ہو یا کہنہ خیال؟ کہنہ خیال ہوگے، کیوں کہ پردے کی مخالفت تو تم سے قیامت تک بھی نہیں ہونے کی۔“

میں نے کہا - ”بیشک پردے کی مخالفت کون صاحب عقل کر سکتا ہے۔“ ”تو پھر یہ شکایت بھی چھوڑ دیجئے کہ ہماری زندگی میں دلچسپی نہیں۔“

”اس کو پردے سے کیا تعلق؟“

”ایں تعلق ہی نہیں! جب تک پردہ ہے - عشقیہ شادی جس کے آپ اس قدر دل دادہ معلوم ہوتے ہیں ممکن ہی نہیں - وہاں تو یہ ہوتا ہے کہ بڑے تو ماں باپ نے جہاں اُن کا دل چاہا بیاہ دیا چوں کہ چرا کی گنجائش ہی نہیں اور ہو بھی تو کیا، نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ بات کر سکتے ہیں - شادی کیا ہوئی سرکاری نوکری ہوئی - جہاں سرکار کا دل چاہا، نوکر کو بھیج دیا - حاکم کو ماتحت کی خبر نہیں، ماتحت کو یہ معلوم نہیں کہ حاکم کیسا ملے گا - اس زندگی میں راز و بستہ کیسے پیدا ہو سکتے ہیں اور افسانوں کا سا سلسلہ راز آخر میں جا کر کھل کسے سکتا ہے؟ یہ سب سچے

ہمیں ایست انڈیا ریلوے کی ڈاک گاڑی عظیم آباد کی طرف لے جا رہی تھی۔ جہاں میرے دوست محمد نعیم ایم۔ ڈی۔ ایل۔ آر۔ سی۔ پی (کیوں کہ اب مجھے معلوم ہوا کہ اس عرصہ میں محمد نعیم انگلستان جا کر ایم۔ ڈی۔ ہو آئے تھے) کا مکان ہے۔

عظیم آباد پہنچتے ہی ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنی عالیشان اور بے نظیر کوٹھی میں اتارا۔ اور اسی روز اپنے کل احباب کی دعوت کی تاکہ مجھ سے ملائیں۔ دعوت نے بعد سب لوگ باہر چمن میں آ بیٹھے اور ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر یکے بعد دیگرے سب رخصت ہو گئے اور ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔

چونکہ گرمی کا موسم تھا۔ اس لئے رات کا وقت رچاندنی رات صحن چمن اور تھنڈی ہوا ایسی چیزیں نہ تھیں کہ ہم میں سے کسی کا دل اٹھنے کو چاہتا۔ باہر ہی کرسیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ باتوں باتوں میں یہ ذکر آگیا کہ انسان کی زندگی میں ایسے دلچسپ واقعات نہیں ہوتے جن میں ناول کا مزہ آئے۔ میں اس بارے میں بہت بھرا بیٹھا تھا۔ میں نے ناول نویسوں پر نہایت لے دے شروع کی کہ ”تم بخت ایسی ایسی باتیں لکھتے ہیں کہ ہمیں رشک ہوتا ہے کہ ہماری زندگی میں کیوں ایسے واقعات پیش نہیں آتے“ اور بہت ہی کچھ کہہ ڈالا۔ نعیم چپکا سنا کیا۔ صرف ایک

رکھا۔ پہلے سرسید مرحوم نے قبر پر فاتحہ پڑھی پھر کالج کی سیر میں مصروف ہوا۔ ہر چیز کو عظمت اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور جس عمارت پر نظر پڑ جاتی اس میں معر ہو جاتا تھا۔ اس استغراق کی حالت میں ایک نظر ایک صاحب پر بھی جا پڑی جو مدنی طرح معرِ نظارہ تھے۔ اس آپ سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک کوئی ایسی ہی خاص کشش نہ ہوتی میں کالج سے اُنکھ تھوڑا ہی اُٹھانے والا تھا۔ لیکن ان پر نظر پڑنی تھی کہ میں اپنے گرد و پیش کی کل چیزوں کو بھول گیا اور بیتابانہ ان سے جا کر لپٹ گیا۔ اول تو رہ جھکے۔ لیکن پھر استعجاب آمیز ”تم کہاں؟“ کہہ کر مجھ سے لپٹ گئے۔ اصلیت یہ تھی کہ ہم دونوں بچہڑے ہوئے کم و بیش تیرہ چودہ برس کے بعد ملے تھے۔ میں اس بات کو طول نہ دہنگا کہ ہم دونوں کیسے جدا ہوئے تھے اور میں ان تیرہ چودہ برس میں کہاں کہاں رہا۔ مختصر یہ ہے کہ مجھ میں اور میرے دوست محمد نعیم میں بعد المشرقین رہا۔ اور ہم اس زمانے میں ایک دوسرے کے حالات سے بالکل بے خبر رہے۔ میں برہما میں تھا، تو وہ انگلستان میں، اور وہ بھی ایک زائر بن کر علی گڑھ آئے تھے۔ محمد نعیم کو دیکھتے ہی کالج کی سیر کچھ وقت کیلئے موقوف ہوئی۔ اور ایک دوسرے کے حالات دریافت کرنے لگے۔ آخر کار ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو دن بعد

ابتک درد سے پڑھتے ہیں -

پڑے مغفرت کوئی اے ظفر پڑھے فاتحہ کہاں آن کر
 رہ جو توتی قبر کا تھا نشان اُسے ٹھوکر سے مٹا دیا
 نہ معلوم کیا سمجھ کر آپ نے یہ کہا تھا - آپ کے بعد
 یہی ہوا - رنگ-ون میں آپ کی معصوم قبر کا نشان تک
 مٹا اور اس کی جگہ جوگان کا میدان بنا - ہم اب ادھر
 جائیں تو آپ کے مزار کو کہاں دھونڈیں اور اُس کے نشان
 کو وہاں کس سے پوچھیں اور آپ کے نام پر کس طرح
 فاتحہ پڑھیں ؟

انتخاب از خیالستان - از سید سجاد حیدر

ازدواج صحبت

بچہڑے دوستوں سے بھی مل کے کیسی خوشی ہوتی ہے !
 بس خود آپ ہی اندازہ کر لیجئے - آخر کار آپ کا بھی تو ادھی
 درست بچہڑ گیا ہوگا - اور پھر آپ سے اچانک آ ملا ہوگا -
 آپ ہی فرمائیے کیا شادی مرگ کا خوف نہیں ہو جاتا -
 میری بھی واللہ ایک ہفتہ ہوا یہی کیفیت ہوئی - اتفاق سے
 ایک کام کے باعث میرا جانا علی گڑھ ہو گیا - میں کالج کے
 دیکھنے کا عرصہ سے مشتاق تو تھا ہی ، اس موقع کو غنیمت
 جانا اور ایک زائر کی حیثیت سے کالج کے احاطہ میں قدم

اپنا تحریری جواب پیش کرتا ہے - مگر وہ ردی کی تری
 مس دال دیا جاتا ہے - فیصلہ جو ہونا چاہئے تھا وہ ہوا -
 بادشاہ مجرم قرار دئے گئے ! اور کالے پانی سپرد ہوئے -
 رنگون پہنچائے اور وہاں ایک جھوپڑے میں ڈالے گئے - جو
 روز بندہ مقدر ہوا ، کمپنی وہ بھی نہ دیتی تو قسمت کیا
 کر لیتی ؟ تقدیر کا لکھا پورا ہوا اور شاہ ہند برما میں
 ٹکر گدا بن کر رہا - خیر - یوں پانچ سال گزار کر ہمارا
 وہ چراغ دہلی آخر خلدی بنگالہ کے طوفان میں (۱۸۶۲ ع)
 بجھ کر رہ گیا - اور مغلوں کا نام مٹ گیا - رہے نام اللہ کا -
 جہاں پناہ ! آپ ہم سے دور ہو گئے اور ہم آپکے قدموں
 سے الگ ہو گئے - مگر ہم جانتے ہیں کہ آپ ہم کو قید فرنگ
 میں بھی نہ بھولے اور اپنے ملک کو بھی ہمیشہ یاد کرتے
 رہے - حضور کے یہ چند شعر ہم اب بھی پڑھتے اور اپنے اور
 آپ کے حال پر رویا کرتے ہیں -

’مٹی یک بیک جو ہوا پلت‘ نہیں اپنے دل کو قرار ہے
 کروں غم ستم کا میں کیا بیاں ، میدا سینہ غم سے فگار ہے
 شب و روز پہلوں میں جو تلیں ، بہلا خار غم سے وہ یوں گھلیں
 ملا جبکہ طرقِ گلہ اُنہیں ، کہا بدلے گل کے یہ ہار ہے
 تعیمِ خراب حشر ہے ’ایا ظفر‘ تو خدا کے فضل پر رکھ نظر
 تعیم ہے وسیلہ رسول کا ، رہی تیرا حامی کار ہے
 بہادر شاہ ! آپ کا یہ ایک اور شعر بھی آپکے بندے

تمیزدار اور بہلا آدمی ہوتا تو بہادر شاہ کا اُس وقت لحاظ کر جاتا۔ مگر وہ بے ادب اپنی حد سے بڑھا۔ بادشاہ کو معمولی قیدیوں کی طرح شہر میں لے آیا۔ پھر اس نے شہزادوں اور مرشد زادوں کو گرفتار کیا۔ مسٹر ٹومل سن اپنی تاریخ ہند میں اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں۔

'اس کے دوسرے دن ہوتسن نے دو شہزادوں اور ایک کمسن حسین مرشد زادے (پوتے) کو پکڑا اور آخر اُن بے کسوں اور بے گناہوں کو کھڑا کر کے اپنے پستول کا نشانہ بنادیا۔ یہی مورخ پھر کہتا ہے کہ بادشاہ کی معمولی مجرموں کی طرح روبہ کاری ہوئی۔ بغارت کا جرم اُن پر ثابت ہوا۔ قابل دار سمجھ گئے۔ مگر پھانسی دینے کے بدلے کالے پانی بھیج دئے گئے۔

دنیا میں ایسی بے رحمی کی مثال اور بادشاہ اور شاہی خاندان کے ساتھ ایسے سلوک کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اور کمپنی کے ایسے بے ضابطہ اہلکاروں کے سوا کسی اور کی ایسی جرات نہیں پڑ سکتی!

قدرت خدا کی! شاہ عالم کے تھیکہ داروں (کمپنی) کے جج کرسیوں پر بیٹھتے اور اس کا پوتا بہادر شاہ جو دہلی کے تخت کا وارث ہے ایک معمولی مجرم کی طرح اُن کے آگے صفائی کیلئے پیش ہوتا اور ایوان سنت جیمس کی جگہ رہ ایسے ججوں کے اجلاس پر کھڑا کیا جاتا ہے۔ شاہ ہند

بلکہ بے کس ہیں۔ آخر ایک کرسی پر قدم رکھتے اور باغیوں کے خوف سے چند منٹ جلوس کرتے ہیں۔

انگریز ابھی شہر سے ذرا فاصلہ پر ہیں۔ بہادر شاہ کی شاہی کی انہیں خبر پریشان کر دیتی ہے اور آخر دلی پر جان توڑ حملہ کی تہاں لیتے ہیں۔ شہر پر کئی رخوں سے دھارا ہوتا اور پھر کشمیری دروازہ سے ”بزن“ بولتا انکا لشکر بڑھتا اور چاندنی چوک تک قبضہ کر لیتا ہے۔ بادشاہ کو یہ خبر ملتی ہے تو رتہ منگوا کر اُس پر بیٹھتے اور معمولی محلات اور خاص خراصوں کو لے کر شہر سے باہر ہمایوں چلے جاتے اور شہر سے دور رہنے کی فکر کرتے ہیں۔

ادھر انگریزی فوج شہر کا محاصرہ کر کے اپنے پہرے بٹھا دیتی ہے۔ اب بادشاہ کی تلاش ہے۔ ”ہوٹسن“ ہمایوں پہنچتا اور مغلوں کے اس آخری اور تمٹماتے چراغ کو گل کرنے کی جرائت کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ اُس وقت گہرا لباس کہ وہ فقیری کی نشانی ہے، پہنے اور تکیہ قہقہے خاموش زمین پر بیٹھے تھے۔ ”ہوٹسن“ رپ رپ کرتا آتا ہے اور بادشاہ خود کو اُس کے حوالہ کر دیتے ہیں۔

بادشاہ نے اُس وقت بے نظیر صبر و سکون سے کام لیا۔ اُن کا خود کو یوں حوالہ کر دینا اُن کی بے گناہی کی دلیل اور امان کی کسی سفید جھنڈی سے بھی زیادہ تھا۔ کمپنی کے بے تمیز نوکروں اور ”ہوٹسن“ کے سے گنوار کی جگہ اگر کوئی

ہزاروں سال سے شاہی چلی آرہی تھی - بے وقعت تھی -
 محبت تو بڑی چیز ہے - ہندوؤں کو معمولی رغبت بھی
 اُس کی طرف نہ تھی - پھر میسور کی لڑائی، کرناٹک پر
 چڑھائی، پنجاب پر فوج کشی اور اردھہ کی بیگم سے
 زرکشی - یہ باتیں کیونکر بھلائی جاسکتی تھیں - کلیجے پک
 رہے اور نالے اپنے نکلنے کا راستہ ڈھونڈھ رہے تھے - فارسی
 کی ملک بدری اور پھر ملکی زبان اردو کی دربدری جگر
 خون کر چکی تھی - کمپنی سے دل برخاستہ تھے ہی کہ لکھنؤ
 میں راجد علی شاہ پر زیادتی شروع ہو گئی - کمپنی سے
 اور نفرت بڑھی - سنہ ۱۸۵۶ء خیریت سے گذرا - مگر سن
 ستارن کی گرمی نے ملک میں ایک آگ لگادی - مادہ تو
 برس ہا برس سے پک رہا تھا - دمد (کلکتہ) کے کارتوس
 صرف ایک بہانہ تھے - پہلے فوج وہاں بگڑی، پھر کانپور
 میرٹھہ میں غدر نہیں ایک حشر برپا ہو گیا لکھنؤ ذرا بعد کر
 اٹھا اور دیر تک کھڑا رہا - پھر دلی بگڑی اور باغی فوج
 وہاں جمع ہو گئی -

بہادر شاہ اس وقت اپنے گھر یعنی قلعہ میں ہیں -
 بلوٹھی اندر گھستے اور بادشاہ سے مدد مانگتے ہیں - وہ
 ضعیف گوشہ نشین انکار کرتا اور ان سے پیچھا چھڑاتا ہے -
 مگر شریر نہیں سنتے - جان دئیے دیتے ہیں اور بادشاہ کو
 جلوس کرنے پر مجبور کئے دیتے ہیں - بہادر شاہ بے بس

تک تو اُس چال کا پہنچنا محال تھا۔ سنہ ۱۸۳۵ء کے بعد ہی کلکتہ کا وہ فورت ولیم کالج دھم سے گرا۔ نیو مضبوط نہ تھی کیا ٹھہرتا۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں اب دہلی میں ایک اُردو سوسائٹی کی بنیاد پڑی۔ اور ڈاکٹر اسپرنگر (جمن) کی مدد و توجہ سے وہاں اُردو کا کام شروع ہو گیا۔ یہ بھی بہادر شاہ کی نیک نیتی کا پھل تھا کہ اُن کے دور میں وہاں یہ سوسائٹی قائم ہوئی۔ اور اسپرنگر کے ساتھ منشی کریم الدین پانی پتی۔ پندت رام کشن، پندت اجودھیا پرشاد اور ہردبو سنگھ و رام چندر جی کے سے فاضل، تصنیف و تالیف کرتے اور اپنی اُردو کا خزانہ بھرتے رہے۔ یہ سوسائٹی کلکتہ کے فورت ولیم کالج سے اس لحاظ سے بہت بہتر تھی کہ یہاں علمی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں اور وہاں نرے قصے اور بے سود کہانیاں سنائی گئیں۔ دلی کی اس سوسائٹی کی طرف سے مشاعرے بھی ہوا کرتے۔ جہاں عام لوگوں کے ساتھ شہزادے بھی شریک ہوتے اور قلعہ معلیٰ کی خاص زبان شہر میں بھی یوں عام کرتے۔

ہم نے ہندوستانیوں کی ذہنیت کا ایک اشارہ پچھلے صفحوں میں کر دیا ہے۔ یہ ملک سن ستاروں کے عرصہ تک انگریزی شاہی کے زیر نگین نہ تھا۔ کمپنی (ایسٹ انڈیا) تاجروں کی ایک جماعت سمجھی جاتی اور وہی حاکم بنی ہوئی تھی۔ اور اس وجہ سے وہ ہندوستان کے سے ملک میں جہاں

نے معظم شاہ کا حال اُردو نظم میں لکھا اور وہ حد کا مقبول ہوا۔ پھر اسی طرح ان کے فرزند رشید راجہ کالی کرشنا بہادر بھی فارسی و اُردو کے ماهر اور ان زبانوں کے اچھے شاعر تھے۔ ان کی لطائف اُردو پڑھنے اور یاد رکھنے کے لائق تھے۔ یہ بھی راجہ ہیں جنہوں نے انگریزی کے مشہور شاعر "گیکی" کی ایک نظم کا اُردو نظم میں ترجمہ کر کے احسن المواعظ اس کا نام رکھا اور وہ زبان دانوں کی مجلس میں وقعت کی نظر سے دیکھا گیا۔ یہ بھی عالیشان خاندان ہے جو کلکتہ میں 'سورا بازار راج فیملی' کے نام سے مشہور ہوا۔ اور آج بھی اس گھر کا نام بنگالہ کی زبان پر ہے۔ مشہور ٹیگور خاندان نے بھی فارسی و اُردو کی خدمت کی۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ، طوطی بنگالہ کے والد، فارسی اور اُردو کے ماهر سمجھے گئے۔ حافظ کے وہ حافظ تھے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ان ٹیگور کی شاعری میں اسی سے فارسی کا مذاق موجود اور حافظ کے فلسفہ کی جہلک نظر آجاتی ہے۔ یہ کل بنگالی فارسی دان و اُردو دان بزرگوار، اکبری (ثانی) و بہادر شاہی زمانہ کے وہ ابدار موتی ہیں جو خلیج بنگالہ سے نکلے۔ اور دنیا میں چمکے۔

کمپنی کی وہ سیاسی چال اسوقت مردھوپور (بنگالہ کی مغربی سرحد) سے آئے [نہ] بڑھ سکی۔ بہار اُس کے شکار سے جب بچا رہا تو اردھہ کیونکر جال میں آتا۔ اور دلی

اور یہ مررت اسی خاندان پر ختم ہو گئی ! بابر نے ترکی اور ہندی کا جوڑا ملایا ، اکبر نے ہندی کو سراہا ، جہانگیر نے آسے منہ لگایا ۔ شاہجہان نے آسے پال نکالا ۔ عالمگیر نے آسے پروران چڑھایا ۔ بہادر شاہ اول نے آسے جوان کر دکھایا ۔ فرخ سیر و محمد شاہ نے اس کے رقار کو بڑھایا : احمد شاہ و عالمگیر ثانی نے اسے راشٹر بہاشا (ملکی زبان) بنایا ۔ شاہ عالم نے اسے تاج بخشا ۔ اکبر ثانی نے اس کے اس تاج میں پر ہما بھی اریزاں کر دیا اور آخر میں ہمارے ان بہادر شاہ نے اپنے جذبات اس کی زبان سے نکال کر آسے کچ کلاہ بھی بنا دیا ! اور یہ انہیں شاہوں کا صدقہ اور انکا فیض ہے کہ موجودہ حکمران قوم کی اس کے ساتھ ایسی بے رخی پر بھی وہ اس وقت ملک کی ملکہ بنی ہوئی راج کر رہی اور بنگالہ سے پنجاب اور پنجاب سے دکن تک اپنی حکمرانی جتا رہی ہے ۔

یہ سن کر شاید تم کو تعجب ہوگا کہ فارسی اور اردو کے مٹانے کی ایسی تدبیروں کے بعد بھی بنگالہ تک میں وہ اپنا پرانا اثر دکھاتی رہیں ۔ نئے لوگ ، نئی زبان (انگریزی) پر قربان رہے ہوں مگر پرانے خاندان اسپر بہ دستور نثار رہے ۔ کلکتہ کے مہاراج ، راج کرشنا بہادر (مہاراجہ ناراکرشنا ، کے خلف اکبر) کی فارسی دانی بھی مشہور اور انکی اردو دانی تو اتنی بے نظیر تھی کہ انہوں

افسروں کی میزیں صاف کرنے والے تھے اور بس۔ اور اسی برس کی اس جان فشانی اور کڑور کڑور کے خرچ اور بن خدا والی تعلیم سے ملک میں جیسے دماغ پیدا کئے گئے وہ ظاہر ہے۔ اور ان کی بے دماغیوں سے زمین ہند میں گلوں کی جگہ جس طرح کے خار اگتے اور ہمارا دامن نوچتے رہے وہ بھی عیاں ہے۔ اسی تعلیم نے اس ملک میں جانوروں سے زیادہ آدمیوں کا خون حلال کر دیا۔ اور اسی تعلیم نے ہم کو بے زبان کر کے اوروں کا فونوگراف بنا دیا!

سنہ ۱۸۵۶ ع تک بہادر شاہ چین سے تھے۔ اردو کو ان کی خلوت و جلوت میں اُس وقت جو رسوخ رہا اُسے بچہ بچہ جانتا ہے۔ شاہ نصیر و استاد ذوق اور مرزا غالب ہی نہیں بلکہ عام درباری اور حالی محالی تک ادب پر فریفتہ اور اردو کے شیفتہ تھے۔ شہزادے، شہزادیاں، مرشد زادے مرشد زادیاں بھی قلعہ میں بیٹھی اپنی زبان کی خدمت میں اپنا وقت اور اپنی ہمت صرف کرتیں۔ بادشاہ خرد شاعر بلکہ شاعر گر تھے اپنے بزرگوں کی یادگار اور ملکی اور مادری زبان کا جس طرح انہوں نے خیال کیا۔ شاہوں میں اسکی مثال نہیں مل سکتی۔ بادشاہ کے کئی دیوان ہیں۔ وہ چھپ بھی گئے ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں ایسی نظیر نہ ہوندے نہ ملے گی کہ کوئی حکمران قوم اپنی زبان کو سلام کر کے رعایا کی زبان کو یوں تسلیم کر لے۔ یہ رعایت



انگریزوں اور پارلیمنٹ پر ان کا اثر پڑا - اور آخر ایک پالیسی قائم ہو گئی - فارسی تو بہ خوبصورتی کب کی ملک بدر ہو چکی تھی، اب اردو بھی شامت میں گرفتار ہو کر دفتروں سے نکال باہر کی گئی -

نگہ کا وار تھا دل پر؛ تڑپنے جان لگی

چلی تھی برجہی کسی پر؛ کسی کے آن لگی !

ان حالات و واقعات کے جاننے کے بعد ہم کمپنی کو اردو کا خواہ کیونکر مان لیں - اور ایسی روداد کے سامنے رہتے ہوئے اُس کے اہلکاروں کو اردو کا دھرم باپ (گود فادر) کس طرح کہیں؟ یہ بڑی شوخی اور حد کی بے خبری سمجھی جائیگی !

سنہ ۱۸۵۶ء میں اول کیننگ گورنر جنرل ہو کر یہاں آئے ہیں - مکالمے کا وہ مراسلہ ان کے جزدان میں ہے - ملک کی نبض دیکھ کر کچھ کرنا چاہتے ہیں - دانائے فرنگ؛ اب فورت ولیم کے دیدبان سے اب حیات والی وہ لائٹنی دربین اپنی جیب میں رکھ کر ہم پر ہنستا اُتر آتا اور اپنا کام کر جاتا ہے -

اسی سن میں کلکتہ یونیورسٹی، لندن یونیورسٹی کے طرز پر کھڑی کی جاتی، انگریزی پڑھائی اور رنگرزوں کی ایک فوج تیار کرنے کی فکر کی جاتی ہے - یہ بھرتی کے سپاہی نہ گھر کے نکلے نہ گھات کے - وہ صرف اپنے انگریز

کا اتنا رنگ اُنپر چڑھا کہ وہ اچھے خاصے ہندی ہو گئے ۔
چند ہی سال میں اپنی زبان تک بھول گئے ۔ اور جب لارڈ
ولزلی نے اُن سے اُن کا حال پوچھا تو کہا کہ 'ہم اپنی زبان
عواموش کر گئے ۔ اگر حکم ہو تو فارسی میں حال لکھ کر بھیج
دیا جائے' ایسے انگریزوں سے کمپنی خار کھاتی اور انہیں ہندی
بننے سے روکا کرتی تھی ۔

ہم اسے بھی خوب سمجھتے ہیں کہ جب تک یورپیوں
علم و زبان کے دانے نہ ڈالے جاتے، ہندی دام میں نہ
آتے اور یوں جلد رام نہ ہو جاتے

حسن سبزی بہ خط سبز مرا کرد اسیر

دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم !

مگر ہم مکالے پر اعتراض نہیں کر سکتے ۔ اُنکا مطلب ٹھیک
اور اُنکا نقطہ نظر درست تھا ۔ ہم بھی اگر کسی غیر ملک پر
حکمرانی کرتے تو اس سیاسی چال کو نہ بھولتے !

غرض مکالے کا وہ مشہور مراسلہ ولایت میں کئی سال
زیر غور رہا ۔ یہ مکالے جب اپنے وطن واپس جاکر پارلیمنٹ
کے ممبر ہوئے تو وہاں اپنے اس مراسلہ کو آگے بڑھانے کا
انہیں اچھا موقع ملا ۔ یہ اپنی تحریروں کے اعتبار سے دوسرے
برک مانے جاتے اور ایک برق سمجھے جاتے تھے ۔ اُس
(برک) کی شمشیر زبان وارن ہیسٹنگ پر چلی ۔ اور ان
(مکالے) کے قلم کی سنان ہماری زبان کے کلیجہ میں اُترتی ۔

رہتی - بحث و مباحثہ ہوتا رہا مگر ابھی کوئی تصفیہ نہ
 ہوا تھا کہ ممبران بورڈ میں (لارڈ) مکالے کا اضافہ ہوا -
 انہوں نے اس بحث میں حصہ لیا اور رلسن کے اور ان کے چند
 دن بیت بازی بھی رہی - آکسفورڈ یونیورسٹی کے اس طالب
 علم (مکالے) کی شاعرانہ تحریریں اُس وقت انگریزوں پر
 جادو کر رہی تھیں - وہ انکی انشا پردازي میں محو ہو
 رہے تھے - بورڈ نے علم و زبان کے متعلق جو مراسلہ تیار
 کیا اُس میں ان مکالے کی قلم کاری اور شاعری بھی شریک
 بلکہ شریک غالب تھی - مکالے نے ہمارے علوم و زبان سے
 سخت بے خبری پر بھی اُن کی ہنسیاں اڑائیں اور انہیں مردود
 کر کے یہاں انگریزی کے رائج کرنے کی سیاسی وجہیں بتائیں -
 بٹنڈک نے اس مراسلہ کا ساتھ دیا اور وہ ولایت پہنچایا گیا -
 ہم اس سے ناواقف نہیں کہ ادب و زبان کی طاقت
 سب طاقتوں پر بھاری ہے - ہم اس سے بے خبر نہیں کہ جو
 قوم جو لٹریچر پڑھتی ہے وہ اسی کی بولی بولتی ہے -
 ہم اسے بھی جانتے ہیں کہ اگر اُس وقت کمپنی کے اہلکار
 یہاں کے علم و زبان کو پڑھتے تو ہمارے ہم آواز ہو جاتے -
 اس کی مثالیں موجود ہیں - ایک نظیر یہاں سن لو -
 مشہور مورخ مسٹر کین لکھتے ہیں کہ 'جیورج ٹومس یہ
 در باپ بیٹے انگلستان سے ہندوستان آئے اور یہاں رہے -
 انہوں نے ہندوستانی سیکھی پھر یہاں کی تہذیب و معاشرت

فنون کے ذخیرے بھی لے آتی اور اردو کو مالدار کر دیتی -
 بیس پچیس برس کا عرصہ تھوڑا نہیں ہوتا -
 جاپان نے اسی بیس پچیس سال میں اپنی زبان کو کہاں
 سے کہاں پہنچا دیا - اس انجمن کا واقعی مقصد اگر اردو کی
 ترقی ہوتا تو ملک کی کرڑوں کی آمدنی میں سے اُسے اتنا
 حقیر حصہ نہ ملتا کہ وہ بھوکوں مرتی اور اپنا معمولی کام
 بھی نہ چلا سکتی ! انہی گلکرسٹ نے انگریزی اردو لغت
 (ڈکشنری) کی ترتیب دینے کی کوشش کی - مگر وہ کام
 صرف اس لئے اُدھورا رہ گیا کہ نہ کمپنی نے مدد کی اور
 نہ اُن کی قوم نے ! اس سے صاف ظاہر ہے کہ کمپنی کا
 مطلب کچھ اور ہی تھا اور وہ ابھی کہلا جاتا ہے -

سنو—سنہ ۱۸۲۸ ع میں لارڈ بینٹنک (دوسری دفعہ) یہاں
 گورنر جنرل ہو کر آئے - یہی زمانہ گلکرسٹی سوسائٹی کی جوانی
 کا ہے - ان کے تشریف لانے کے ساتھ ’ بورڈ آف ڈائریکٹرز ’ میں
 زبان کا مسئلہ چھڑا - اس کے ایک ایماندار ممبر مسٹر ایم - کریو نے
 اُس وقت ہماری زبان کے متعلق یہ رائے ظاہر کی -

’ اردو کی اس وقت یہاں حالت بہ جنسہ فرنچ کی سی ہے ‘
 کہ وہ تمام یورپ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے - اس
 ایک اردو کے جان لینے سے ایک حصہ ملک سے دوسرے حصہ
 ملک تک بے تکلف آؤ جاؤ کسی مددگار کی ضرورت نہ ہوگی -
 مسٹر کریو کی یہ اکیلی رائے بھی اپنا اثر کئے بغیر نہ

جمایا اور بنگالہ سے پنجاب تک اُس کا شہرا ہوا۔ دانائے
فرنگ نے آب فارسی کو ہنس کر دیکھا اور آخر اُسے دفاتروں
سے (سنہ ۱۸۳۵ ع) خارج کر کے اُردو کو اس کا قائم مقام
بنایا۔ گھر گھر چراغان کیا گیا اور ملکی زبان کی یوں سرزری
پر بھولے بھالے ہندوستانیوں کی طرف سے ملک میں کمپنی کا
دنکا پیتا گیا !

گلرست، لوکت اور ٹیلر (ممبران سوسائٹی) کی اُردو
کے ساتھ وابستگی پر ہم اظہار خوشی کر سکتے ہیں۔ مگر
اس کے ماننے پر تیار نہیں کہ اُن کی وہ سوسائٹی جو فورت
ولیم کالج کے سے شاندار نام سے پکاری گئی۔ ہندوستانیوں کے
لئے مفید اور اُردو کے حق میں ایک کار نمایاں تھی۔ اُس
انجمن کا پہلا کام، عربی و فارسی اور سنسکرت و بھاشا سے
صرف اُن کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کرنا تھا جن کی طرف
اس وقت ہندیوں کو رغبت تھی۔ ایسے ترجموں کے کھیل
تماشوں میں لگا کر اُن قدیم ایشیائی زبانوں سے ہم کو چھڑانا اور
ان کی ضرورت کو کم کرنا تھا ! پھر یہ کوشش صرف کمپنی کے
اہلکاروں کی ایک خدمت تھی کہ وہ اُن ترجموں کو پڑھ
کر اس ملکی زبان (اُردو) سے اتنے آشنا ہو جائیں کہ اپنے
ہندوستانی نوکروں یا زیر دستوں سے معمولی بات چیت کر لے
سکیں۔ اور بھوکوں نہ مریں۔ یہ سوسائٹی واقعی اگر اُردو کو
پڑھانا چاہتی تو ہارون و مامون کی طرح، اس زبان میں علم،

اپنی اپنی قیڑھہ اینٹ کی مسجد بنانا اور اس پر فخر کرنا اپنا دین سمجھا - یہ درٹی پھر تو بڑھتی اور ذرا ذرا سی بات میں نمایاں ہوتی رہی - یہ سیاست قدم قدم چلی اور ہماری ذہنیت کو آہستہ آہستہ بدلتی ہوئی آگے بڑھی - ہماری ذہنیت کی ایسی خوبصورت تبدیلی کے بعد اب مغلوں اور ترقدرمل کی دفتری زبان (فارسی) کا گلا گھونٹ دینا کیا مشکل تھا - مگر دانا جلد باز نہیں ہوتا - مچھلی زور کر کے پھنساؤ نہیں جاتی - تجربہ کار دریا میں اپنی قور اور چارا چھوڑ کر بیٹھ جاتا اور سانس نہیں لیتا ہے - مچھلی نے چارا کھایا اور بھاگی - سمجھی کہ لے آئے - مگر دانا شکاری اُس وقت زور نہیں کرتا - بلکہ تھیل دیتا ہے - مچھلی کے منہ میں قور کا کانٹا ہے جائیگی کہاں؟ وہ پانی میں درزی، دھوپ، آخر تھکی، گرمی اور مزے میں پکڑی گئی - سیاسیات کا جال بھی یوں ہی بچھایا جاتا اور غریب مچھلیوں کو پہلے چارا دے کر تھکایا جاتا، پھر نکال کر اُس کا چھلکا ادھیڑا جاتا ہے !

سرکاری دفتر سے اگر فارسی دفعۃً نکال دی جاتی تو کمپنی خطا کرتی - اس لئے پہلے اُردو کا بازار گرم کرنا تجویز ہوا - سنہ (۱۸۰۰ ع) میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا - کچھ دن اس کا بھی زور رہا - ملک، اپنی ملکی زبان (اُردو) کو منہ پھیلانے مانگ رہا تھا - اس کالج نے اعتبار



بعد، وارن ہسٹینگ (سنہ ۱۷۷۲ ع) کا دور دورا ہوا۔ انہوں نے ایک بہانہ نکال کر، شاہ عالم کا ۲۶ لاکھ سالانہ وہ نذرانہ بند کیا جسکی ادائیگی اس عہد نامہ کی اول شرط تھی۔ اس پر ملک میں ایک ہیجان ہوا۔ اس اضطراب کو دھیمہ کرنے کے لئے، زبان کی نگہداشت کے پیمانہ کو قائم رکھنے کا دھونگ نکالا گیا۔ جون گلکرسٹ نے اس سیاسی چال میں کمپنی کو بڑی مدد دی۔ انہوں نے کلکتہ میں مشرقی زبانوں کی پرداخت کے لئے ایک انجمن یا سوسائٹی قائم کر دی۔ ادھر یہ انجمن دھیمے دھیمے اپنا کام کر رہی تھی اور ادھر وارن ہسٹنگ چپکے چپکے اپنا راستہ نکال رہے تھے۔ انہوں نے کلکتہ میں در کالج قائم کئے۔ ایک سنسکرت کا وہ ہندوؤں کے لئے اور دوسرا عربی و فارسی کا (کلکتہ مدرسہ) وہ مسلمانوں کیلئے۔ اکبر سے لیکر اس وقت تک اس ملک کی تعلیم کا رنگ اور تھا۔ ہندو، مسلمان ساتھ ایک مکتب میں ایک ہی استاد سے پڑھتے۔ ہندو، فارسی خوان و عربی خوان اور مسلمان بھاشا داں و سنسکرت داں بنتے۔ ایک کے ادب (لٹریچر) کا اثر دوسرے پر پڑتا اور اس لئے ایک دوسرے کا غلام نہیں بلکہ بھائی بنا رہتا۔ اس نئی تجویز سے جب در الگ الگ کھڑے ہو گئے تو ہندو اور مسلمان بھی در ہو گئے۔ ایک مکتب میں ساتھ کی تربیت بند ہوئی۔ اور ملک میں در طرح کی تعلیم کھل گئی۔ دونوں نے آخر

کو کس طرح چومتے اور اُس کے آگے کیونکر جھکتے ہیں !!
 ہمارے ایک مشہور خوش قلم نے اُردو کی پرورش اور
 انگریزی میں اُس کی ترقی کا ذکر اپنے شاعرانہ انداز میں
 ایک جگہ یوں کیا ہے -

’ادھر یہ چونچال لڑکا (اُردو) شعرا کے جلسوں میں
 اور اُمرا کے درباروں میں اپنے بچپن کی شوخیوں سے
 سب کے دل بہلا رہا تھا -‘ ادھر دانائے فرنگ جو کلکتہ میں
 فورت ولیم کے قلعہ پر دربین، لگائے بیٹھا تھا، اُس نے دیکھا -
 نظرباز تاز گیا کہ لڑکا ہونہار ہے، مگر تربیت چاہتا ہے -
 تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرتے ہیں، اُس کی
 زبان سیکھنی واجب ہے -‘ (آب حیات)

یہ مزیدار سطوریں تفسیر کی محتاج ہیں - جس وقت کہ
 یہ ذکر ہے وہ شاہ عالم کا اخیر زمانہ ہے - اور دانائے فرنگ
 جب وہ دربین اپنی جیب میں رکھ کر ہم پر ہنسنا قلعہ سے
 اُتر آیا وہ بہادر شاہ کا وقت ہے - اس لئے اس دنوں وقتوں
 کے دانائوں کی دانائی کو بھی درا بتا دینا چاہئے - انگریز
 اور اُردو کے باب میں یہ ذکر دل کھول کر ہوگا - یہاں
 اُس کا خلاصہ سن لو -

جنگ بکسر (سنہ ۱۷۶۴ ع) کے بعد شاہ عالم اور لارڈ کلايو
 کے درمیان جو عہد نامہ ہوا اس کے رو سے اس ملک کے
 علم و زبان کی نگہداشت بھی کہ پنی پر فرض تھی - کلايو کے

کے بندے کیونکر انہیں اپنا مولا و آقا نہ مانتے !

ہماری تاریخ سے قابلہ اور ہماری زبان و ادب سے بے خبر جو چاہیں سو کہہ دیں - ہماری معاشرت و تہذیب کو رہ کیا سمجھیں اور ہماری ذہنیت کو کیا جانیں - انگریز ہماری زبان جانتے ہوتے تو بے خبروں کی نہ سنتے - ہم سے ملتے اور پھر اس ملک میں سو دیرہ سو برس کے اندر آج یوں بے آواز نہ ہو جاتے ! تخت و تاج سے محبت ہماری خور ہے اور ان کا لحاظ ہماری آبرو ہے - ان ہی بہادر شاہ میں ایک شاہی لقب کے سوا اب اور کیا رکھا تھا ؟ مگر ہم نے ان کے گھر کا ہمیشہ ادب کیا اور ان کے آگے بھی سر جھکانا اپنا آئیں سمجھا - ذوق نہیں ، مرزا غالب جن کی آزادیاں اور بے باکیاں مشہور ہیں ، دربار میں بار پاتے ہیں تو سر نیاز خم کر کے ، کہتے ہیں کہ ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے !

دیکھو ، یوں ہمارا دل بولتا اور اس طرح ہمارا دماغ کام کرتا ہے - اُس وقت کو جانے دو - لکھنؤ میں برجیس ، قدری دور کو یاد کرو - غدر میں جب تخت پر بٹھایا گیا تو جب تک دلی سے اسی بے پر بہادر شاہ کا پرروانہ نہ گیا رہ رہاں شاہ اردھہ مانا نہ گیا ! یہ ستر برس ادھر کا قصہ ہے - آج بھی کوئی اُسی آجاز لال قلعہ میں جائے تو تماشا دیکھے کہ اُس کی زیارت کرنے والے وہاں کے خالی تخت

دروکانوں کی سجات، درکانداروں کی لگات اور خریداروں کا جمعیت دیکھنے والوں کو پرانا وقت یاد دلاتا اور بے ساختہ منہ سے نکل جاتا۔ کہ:—

ع۔ جس کی یہ پیری ہے کیا ہوگی جوانی اُسکی
 بادشاہ کبھی کبھی اپنے شہر کی سیر کو بھی نکل آتے
 تے۔ برجے یا ہوادار میں سوار ہیں۔ چوبدار، عصا بردار،
 ماہی مراتب والے اور ہرکارے ہم رکاب ہیں۔ در دولت
 سے سواری چلی اور دنگے پر چوت پڑی۔ نقیب آگے آگے
 بولتے اور ’سواری ہے جہاں پناہ کی۔ ادب سے‘ قاعدہ سے،
 نگاہ زر زر، کی کرتی صدا لگاتے آگے بڑھے۔ شہر میں شاہی
 آمد کی دھوم ہوگئی۔ خلقت ٹوٹی اور سر راہ ایک بھیڑ
 لگ گئی۔ زمیں درز سلام ہونے اور دعاؤں کے نعرے آسمان
 ہالٹے لگے۔ بادشاہ ہر ایک کا سلام لیتے، مسکراتے اور اپنے
 بزرگوں کی رعیت پر نگاہ لطف ڈالتے چلے۔ سواری لوٹی
 اور اسی شان اور ادب قاعدہ سے پھر قلعہ میں پہنچی۔
 اس پر اکثر انگریز مورخین منہ آتے ہیں کہ۔ ’بہادر شاہ
 اب بھی خود کو بادشاہ سمجھتے تھے‘! مگر انہیں یاد کرنا
 چاہئے کہ جب نیپولین، جزیرہ سنت ہلینا میں بیٹھا خود کو
 ”ایمپائر“ سمجھتا اور انگریزوں کا یہ قیدی اُس وقت بھی
 شہنشاہ پکارا جاتا تھا تو اکبر ثانی ہوں یا بہادر شاہ خود
 کو کیونکر بادشاہ نہ جانتے اور ہمارے سے اُن کے چودہ پشت



کیا برد و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
 ہم کو غریب جان نے ہنس ہنس پیکار کے
 دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
 ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجرے دیار کے
 پڑے گے ہوں اور جنہیں سن کر آنسو نکل پڑے ہوں
 وہ اب (سنہ ۱۸۳۷ ع) کس عالم میں ہوگا؟ اُسے رہی بتا
 سکتا ہے جس نے اس کی بہار و خزان درون دیکھی ہو۔
 مغلوں کا یہ آخری چشم و چراغ اپنے بزرگوں کی جگہ
 اُس وقت تخت پر بیٹھا کہ دیوان عام کیسا، دیوان خاص
 تک گل ہو چکا تھا۔ ہاں، اُجرے شاہجہان آباد میں ذرا
 روشنی نظر آجاتی تھی۔ چاندنی چوک لٹا نہ تھا۔ اُسکی
 چوڑ والی نہر لہرا لہرا کر، فلک کو آئینہ دکھا رہی اور اس کے
 ستاروں سے اپنی گود بھر رہی تھی سقے اب بھی للکارتے
 اور اپنے کٹورے بجا بجا کر پکارتے تھے کہ:—

یخ ہو گیا ہے اب، ہوا شام کی کہا کر

پیداسا جو ہو تہندا وہ کلیجہ کرے آکر

جامع مسجد کی سیڑھیاں ابھی تہندی نہیں ہوئی تھیں۔
 شام کو بازار گرم ہو جاتا اور ایک میلہ لگ جاتا۔ اگل بغل سے
 کوئی نہ کوئی بدھا لکڑی ٹیکتا آنکلتا اور اپنی بولیوں
 ٹھولیوں سے خلقت کو اپنی طرف کھینچ لیتا۔ اور اس کے گرد
 ایک تہت لگ جاتا۔ اردو بازار اُس کی بغل میں تھا۔

ہفتہ بھر تک کوئی جواب نہ ملا - صاحب کلکٹر کی طبیعت کچھ ناساز تھی نہ کچھری آئے نہ ڈاک دیکھی - شاہدہ کو ایک ایک دن ایک ایک سال معلوم ہو رہا تھا - سب اسباب باندھے ہوئے تیار بیٹھی تھی - کہتی تھی کسی طرح آکر پہنچ جاؤں - روز اسی اُمید پر شام کرتی تھی کہ آج انشاء اللہ ضرور چھٹی منظور ہو جائے گی لیکن جہاں میاں نے آکر مجبوری ظاہر کی مایوس ہو کر بیٹھ گئی - آٹھویں روز حکم ملا کہ کمشنر صاحب تشریف لانے والے ہیں - دفتر کا معائنہ ہوگا - سردست رخصت نہیں مل سکتی - شاہدہ کو جانے کی ایسی دھن لگی ہوئی تھی کہ میاں کی بھی زیادہ پرواہ نہ کی - بھائی کو تار دیدیا میاں سے مہینہ بھر کا وعدہ کیا - در نوکروں کو ساتھ لے شام کی گاڑی سے چل کھڑی ہوئی اور دوسرے روز حسن پور پہنچ گئی -

انتخاب از مغل اور اردو - از نواب نصیر حسین خیال

بہادر شاہ اور اردو معلیٰ

بہادر شاہ کی تخت نشینی پر آہ اور راہ دونوں طرح کے نعرے بلند ہوئے - وہ قلعہ کے مالک بنے - مگر نہ اب وہ قلعہ ہی دہلی کا مالک تھا اور نہ دہلی ملک کی ملکہ باقی تھی - چالیس پچاس برس پہلے جس شہر کی نسبت لکھنؤ میں یہ شعر -



جس روز سے بھائی کا خط آیا تھا شاہدہ کی آنکھوں میں دنیا اندھیر تھی کہاتی تھی نہ پیتی تھی - دن بھر روتی تھی اور رات بھر جاگتی تھی - میاں کے زیادہ اصرار سے برائے نام کھانا لے بیٹھتی تھی مگر نوالہ اٹھایا اور دل بگڑا - سید کاظم نے صالحہ کی صحت کا خط روانہ کر دیا تھا لیکن شاہدہ کی تقدیر میں رنج اٹھانا تھا وہ نہ پہنچا - بعد میں اسکو جستجو بھی ہوئی مگر وہ ایسا ثابت ہوا کہ پتہ بھی نہ چلا - شاہدہ ابھی تک اپنے ہی خیالات میں مستغرق تھی جو تار پہنچا - تار کی آواز کان میں پہنچی تھی کہ جان نکل گئی - یقین ہو گیا کہ صالحہ رخصت ہوئی میاں کا منہ دیکھتی جاتی تھی اور چہرہ زرد ہوا جاتا تھا لیکن اُس کو تو یہ دیکھ کر ایک سکتہ ہو گیا - میاں نے تار کھولا پڑھ کر ایک قہقہہ مارا اور کہنے لگا ”کچھ کھلاؤ تو ایک خوشخبری سناؤں -“ چاہتا تھا کہ تھوڑی سی خوشامد کرراؤں لیکن شاہدہ کے اضطراب نے اس کو زیادہ ضبط نہ کرنے دیا کھنا پڑا -

”صالحہ اچھی ہو گئی - جمعرات کو غسل صحت ہے - تمکو بلایا ہے -“ صالحہ کی طرف سے شاہدہ کو ایسی نا اُمید ہی ہوئی تھی کہ جب تک میاں نے قسم کھا کر نہ کہا اس کو یقین نہ آیا یقین آنا تھا کہ اچھل پڑی - باغ باغ ہو گئی - میاں سے کہنے لگی ”تم آج ہی کسی طرح چھٹی لے لو اور شام ہی کو چلے چلو -“ کچھری پہنچتے ہی سید ظہیر نے چھٹی کی درخواست کر دی -

محبت طاہرہ سے کچھ ہی کم ہو گئی - اندر جا کر لیت گئی
 اور منہ لپیٹ کر رونے لگی - تھوڑی دیر کے بعد باہر سے میاں
 آیا بیوی کو خلاف معمول لیتا دیکھ کر سیدھا رہیں چلا گیا -
 منہ کھول کر دیکھا تو آنکھ سے آنسو جاری ہیں - پٹی پر
 خط رکھا ہوا ہے - سمجھ گیا کہ کڑی رحشت اثر خبر ہے
 اُٹھا کر پڑھنے لگا - میاں کو دیکھ کر شاہدہ کا دل اور زیادہ بھر
 آیا اُٹھ کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی -

”تین چار دن سے میرا جی گھبرا رہا تھا سمجھ میں
 نہیں آتا تھا کہ کیا بات ہے بھوک تھی نہ پیاس دل آزا
 جاتا تھا - بیسوں طرح کی باتیں دل میں آتی تھیں ایک
 جھکڑ بندھا تھا میں پہلے ہی کہتی تھی خدا خیر کرے - اللہ
 کرے بھائی کے پاس سے خیریت کا خط آئے - میرا دل کہہ
 رہا تھا کہ کچھ نہ کچھ بات ضرور ہے نہیں تو میرا دل
 آج تک ایسا کبھی نہیں گھبرا یا -

میاں نے ہرچند تسلی کی بہتیرا سمجھایا کہ ”تم ابھی سے
 کیوں رو کر بد شگونی کرتی ہو - کیا تم کو خدا کی قدرت پر
 بھروسہ نہیں ہے -“ مگر وہ جتنی زیادہ تشفی کرتا تھا اتنی ہی
 وہ اور بے قابو ہوئی جاتی تھی -

شادی کا دن سر پر چلا آ رہا تھا اور شاہدہ کا پتہ نہ تھا۔ سارا گھر راہ دیکھ رہا تھا۔ سید کاظم خود درون وقت اسٹیشن پر جاتا تھا۔ آمنہ کی آنکھیں دروازے لگ رہی تھیں۔ ساجدہ انتظار کے ساتھ بے قرار ہو رہی تھی کہ خط تو خط تار کا بھی جواب نہ آیا۔ بچے پھوپی کے آنے کی اُمید میں خوشیاں کر رہے تھے۔ ماما میس ڈراسی کھڑکھڑاہٹ پر باہر نکل کر دیکھنے لگتی تھیں تین چار روز تک تو انتظار رہا اور پھر سب کے سب پریشان ہو گئے۔

صالحہ کی بیماری اور اس کی خطرناک حالت کا خط شاہدہ کو پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ اور وہ بہارچ سے بدظن تھی مگر بھتیجی کی دشمن نہ تھی۔ صالحہ کی نا اُمیدی کا جس وقت خط پہنچا ہے اُس وقت وہ بیٹھی ہوئی چارل بگھار رہی تھی جو ماما نے باہر سے لا کر خط دیا۔ بھائی کا خط دیکھتے ہی بالکل بے چین ہو گئی وہیں بیٹھے بیٹھے خط کھولا جتنا پڑھتی جاتی تھی اتنا ہی خون خشک ہوتا جاتا تھا۔ مشکل سے ختم کیا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے چارل چہرے چہرے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ آنکھ میں آنسو تھے اور ہاتھ میں خط۔ آمنہ کا خیال چاہے کچھ ہی ہو مگر شاہدہ کو صالحہ کی

باز پرس کروں - مگر اول تو بچوں کی خوشی ہی نے اُس
خیال کو کمزور کر دیا - رہا سہا بیوی کی اس گفتگو نے
بالکل ہی زائل کر دیا - غصہ اور خفگی گئی گذری ہوئی -
بیوی کی بد مزگی کا ملال باقی رہ گیا - گئے تھے نماز
بخشوانے روزے گلے پڑے - ہزار دقت و خوشامد بیوی کو
رضامند کیا - آئندہ کے واسطے کان پکڑا اور باہر چلا آیا -

کپڑے مصالحے سے فراغت پا کر آئندہ نے زنانے اور سید
کاظم نے مردانے بلارے بھیجنے شروع کئے - سید کاظم کے عزیز و
اقارب دوست آشنا جان پہچان ملا کر ماشاء اللہ اتنے تھے کہ
سعد آباد جیسے تین گاؤں آباد ہو جاتے دس گیارہ روز تک
گھر کی ماماٹیں نوکر چاکر نالی حجام بلارے دیتے پھرے
شادی کا دن آگیا لیکن بلارے ختم نہ ہوئے - قصائیدوں کو
تو شکایت ہی رہی کہ اتنی بڑی شادی میں امام جی نے
ہماری بات تک نہ پوچھی - ہم نام کے قصائی تھے لیکن
امام جی بلاتے تو مفت کھانا نہ کھالیتے ایک روپیہ کا کھاتے
تو دو روپے دیکر آتے - ہم ہی بے غیرت تھے جو دن میں
تین تین دفعہ خیر صلاح کو جاتے تھے - مگر بھائی وہ دعوت
کریں گے امیروز کی جہاں سے مال ملیں ہم غریبوں کو کیوں
پوچھنے لگے -

آمنہ۔ ”میرے جو لینے کا تھا وہ میں لے چکی۔ اب تمہارے
ابا بیٹھے ہیں۔ جو جی چاہے منگوا لو! کہاں تک لئے جاتی
پانسو کا تو ہو گیا خریدے ہی جاتی۔“

سید کاظم۔ ”جہاں اتنا لیا تھا اور دو تین روپے کا لے
لیا ہوتا۔ لے کیوں نہ لیا؟ بیٹی میں ابھی منگوا دیتا ہوں۔
تم دل نہ کڑھاؤ (بیوی سے) تم نے ایک چھوٹی سی شادی
میں ماشاء اللہ پانسو پر نمبر پہنچا دیا۔ بڑی شادیاں ابھی
دور پڑی ہیں۔ ہزاروں پر بھی بس نہ کر دے گی۔“

آمنہ۔ ”اللہ دیتا ہے تو اسی دن کیلئے کام آتا ہے۔ اور
اٹھانے کا کونسا موقع ہوتا ہے جس کا نہ لیتی رہی برا
مانتا۔ دیکھ لو تھائی گز چکن پر کیا بس گھول رکھا ہے۔
تمہارے ہی بچوں کا لیا ہے۔ اور کسی کا تو نہیں بنا لیا۔
میری تو رہی مثل ہے کہ کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے۔“
سید کاظم۔ ”میرا یہ مطلب نہیں ہے! خیر لے لیا اچھا کیا۔

خدا پہننا نصیب کرے۔ تم نے اپنے واسطے کیا لیا؟
آمنہ۔ ”یہ سب میرا ہی ہے اور کس کا ہے۔ مجھے کس
اپنے پہننے کی خوشی اُن سے زیادہ تھوڑی ہو سکتی ہے۔“
سید کاظم اس خیال سے اندر آیا تھا کہ پانسو کی

دروں نے پانسو روپے کا حساب آگے ڈال دیا۔ رہ اپنی دانست میں زیادہ سے زیادہ درسو کا آنکے ہوئے تھا۔ پانسو کی میزان دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی۔ ان کو تو یہ کہہ کر رخصت کیا کہ شادی کے بعد بیباق کررنگا۔ اور آپ جھنجھلایا ہوا گھر میں آیا۔ بیوی کو دیکھا تو سینکڑوں قسم کا کپڑا اور مصالحہ آگے رکھے ہوئے درکان کھولے بیٹھی ہیں اور ایسی خرش ہیں گویا ہفت اقلیم کی بادشاہت ہاتھ آگئی۔

صحن ہی میں تھا کہ ادھر سے ناظم ادھر سے ہاشم اپنا اپنا کپڑا لے کے دوڑے۔ ایک اپنی اچکن کا دکھانے لگا۔ دوسرا اپنے کوت کا۔ اُن کی تعریف کرنی پڑی۔ لڑکوں سے فرصت ہوئی آگے بڑھا اندر پہنچا۔ بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ بیوی نے ایک ریشمی ڈکڑا آگے ڈال کر کہا۔ ”دیکھو کیسا خوبصورت کپڑا نکلا ہے۔“ بیٹھا ہی تھا کہ ساجدہ بولی۔ ”خیر اور تو جو ہے سو ہے مگر پھلام تو پھلام ہی ہے۔“ کچھہ کہنے ہی کو تھا کہ ادھر سے صالحہ بول اُٹھی ”ماشاء اللہ اتنا کپڑا لیا گیا اگر ایک ڈھائی گز کچی چکن میرے کہنے سے لے لیتیں تو کیا حرج تھا ایسا ہی ہوتا تو میں اپنے پاس سے دام دے دیتی۔“

مفت کا سودا مول لینا ہے - واپس کرر تو درکان دار ناک
 بہوں چڑھاتا ہے نہ واپس کرر تو بیوی بگرتی ہیں - مال کا
 نقصان جان کا خلجان - بیوقوف بنے رہ الگ - اس سے بہتر
 یہی ہے کہ یہ جانیں اور ان کا کام - بزاز اور گوٹے والے کو
 بلا کر دروازے پر بھیج دیا - اور خود جاکر کہہ دیا - ”لو اب
 جو تمہاری سمجھ میں آئے رہ لے لو - کپڑا بھی موجود ہے
 مصالحہ بھی بزاز بھی اور گوٹے والا بھی -“

سید کاظم کی دھاک شادی کا غل بزاز اور گوٹے والے کل
 سامان چھانت چھانت کر درکان سے لے آئے اور ماماؤں کے
 ہاتھ بھیجنا شروع کیا - چوٹی کا مصالحہ ایک سے ایک افضل
 کپڑا نئی نئی وضع کی کریمیں دھاری دار پھلام پٹری دار اطلس -
 آمنہ دیکھ کر پھڑک گئی - ساجدہ جیسی بتانے والی صالحہ
 جیسی سمجھانے والی اور آمنہ جیسی لینے والی - کپڑے کے
 آگے کھانا بھی بھول گئی - خدا معلوم کس قیامت کا کپڑا
 تھا - صبح سے درپہر ہو گئی - سید کاظم کھانا کھا کر بھی چلا
 گیا لیکن اسکی خریداری ختم نہ ہوئی - تین بجے کے قریب
 جاکر بزاز اور گوٹے والے کو چھٹکارا ہوا -

ادھر سید کاظم نماز پڑھا کر آیا - بیٹھا ہی تھا کہ ادھر

آباد والے بھی اس میں گرفتار تھے کہ لڑکے لڑکی کا بچہ فقط
سعد آباد والوں سے کرتے تھے - بھیک کے ٹکڑے قبول مگر دوسری
جگہ بیٹی دینی منظور نہیں دونوں پر ایک مار از ر تھی یہی
نہیں کہ بیٹی دیتے نہ تھے لیتے بھی نہ تھے بیٹی آپس ہی
میں رہتی تھی یہاں کی وہاں اور وہاں کی یہاں - یہی وجہ
تھی کہ ظہیر رشتہ میں آمنہ کا چچا زاد بھائی ہوتا تھا -
شاہدہ کی بڑی لڑکی طاہرہ اس وقت نو برس کی تھی -
اُس کی پیٹھ پر کا ایک لڑکا اتر چکا تھا اس سے چھوٹا
مسعود ساتویں برس میں تھا - ایک لڑکی گود میں تھی جو
آمنہ کی چھوٹی لڑکی سے دیرھ برس چھوٹی تھی -

صبح اُٹھ کر سید کاظم نے نماز سے فارغ ہوتے ہی بازار
کا ارادہ کیا - ساتھ ہی خیال آیا کہ عورتوں کے جھگڑے
میں پڑنا مفت کی زحمت ہے - کوئی چیز پسند آئیگی کوئی
ناپسند ہوگی - ایک واپس کرر ایک لاؤ - اس کو پھیرو اُس کو
بدلو - یہ کم ہوگئی - رہ زیادہ - اسمیں یہ عیب اسمیں
رہ نقصان - ایک میں یہ خرابی ہے ایک میں یہ برائی ہے -
بیسویں پھیرے کرر - روپے کا روپیہ صرف کرر - اور مفت کی
تانیکیں توڑو یہ کس خدا نے بتایا ہے اس جھمیلے میں پڑنا

نو گز! پنج رنڱي توڻي ستارون کي کٽوريون کي نو گز! گوکهر نڪا
توڻي ڪے ارڀر کا اٿھارہ گز! نو گز سنھري ڪرن! ايڪ تھان
گوکھر چارون ترنجون اور ڦينڇيون کا۔“

سيد کاظم۔ ”بھت قيمتي جوڙا ھوگيا ڪڍڙا جب اچھا ھ
تو زيادہ مصالحہ کي ڪيا ضرورت ھ۔“

ساجدہ۔ ”مصلحہ نہ ٿانڪو سادہ رکھو (ھنسڪر) تعريف

تو بھت ھوگي ايڪ نئي بات ھ۔“

سيد کاظم۔ ”اب باقي چيزين پھر لکھوانا! آڄ اتوار ھ

اُس جمعرات ڪے بلارے بھيجدر ۱۲ روز ھين۔“

ساجدہ۔ ”اچھي بات ھ۔“

آمنہ۔ ”الھ آباد تو بھيجو۔“

سيد کاظم۔ ”ابھي لو۔“

سيد کاظم نے اسي وقت شاھدہ کو تار ڏيڊيا۔ شاھدہ سيد

کاظم کي چھوڻي بھن تھي اور اُس کا خاوند سيد ظھير الھ آباد

میں سرشتہ دار تھيا اور حسن پور سے گيارہ ميل ڀر موضع

جلال آباد کا رھنے والا تھيا۔ جلال آباد سيدون کي بستي تھي۔

سمـرقندـيون میں بيٽے بيٽي کا لين دين صرف جلال آباد

والون سے تھيا۔ سعد آباد ھي والون کا يہ فرض نہ تھيا جلال

اور پر تک جائے گا ہاں اُسی کے پتے پر تَکے گا چاند کیری۔“
آمنہ۔ ”نہیں! ماہی پشت کا پکا گوکھرر اُتھہ گز لو۔ بلکہ

ایک لچھا اور لو درپتہ کے واسطے چاہئے۔“

ساجدہ۔ ”نہیں بوا کرتہ کا تہپہ نہ رکھو ایک تھان تہپے کا
لکھ لو چار گز کرتہ کا باقی اور کسی کام آجائے گا۔ کارچوبی
توئی چار گز! دس گز پاجامہ کی ہے چار گز یہ کل چودہ گز
کر لو! بیس ۲۰ گز پاجامہ کا پکا گوکھرر ہے اُتھہ گز دونوں
طرف کا کرتہ کا۔ اُتھائیس گز یہ ایک جگہ کر لو! کرن چار
گز! (نند سے) گریبان کا بتاؤ بی؟

آمنہ۔ ”ماہی پشت کا تہپا۔“

ساجدہ۔ ”نہیں! چاروں طرف پیمک کردر پیچ میں تہپہ
چار خانہ کا! گزبھر پیمک دھنک تین گز چارخانہ کی۔“

سید کاظم۔ ”اب ختم بھی کررگی یا نہیں؟“

ساجدہ۔ ”درپتہ کا لکھو! مگر یہ سب مصالحہ اُتھا لینا
تَکرے تَکرے نہ کرنا۔ تین گز ہوائی دریا برے عرض کا
استر کے واسطے گزبھر قند۔“

آمنہ۔ ”استر کیسا؟“

ساجدہ۔ ”(مسکرا کر) مصالحہ کے نیچے کا! چکلی سنجاف

ساجدہ — ”ہائیں تمکو ہو کیا گیا۔ اطلس کا پاجامہ تاروں

کی ارڑھنی؟ کرپ ہی کا درپٹہ بھی کرلو۔“

آمنہ — ”دروں چیزیں ایک ہی کپڑے کی؟“

ساجدہ — ”رنگ بدل در! درپٹے کی گلابی لے لو یا کافوری۔“

سید کاظم — ”کتنی؟“

ساجدہ — ”نو گز تین پات کا۔“

سید کاظم — ”اچھا مصالحہ بتاؤ۔“

آمنہ — ”کلیروں کی پتلی پیمک ایک لچھا چالیں گز کا

دیکھت بھولی کا تھپا رہے گا۔ پانچ لچھے دھنک کے لکھو۔ کارچوبی

توٹی دس گز آئے گی۔ دس گز لہکا جواب کا۔“

ساجدہ — ”لہکا تو چغلی کھائے گا۔“

آمنہ — ”بالے کی بانکڑی لکھو۔“

سید کاظم — ”کتنی؟“

ساجدہ — ”دس گز پکا گوکھرو بیس گز توٹی کے ادھر ادھر کا

بس پاجامہ کا تر ہو گیا اب کرتہ کا لکھو (بہارج سے) گوکھرو

کی قینچی رکھو گی؟“

آمنہ — ”ہاں۔“

ساجدہ — ”ایک لچھا لکھو بیس ۲۰ گز کرتہ کا باقی کسی

آمنہ — ”اچھا تو کیسی سرخ یا سبز؟“

ساجدہ — ”سرخ تو ایک اُس کے جھیز میں ہے سبز لو!“

سید کاظم — ”وہ موجود ہے اُسی کو ایک روز کے لئے کیوں

نہ پہنا دو۔“

ساجدہ — ”ایک سے دو تو ہو جائیں گے۔ ایک ایسا ہوگا

ایک ایسا اس کے ساتھ بھی نبیہ جائے گا۔“

سید کاظم — ”اچھا کتنی؟“

آمنہ — ”سترہ نر!“

ساجدہ — ”نہیں چودہ گز تین گز سرخ گورنٹ پتے کے لئے بلکہ

چار گز اُس کا عرض کم ہوتا ہے اور تین گز استر کے واسطے۔“

سید کاظم — ”اور چلو!“

آمنہ — ”تین گز ریشمیں ململ لکھو۔ پھولدار کرتہ کی۔“

ساجدہ — ”اے ہے تمکو خبر نہیں کیوں پسند ہے۔ ایک

دن میں کرتہ نکل جائے گا۔ صبح کو پہنو شام کو جھیر جھیر۔

دام لگیں پورے اور چیز بنے ایسی کہ دوسری دفعہ کے

لائق نہ رہے۔ کریپ کا بناؤ کیا بری ہے؟“

آمنہ — ”اچھا! تین گز کریپ لکھو پھولدار۔ گل شفتالو۔

اب ارزہنی رہی (نند سے) تار بہرہ اور؟“

ساجدہ — ”بھٹی پلے بچوں کا لکھو - دلہن کا لکھو - میرا
کیا ہے - یہی جو گھر میں پہنے رہتی ہوں یہی پہن کر
بیٹھ جاؤں گی۔“

آمنہ — ”اچھا دھائی گز تو چکن لکھو کرتہ کی اور تین
گز سفید غلطہ پاجامہ کا اور ایک سیلہ۔“

ساجدہ — ”ہاں کیوں نہیں - سیلہ کیا بنارسہ ! اب میری
عمر سیلوں ہی کی تو رہ گئی ہے - ان سفید بالوں پر سیلہ
ضرور کھائے گا۔“

آمنہ — ”کیوں کیا حرج ہے ؟ سارا زمانہ اڑھتا ہے -
ایسا ہی ہے تو سفید منگوالو۔“

سید کاظم — ”اچھا چلو اور بتاؤ۔“
آمنہ — ”اب لڑکی کا لکھو - پنے پاجامہ لکھو (نند سے)
بتاؤ بی آپا ؟ کناریز کا ٹھیک ہوگا؟“

ساجدہ — ”نہیں بیوی - مجھے تو کناریز سے نفرت ہوگئی
ہے ساری دنیا پہننے لگی ہے - اطلس لو پھول دار۔“
آمنہ — ”ہاں مگر دام زیادہ لگیں گے۔“

ساجدہ — ”پھر کیا حرج ہے ایک چیز بھی تو ہو جائیگی -
اسی کو جہیز کا کر دینا۔“

خوڑی سب ہی کو جوڑے دئیے جائیں گے۔ قلم درات لیکر
بیٹھو یا ادھر چلے چلو آپا بھی رہیں ہیں میں بھی ہوں
حساب کر کے بتا دینگے۔“

سید کاظم نے ہاشم کو بلا کر پینسل کاغذ منگوا یا اور چبوترے
پر جا کر بہن کے برابر بیٹھ گیا۔ پیچھے سے آمنہ بھی آئی۔
کہنے لگی۔ ”ہاں بی آپا لو کپڑا اور مصالحہ لکھواؤ کہ
صبح ہی آجائے۔“

ساجدہ۔ ”بھلا یہ لکھوانے کا کونسا وقت ہے پہلے خود بیٹھ
کر حساب لگاؤ پھر لکھوا دینا۔“

آمنہ۔ ”حساب لگانے میں کونسی دیر لگتی ہے میں تو
جانوں ابھی لکھوادو۔ آئے جو تمہاری خوشی۔“
سید کاظم۔ ”ہاں اسی وقت لکھوا دینا چاہئے کہ
صبح ہی لادوں۔“

آمنہ۔ ”اچھا تو تم پہلے آپا ہی کے کپڑے لکھو یہ سب سے
بڑی ہیں ان ہی سے شروع کرنا چاہئے۔“
ساجدہ۔ ”نہیں بی میرا کیا ہے پہلے لڑکی کا لکھو۔ پھر
اللہ رکے بچوں کا لکھواؤ اپنا لکھواؤ۔“

سید کاظم۔ ”نہیں آپا پہلے تمہارا ہی لکھنا چاہئے تم بڑی
ہو۔ لو بولو۔“

شادی ہے۔ ہزاروں بیویاں ہونگی اور امیر امیر۔ اگر ذرا بھی کوئی چیز الٹی سیدھی ہوئی تو سینکڑوں مین میخیں نکالیں گی۔ خیر ان کی پسند کے قابل تو میں بیچاری نہیں ہوں۔ اُن میں تو ایک سے ایک زیادہ ہے لیکن برا بہلا جیسا مجھکو آتا ہے وہ تو تیار کر رکھوں۔“

آج چوبیس برس کے بعد سید کاظم نے بیوی کو اتنی دیر تک گفتگو کرتے ہوئے دیکھا۔ تعجب کر رہا تھا اور اس کے منہ کو دیکھ رہا تھا۔ تکتا رہا اور ہنستا رہا۔ چونکہ وہ اس بات کا مشتاق تھا۔ جب تک آمنہ بولتی رہی اُس نے ہوں نہ کی۔ جب وہ کہہ چکی تو بولا:—

”یہ پہلا اتفاق ہے کہ میں نے تمکو اتنی دیر تک باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ مجھکو خوشی ہوئی زیادہ اس وجہ سے کہ تم نے میری تجویز کو منظور کر لیا۔ کپڑا اور مصالحہ جس قدر بتادو کل ہی منگوا دوں۔“

سید کاظم کے اس فقرے پر آمنہ کو بے اختیار ہنسی آگئی ضبط کیا اور منہ پھیر کر کہنے لگی ”گرمی جاڑے کا کپڑا تھوڑا ہی ہے کہ منہ زبانی بتادوں۔ اللہ رکے شادی کا کپڑا ہے۔ ماشاء اللہ سب ہی کا آئے گا۔ نوکر چاکر، ماماٹیں، سقّہ، دھوبی، حلال

بیاہ کر بھی چوبیس برس ہوئے اور سترہ اٹھارہ برس امان
 جان کے پاس رہی۔ اللہ اُن کو جنت میں مکان دے انہوں نے
 کبھی کسی کا دل نہیں توڑا۔ جب اُن سے کہا اسی وقت آبیٹھیں
 اور سب کے ساتھ درمنیوں کو بیل دیتی رہیں۔ تم کو یاد
 نہیں چھوٹی آپا کی شادی میں رات بھر میرا سنیں گاؤ
 ہیں۔ کیا ابّا جان کو خبر نہ تھی یا باہر آراز نہ جاتی ہوگی۔
 دور کیوں جاؤ ناظم کے ہونے پر برابر ہجڑے بھانڈ آتے رہے۔
 گھنٹوں سر ہوتے تھے اور بغیر لئے نہ تلتے تھے۔ ہمیشہ کچھ نہ
 کچھ دیا ہی جاتا تھا۔ اگر ایک بھی خالی ہاتھ جاتا تو
 دوسرا آکر جھانکتا بھی نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ
 تمہاری صلاح نہ مانوں۔ جس میں تم خوش اسی میں
 میں۔ خدا نہ کرے میں یہ توڑی چاہتی ہوں کہ تمہاری
 عزت میں کسی طرح کا فرق آجائے۔ تم مناسب نہیں سمجھتے
 نہیں سہی۔ تار تو بھیج دو وہ اگر تین چار روز پہلے بھی
 آجائیں گی تو ذرا سینے پر رونے میں ہاتھ بتالیں گی۔ سینکڑوں
 کام کرنے ہیں۔ میں اکیلی کیا کیا کر لوں گی بچوں کے کپڑے
 تھیک کرنے ہیں خود اسکا جوڑا سینا ہے۔ ٹانگنا ہے کل کپڑا
 اور مصالحہ بھی ضرور لادو یا منگوا دو۔ حسن پور کی پہلی ہی

جیسی اسکی ذات تھی ویسے ہی اس نے گن بھی تھے جواب دینا کیسا کبھی اس نے خاوند سے دل کھول کر بات تو کی ہی نہیں آج بھی صالحہ جیسی بیٹی کا غسل صحت تھا جو رہ اس قدر آزادانہ گفتگو کر سکی ورنہ سید کاظم بچارے کو تو ارمان ہی رہا کہ کبھی بیوی اپنی طرف سے کسی چیز کی خواہش کرے - مگر وہ ایسی نیک بندی تھی کہ چہہ بچوں کی ماں ہو گئی اور کبھی آزادانہ میاں سے گفتگو نہ کی - جس بیوی نے بلا ضرورت خاوند سے بات تک نہ کی ہو اس سے کیا اُمید ہو سکتی تھی کہ خاوند کی پُراثر تقریر کے بعد زبان ہلائے - لیکن صالحہ کے اچھے ہونے کی اس کو اتنی زیادہ خوشی تھی کہ وہ سید کاظم کے اس انکار کو اور ان وجوہ پر بلا عذر منظور نہ کر سکی - دو تین منت تک کچھ سوچتی رہی اور پھر کہنے لگی - ”بہوئیں اگر خدا! نخواستہ ساس سسرور کی ناک کٹوایا کریں اور ان کی عزت پر دھبے لگایا کریں تو کیوں تمام زمانہ ایسے ارمان اور چاؤ سے اُن کو بیاہ کر لائے - خدا مجھ کو اُس روز دنیا سے اُٹھالے جب میں اپنے یا تمہارے بزرگ کی عزت پر دھبہ لگاؤں - تم کو مجھ سے زیادہ حال معلوم نہیں ہے - میرے

میں نے آج تک دیکھا نہ سنا کہ ہمارے یہاں کبھی بیہودہ
 رسوم ہوئی ہوں - تم برا مانو یا بھلا میری ہمت نہیں پڑتی
 کہ میں خاندانی اصول میں ترمیم کر دوں - اور ایک
 بے جا خواہش کو پورا کرنے کے لئے اپنے باپ دادا کی پرانی
 روضہ کو ہاتھ سے دیدوں میرے بزرگوں نے نہایت عزت کے
 ساتھ زندگی بسر کی ہے کیا تم گوارا کر سکتی ہو کہ میں
 تھوڑی سی دیر کی اس خوشی کو منظور کر لوں جو میرے
 آبا و اجداد کے خوشنما صاف شفاف دامن پر بدنما دھبہ
 لگا دے - یہ حسن پور والے نہایت مفسد و فتنہ پرور لوگ
 ہیں - اگر ذرا سا موقع بھی گنجائش کا مل گیا اور اعتراض
 کی جگہ پاگئے تو تمام دنیا میں نگر بنادیں گے - یاد رکھو
 تمام حسن پور بدظن ہو جائے گا اور دم بھر میں یہ سب
 عزت خاک میں مل جائے گی - نہیں صاحب میری صلاح
 ہرگز نہیں ہے کہ تم میرا سنوں کو بھی بلواؤ - اور جو تمہارا
 جی چاہے کرو میں منع نہیں کرتا - لیکن اس ایک بات
 میں ساتھ دینا تو درکنار میں اجازت بھی نہیں دیتا۔“

آمنہ ایسی نیک بی بی تھی کہ خدا تمام جہان کو
 ایسی بیوی نصیب کرے - نام ہی کی سیدانی نہ تھی

بھی نہ دے گا - اگر تم کو ایسی ہی خاطر منظور ہے اور زبان کا خیال ہے تو میرا سون کو بلوا لینا دائرہ پر گائیں گی - تم شوق سے شریک ہو، اگرچہ یہ بھی کچھ نامناسب ضرور ہے مگر نہ اتنا کہ قابل اعتراض ہو۔“ سید کاظم نے بیوی کو اتنی اجازت دینے کو تو دیدی لیکن اتنا کہتے ہی بے چارہ ایک سوچ میں پڑ گیا - کچھ دیر غور کرنے کے بعد اُس نے پھر بیوی کی طرف منہ اٹھایا اور کہنے لگا -

”ہمارے خاندان کو ہندوستان میں آئے سو برس سے زیادہ ہوئے - سینکڑوں ہی شادی بیاہ ہوئے ہونگے اور چھوٹی بڑی شادیاں ملا کر تو شاید ہزاروں کا نمبر ہوگا - خدا بخشے دادی اماں کو تو شادیوں کا ازحد شوق تھا - کونسا مہینہ ایسا جاتا تھا جو وہ در ایک شادیاں نہ رچا بیٹھتی ہوں - ذرا ذرا سی بات پر شادیاں کرتی تھیں - میرے مسہل ہوئے - تمہاری فصد کھلی - آپا کا بخار اُترا - ابا جان پردیس سے آئے - عزیز کے ٹیکہ لگا - آئے دن بچوں کے سپارے ختم ہوتے رہتے تھے - آپا کی گریا کا بیاہ اس دھوم دھام سے ہوا کہ تمام سعد آباد میں نام ہو گیا - ایسا ہی کوئی مہینہ ہوتا ہوگا جو در ایک شادیاں نہ کرتی رہتی ہوں مگر

جو چیزیں اس وقت ہیں اُس وقت بھی موجود تھیں
 خدا نخواستہ والد مرحوم تڑگ دل بھی نہ تھے - بڑی بیگم
 صاحبہ اماں جان کی عزت کچھ کم نہ کرتی تھیں - جتنی
 آج تمہاری عزت اس سرکار میں ہے اُن کا میل جول آج تمہارے
 مقابلہ میں زیادہ ہی تھا کم نہ تھا - تمہارے تعلقات
 صرف حسن پور تک محدود ہیں اُن کے پاس فیض آباد
 تک کی رئیس زادیاں آتی تھیں - گو مالی حیثیت اس قدر
 زیادہ نہ تھی تاہم شادی کے بعد دیرھہ ہزار روپے کا کل
 حساب بیباق ہوا ہے سارے چھ سو کی ایک رقم صرف
 منی رام بزاز کو دی گئی تھی - دو سو روپے نقد بڑی بیگم
 صاحبہ نے تم ہی کو سلامی میں دئیے - پس یہ آسانی سے
 ممکن تھا کہ بیس پچیس روپے ناچ گانے کی مد میں
 صرف ہو جاتے لیکن تم ہی سوچو جو بات آج تک ہمارے
 ہاں نہیں ہوئی - اب میں اس کو کس طرح روا رکھ سکتا
 ہوں - اگر ابا جان یا دادا جان کسی موقعہ پر ناچ گانے کی
 اجازت دے دیتے تو اُن پر اس قدر اعتراض ہو بھی نہ سکتے -
 جس قدر مجھ پر ہو سکتے ہیں - اگر آج میرے مکان پر رندی
 یا بھاند ناچ جائیں تو کل کوئی مسجد میں مجھ کو گھسنے

آمنہ نے اقرار تو کر لیا لیکن اس بات کا خیال بھی نہ
 رہا کہ پورا بھی کرسکوں گی یا نہیں۔ خیال آجاتا تو شاید
 شبہ میں پڑ جاتی۔ مگر وہ بے انتہا خوش تھی۔ اور سمجھتی
 یہ تھی کہ میاں بھی سن کر خوش ہی ہوگا۔ یہی سوچ کر
 میاں سے کہہ بھی دیا کہ:— ”اللہ خیر رکھے اب لڑکی نہائے گی
 دن تھوڑے رہ گئے۔ ہوا کچھ بھی نہیں۔ تاریخ مقرر کرو بلاوے
 دینے ہیں انتظام کرنا ہے۔ سب کی سب گانے پر آ رہی ہوئی
 ہیں۔ میں نے تو ہاں کر لی۔ الہ آباد خط لکھو اُن کو بھی
 آخر آنے میں چار پانچ دن لگیں گے۔ گھر سے نکلنا ہوتا ہے تو
 بیس جھگڑے کرنے پڑتے ہیں۔ میں تو جانوں تار در۔
 اُن کے آنے پر دن مقرر کرنا۔“

سید کاظم نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ہاں
 بسم اللہ کرو میں ابھی شاہدہ کو تار بھیج دیتا ہوں۔ انتظام
 کی طرف سے تم بے فکر رہو انشاء اللہ سب کچھ ہو جائے گا
 مگر سنو صاحب ہمارے ہاں ماشاء اللہ اتنی شادیاں ہوئیں۔
 کبھی ناچ گانا نہیں ہوا۔ تم ہی بتاؤ تمہاری اپنی شادی میں
 کس چیز کی کمی تھی۔ ہر طرح اللہ کا فضل تھا۔ روپیہ
 بھی تھا آدمی بھی تھے سرکار بھی تھی۔ ارمان بھی تھا

منا رہے تھے - اُن کی خوشی درست تھی اور مبارکباد
 بجا - رنج میں شریک تھے خوشی میں سانجھا کیوں نہ لڑائے -
 سب ہی قسم کے لوگ تھے - برابر والے بھی بے تکلف بھی
 مرید بھی جو کہتا تھا وہ یہ بھی کہتا تھا - ”امام صاحب
 گانا سنوائے جلسے رچائے - صابر نورا قوال کر بلوائے -“ دل
 سید کاظم کا بھی گدگدا رہا تھا مگر آدمی تھا باخدا -
 عمر بھر کی محنت تھی پچاس برس کی عبادت اُسکو خیال
 پیدا ہوا کہ یہ وسوسہ شیطانی ہے اگر ذرا چوکتا ہوں تو
 یہ سب محنت و ریاضت غارت ہوئی - اس خیال نے
 اس کو گرتے ہوئے سنبھالا ارادے پر لعنت بھیجی اور خدا کے
 سامنے توبہ کی -

ادھر سید کاظم ادھر آمنہ دونوں کا دم ناک میں تھا -
 کاظم کو مردوں نے تنگ کر رکھا تھا اور آمنہ کو عورتیں
 تنگ کر رہی تھیں - آمنہ بیچاری سیدھی سادھی عورت
 بھولی بھالی سیدانی کچھ اونچ نیچ سمجھتی نہ تھی - اس نے
 دیکھا کہ یہ چوٹی کی رئیس زادیاں - بڑی بڑی امیرزادیاں
 اور مجھ سے درخواست کریں - جہت راضی ہوگئی اور
 وعدہ کر لیا -

انتخاب از حیات صالحہ - از مولانا راشد الخیري صالحہ کا غسل صحت، شادی کی تجویز اور فروعات پر میاں بیوی کی گفتگو

بیس پچیس روز بعد صالحہ اتنی ہو گئی کہ خاصی اچھی طرح اپنے پاؤں سے چل پھر سکے ایسے مہلک مرض اور ایسی نازک حالت سے صالحہ کا جانبر ہونا مشکل کیا قریب قریب محال تھا۔ خدا معلوم سید کاظم کی کونسی دعا اور کس رقت کی التجا مستجاب ہوئی ورنہ صالحہ کے مرنے میں کسی کو شبہ رہ گیا تھا۔

سید کاظم کے ملاقاتی میل ملاپی درست آشنا پیر و معتقد ہزاروں کیا سارا شہر ہی تھا۔ شاید گفتی کے درچار مسلمان وہ بھی کون جن کا اسلام برائے نام، روزے سے غرض نہ مسجد سے کام، ایسے ہوں گے جو اُس کو نہ جانتے ہوں۔ اور مشکل ہی سے سو پچاس ایسے نکلیں گے جن کے دلوں پر سید کاظم کا سکہ نہ بیٹھا ہوا ہو۔ تقریباً تمام حسن پور سے اسکا ربط ضبط تھا۔ بیٹی سید کاظم کی اچھی ہوئی اور دل سارے شہر کا خرش ہوا۔ مبارکبادیں دے رہے تھے۔ اور خوشیاں

یہی مناسب ہے کہ تمکو آزادی دی جائے۔ مگر مجھے وہ صورت بہت زیادہ عزیز ہے۔ جو تم پر بنی ہوئی ہے۔ اس لئے جہاں تک میرا بس چلے گا تمہیں جدا نہ کروں گا۔“

میرے اس جواب پر وہ ایک حسرت کے ساتھ خاموش ہو گیا۔ اور میں نے چپکے سے پھر جیب میں رکھ لیا۔ مگر دوسرے ہی دن ملازمان مطبع کا تقاضا ہوا۔ اور اس کے سوا کوئی اور روپیہ موجود نہ تھا۔ مجبوراً میں نے اپنی وہ عزیز چیز نہایت ہی حسرت و یاس کے ساتھ جیب سے نکال کے اُن لوگوں کے حوالے کی۔ مگر دیتے وقت اُس روپے کی طرف خطاب کر کے میں نے کمال مایوسی کے ساتھ کہا۔ ”بے شک وہی ہوا جو تم کہتے تھے۔ میں ہارا اور تم جیتے۔“

لاکے مدینہ طیبہ میں ایک ہندوستانی تاجر کے پاس چوتھائی قیمت پر چھوڑ کے عثمانی سگنوں سے بدلے گئے۔ اور ایک ہی صندوق میں منقل کر کے رکھے گئے۔ جہاں میں در سال تک قید رہا۔

تیسرے برس وہ سوداگر مجھے لے کے بمبئی میں آیا۔ اور چند ہی روز بعد مجھے دے کے اُس نے جی۔ ائی۔ پی ریلوے کا ٹکٹ خریدا۔ وہاں ایک ریلوے کانسٹبل کی تنخواہ میں دیا گیا۔ جس نے ایک شخص کے ہاتھ مجھے اپنے گھر میں بھیجا۔ جو بارہ بنکی کے ضلع میں تھا۔ اُس کی بی بی کے قبضے میں کئی برس تک رہ کے میں بیع و شری کے ذریعے سے پھر ایک پنجابی سوداگر کے پاس آیا۔ وہ مجھے لے کے یہاں آیا۔ اُس نے کلکتے کے کسی کارخانے کے نام سو روپے کا منی آرڈر بھیجا تھا۔ اُسکے ان روپوں میں میں بھی تھا۔ اور یوں داکخانے سے میں تمہارے پاس آیا۔

میرے یہ حالات سن کے تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں رکنے اور تھہرنے والی چیز نہیں۔ اس لئے بڑی مہربانی ہو اگر تم بھی بہت جلد مجھے آزاد کر دو۔“

میں۔ ”تمہارے حالات بہت دلچسپ ہیں۔ اور بے شک

خست انہوں نے اختیار کر رکھی تھی اُس سے مجھے ہرگز
 اُمید نہ تھی کہ وہ مجھے کبھی جیب سے نکالینگے بھی - چنانچہ
 مدینہ طیبہ پہنچنے کو صرف تین دن رہ گئے اور میں انکی
 جیب ہی میں تھا - اُس روز درپہر کو وہ ارنٹ سے اتر کے
 حاجت ضروری کے لئے راستے سے ہٹ کے ایک ٹیلے کی
 آڑ میں گئے - وہاں پہنچتے ہی ایک بدوی عرب نے ان پر
 حملہ کیا - اور وہ اُسکی دست برد سے بچانے کے لئے مجھے
 فوراً منہ میں رکھ کے نگل گئے - بدوی نے انکی یہ حرکت
 دیکھی تو اُسے براغصہ آیا - جھپٹا اور جنبہ کے ایک رار میں
 انہیں قتل کر ڈالا - اور پھر پیت پھار کے مجھے نکال لیا -
 اور میں خان صاحب کے تیرہ ر تار سینے سے اُسی طرح نکلا
 جس طرح حضرت یونسؑ مچھلی کے پیت سے نکلے تھے - خان
 صاحب کا سابقہ روپیہ اُس بدوی کی نذر ہوا جس کے
 ارنٹ پر وہ سوار تھے - کپڑوں کی دو ایک گتھریاں رہ گئی
 تھیں اُن پر اُن کے ایک ہمسفر درست نے اُنکی گتھری کو
 اُنکے گھر پہنچا دینے کا وعدہ کر کے قبضہ کر لیا - یہ حالات
 مجھے اپنے ان ہمراہی روپوں سے معلوم ہوئے جو خان صاحب
 کے پاس تھے - اور اس واقعہ کے چار روز بعد میں اور وہ سب

بنگال کا اور وہاں سے جگناتپہ جی کا سفر کیا۔ لیکن جگناتپہ
 جی میں پہنچنے کو ابھی دو تین منزلیں باقی تھیں کہ ایک
 مسلمان خان صاحب نے قزاقی کر کے آئے مار ڈالا۔ اور اسکا
 روپیہ اور مال و اسباب لے کے گھر کی طرف چلے گئے کہ
 معلوم ہوا سرکار میں اُنکے جرم کی خبر ہو گئی۔ اور پولیس
 تلاش میں ہے۔ آدمی ہوشیار ہے۔ اُسی جگہ اس ہندو کے
 کپڑے اور اسکا سارا مال و اسباب تو ایک بھار کی کھو میں
 ڈال دیا اور نقد روپیہ کمر میں باندھ کے حج کے لئے روانہ
 ہو گئے۔ مجھے اُنکے اس حج پر ہنسی آتی تھی جو ایک
 بیگناہ کی جان لینے کا کفارہ تصور کیا گیا تھا۔ کسی طرح
 ایسے ظالم و غاصب کے ساتھ میں متبرک و محترم مقامات
 عرب میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر کیا کرتا مجبور تھا۔
 اور کشاں کشاں مغرب کی طرف چلا جاتا تھا۔ وہاں خان
 صاحب نے حج کیا۔ اسکے بعد زیارت تربت نبوی صلعم کے
 لئے مدینہ طیبہ کی راہ لی۔ راستے میں انہوں نے خرچ کیلے
 جو دو روپے صندوق سے نکال کے جیب میں ڈالے اُن میں
 میں بھی تھا۔ اور خرش تھا کہ اب ایسے سیہ دل شخص کے
 ہاتھ سے مجھے چھٹکارا ملے گا۔ لیکن سفر حج میں جس قسم کی

نکال کے اپنے محرم میں رکھ لیا - اس کے ایک ہفتہ بعد اُس لوندی نے مجھے اپنے آشنا کے سپرد کیا - اسکی جیب میں درہی چار روز رہا تھا کہ اسکی بیوی کا بھائی ایک سفر پر روانہ ہونے والا تھا - اس عورت نے چرا کر اپنے شوہر کی جیب سے نکال لیا - اور مجھے ایک دھبھی میں سی کے اور امام ضامن بنا کے اپنے بھائی کے بازار پر باندھ دیا - جہاں تلے اریز کٹی روپئے اور بندھے ہوئے تھے - امام ضامن کی رقم عموماً خیرات کے لئے ہوا کرتی ہے - مگر اُس نوجوان نے گھومتے نکلنے کے تیسرے دن ایک سرا میں تھہر کے گلچہرے اُڑانا شروع کئے - خوب سیہ کاریاں کیں - اور وہ امام ضامن کے زریعے جن میں کمبخت میں بھی تھا - عیاشی اور مے کشی میں صرف ہوئے - خلاصہ یہ کہ اب میں ایک کمسن اور خوبصورت بھٹیاری کے درپٹے کے کھونت میں بندھا تھا - بھٹیاری کے پاس سے میں وہاں کے ایک کاشتکار کے پاس پہنچا - جس نے مجھے زمین میں گار دیا - اور پانچ سال بعد جب وہ ہندؤں کے مختلف درشنوں اور تیرتھوں کے مقاموں کی سیر کرنے کے لئے روانہ ہوا تو مجھے کھرد کے نکالا اور اپنی کمر میں باندھا - ہردوار، کاشی، پریاگ میں ثواب کمانے کے بعد اُس نے

لیا۔ میں بھی ایک بھرتے کے قبضے میں آیا جو بلند
 ہند کے مسطح میدانوں سے نکال کے ہمالیہ کی گھاٹیوں میں
 لے گیا۔ اب میں تجارت کے سلسلے میں اُس بھرتے کے پاس
 سے ایک مازراڑی بنٹے کے پاس آیا۔ اُس پر کسی میونسپل
 ”لا“ کی خلاف ورزی میں جرمانہ ہوا۔ جس کی بدولت
 میں اُس کے پاس سے نکل کر سرکاری خزانے میں داخل ہوا۔
 چند روز بعد میں ایک نوٹ کے معارضے میں ایک
 ہندوستانی رئیس کے محل میں پہنچا۔ اُنکا معمول تھا کہ
 دو چار روپے اور دو ایک اشرفیاں ہمیشہ جیب میں ڈالے
 رکھتے مگر خرچ کبھی نہ کرتے۔ چنانچہ میں بھی منجملہ اُن چند
 بد نصیب روپوں کے تھا جو اس طریقے سے ان کی جیب میں
 ڈالے گئے۔ چہ مہینے جیب میں پڑے پڑے گذر گئے اور کسی
 طرح مجھے باہر کی ہوا کھانے کی نوبت نہ آئی۔ ایک
 کنجوس بنٹے کے صندوق سے بھی زیادہ سخت میرے حق میں
 اُنکی جیب ہو گئی۔ مگر اُنہوں نے مجھے پیر ترس نہ کھانا تھا
 نہ کھایا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ جو کوئی مجھے زبردستی
 روکتا ہے اُس سے میں بہ جبر چھینا جاتا ہوں۔ چنانچہ ایک
 دن اُنہیں کی ایک لونڈی نے چپکے سے مجھے جیب سے

اپنے گھر پہنچ گئے - انکا مکان تو کان پور کے قریب تھا مگر
گھر میں دوڑھی مہینے رہنے کے بعد انہوں نے لکھنؤ کی
راہ لی جو ان دنوں بڑا دولت مند شہر تھا - اور جہاں
باہر والوں کی بڑی قدر ہوتی تھی - سفر میں اور گھر میں
انکے بہت سے روپے صرف ہو چکے تھے مگر میں ابھی تک
انکی کمر میں تھا - یہاں پہنچنے کے بعد بھی انہوں نے وہی پرانا
طریقہ اختیار کیا کہ پاس جو جمع تھی اُسے زمین میں دفن
کر دیا - اور جو کچھ کھاتے اس میں کفایت شعاری کی
زندگی بسر کرتے - لیکن یہاں انہیں ایک ہی سال ہوا تھا
کہ غدر ہو گیا - غدر میں وہ اچھے رہے کیونکہ ایک ہندوستانی
رئیس نے انہیں تجربہ کار سمجھنے کے زیادہ ماحوار پر نوکر
رکھ لیا - لیکن جب انگریزوں کا تسلط ہوا تو انہوں نے اپنی
دولت زمین سے کھود کے کمر میں باندھی - اور جناب عالیہ
اور برجیس قدر کے لشکر میں شامل ہوئے نیپال کی ترائی کی
طرف بھاگے - اور جب یہ لشکر منتشر ہوا تو وہ بدحراسی
اور سراسیمگی کے ساتھ واپس روانہ ہوئے - راستے میں
بھوتانیوں کی ایک پلٹن نے انہیں اپنی سنگینوں کا نشانہ
بنایا - اور انکی کمر میں جو کچھ روپیہ تھا کھول کے بانٹ

یہ انقلابات تھوڑے نہیں ہیں - مگر انکے جلد جلد پیش آنے کا اندازہ آپ کو اس سے ہوسکتا ہے کہ میری عمر اس وقت دس ہی برس کی تھی - اُس چور کا لڑکا مولوی صاحب سے فارسی پڑھتا تھا جو اردہہ کے رہنے والے تھے - میں تذخوہ کی مدد میں چور کی جیب سے نکل کے اُن مولوی صاحب کے پاس آیا - رہ بڑے متقی و پرہیزگار بزرگ تھے - اور کسب حلال کے سوا کسی ناجائز چیز کو ہاتھ نہ لگاتے - انہیں کیا خبر کہ اُنکے شاگرد کا باپ چور ہے - اور میں چوری کے ذریعے سے اُس کے پاس پہنچا تھا - مگر جیسی زنجیر عیدے پاؤں میں اُن مولوی صاحب نے دالی آج تک کوئی نہیں ڈال سکا تھا - مجھے پاتے ہی انہوں نے کہو دے زمین میں گاڑ دیا - اور میں چہہ برس تک خاک کے نیچے دبا پڑا رہا - انکا کہانا ایک امیر شخص کے سر تھا - نقد جو کچھ ہاتھ آتا اُسے زمین میں گاڑ دیا کرتے - یہاں تک کہ تقریباً ایک ہزار ہو گئے - تب ان مولوی صاحب نے وطن کا ارادہ کیا - اور مجھے کمر میں باندھ کے حاجیوں کے ایک قافلے کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہوئے - اور بڑے خوش نصیب تھے کہ اس بے امنی کے زمانے میں صحیح و سالم

مہینے وسط ہند کا دورہ کر کے لوت مار میں جو کچھ ہاتھ آتا
 اُسے اُٹھ مہینے تک گھر میں بیٹھکے کھاتے - برہان پور میں
 ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد یہ سب لوگ سارا لوت کا مال
 لے کے ایک پہاڑی مقام میں گئے جو دریائے تاپتی کے کنارے
 تھا۔ وہاں ایک دعوت کی گئی - بہت سی ناچنے گانے
 والیاں بلائی گئیں - اور تین روز تک جشن رہا - جب
 تیسرے دن سب رخصت کر دی گئیں تو یہ لوگ باہم بیٹھ کے
 اپنی لوت کی تقسیم میں مشغول ہوئے - اس تقسیم میں بات
 بات پر اور ہر چیز پر جھگڑا ہوتا تھا - مگر ایک خانصاحب جو
 سب کے سردار اور چودھری تھے تمام نزاعوں کو آسانی سے
 رفع کر دیتے - اور پھر اُنکے فیصلے میں کسی کو عذر نہ ہوتا -
 میں اس تقسیم میں انہیں خانصاحب کے حصے میں آیا -
 چنانچہ وہ مجھے لے کے اپنے گھر میں آئے اور اپنی بی بی کے
 حوالے کر دیا - اس نیک بخت نے جو ایک جوان اور خوشرو
 عورت تھی مجھے اپنے صندوقچے میں بند کیا تو نکالنا بھل
 گئی - لیکن مجھے آزادی کیلئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا -
 کیونکہ تین ہی چار مہینے بعد ایک چور وہ صندوقچہ توڑ کے
 مجھے نکال لے گیا -

پیت پہار کے انہوں نے دفن کر دیا - اور مجھے مال مشترکہ کی حیثیت سے لے کے آگے روانہ ہوئے - چہہ سات مہینے تک میں اُن تہگروں کے ساتھ جن میں بی-رحمی، بے حمیت، بے دردی اور سنگدلی کے ایسے ایسے واقعات دیکھے کہ اپنی زندگی سے عاجز تھا - خصوصاً جب یہ نظر آیا کہ یہ سارے مظالم اور ساری خون ریزیاں فقط میرے شوق میں ہوتی ہیں اور انکا اصلی باعث میں ہی ہوں تو دنیا آنکھوں میں تیرہ و تار ہو گئی اور مجھے خود اپنی صورت سے نفرت معلوم ہونے لگی -

ایک مدت کے بعد یہ سب تہگ اور انکی اور کئی جماعتیں مختلف مقامات سے آکے رندھیاچل پہار کی ایک گھاٹی میں جمع ہوئیں - تمام مال و اسباب اور ساری دولت جوان لوگوں کو جانیں لینے کے انعام میں ملی تھی نکال کے ایک جگہ اکٹھا کی گئی اور اُس کی تقسیم کا وقت آیا تو ناگہان پچاس ساٹھ سوار تلواریں کھینچے ہوئے اُن تہگروں پر آپڑے - سب کو کات کے ڈال دیا - اور مجھے اُس ساری دولت کے ساتھ قبضہ میں کر کے برہان پور میں پہنچے یہ قزاق اور ڈاکو تھے جن کا معمول تھا کہ سال میں چار

سے چھنا چاہتا ہوں۔ مگر ہمیشہ وہ اپنی چالاکوں سے بچ گئے اور مجھے بھی بچالیا۔ اب میں آزادی سے بالکل مایوس تھا۔ اور اس روز روز کے عذاب سے نجات پانے کی کوئی صورت نہ نظر آتی تھی۔ کہ یکایک ایک قرض کی دگری میں پکڑے گئے اور میں زبردستی اُن سے چھین کے ایک بساطی کے حوالے کیا گیا۔

اُس بساطی کو کسی ضرورت سے وسط ہند کا سفر پیش آیا اور مجھے کمر میں باندھے ہوئے گھر سے نکلا۔ دس بارہ منزلوں کے بعد اُسے چند ہم سفر دوست ملے۔ جنسے اس کا خلا ملا بڑھتا ہی جاتا تھا۔ اور وہ روز بروز اُسکے مذاق اور اُسکے ارادوں پر حاری ہوتے جاتے تھے۔ ایک رات کو ایک کوہستانی جنگل میں یہ سب بیٹھے ہوئے حقے کے دم لگا رہے تھے۔ اور لطف و مذاق کی باتوں میں قہقہے اُڑ رہے تھے کہ یکایک اُن سفری دوستوں میں سے ایک نے بساطی کے ہاتھ پکڑے اور دوسرے نے اُسکے گلے میں رومال کا پھندا ڈال کے انا فانا میں اسکا کام تمام کر دیا۔ لاش کے تھنڈے ہونے کے بعد جب اس کے کپڑے اُتارے گئے تو اور بہت سے روپڑوں کے ساتھ بندھا ہوا میں نکلا۔ بساطی کی لاش کو

اسکي قيمت ميں مجھے دے ديا - شراب خانے ميں ايک لونڈا نوکر تھا جو مالک کي آنکھ بچائے مجھے چرالے بھاگا - اور دوسرے دن چکلے ميں جائے ايک بازاری عورت سے منہ کالا کيا - اس طرح ميں چور کي جيب سے نکل کے ايک زانيدہ قحبہ کے قبضے ميں پھنچا - اس نے چار پانچ روز بعد بازار ميں جائے ايک ساري خريدي اور اُسکي قيمت ميں مجھے بزاز کے حوالے کيا - يہ لالہ جي برے کرے اور نہایت کنجوس تھے - اُنکے پاس جائے پھر روپيہ باہر نہ نکل سکتا تھا - کپڑے کي تجارت کے علاوہ سودي روپيہ بھی چلاتے - مگر اس کے ساتھ پابندي تھی کہ کسی کو گھر کے خرچ کے لئے يا مال تجارت کي خريداري ميں يا بطور قرض کچھہ ديتے تو روز کي آمدنی ميں سے ديتے - دے دلائے جو کچھہ بچتا اُسے شام کو ايک برے بھاري لکڑي کے صندوق ميں بند کر ديتے اور رات کو اُسي صندوق کے اوپر ليٹ کے سوتے - بدقسمتي سے ميں انکے صندوق ميں داخل ہوگيا - جس دائمي قيد سے روپئے کو کبھی نجات هي نہ مل سکتی تھی - ميري خوش قسمتي سے چند روز بعد ديوالي آئی - لالہ صاحب کے پاس اتفاقاً اُس دن کچھہ نہ تھا - اور جو

۱۸۳۷ ع میں سریر آراء سلطنت ہوئیں - اور تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی اور تیسرے برس جبکہ انہیں اکیسواں سال تھا یعنی سنہ ۱۸۴۰ ع میں پرنس البرٹ کی دلہن بنیں - اور اسی مسرت و شادمانی کے سال کلکتے کی ٹکسال میں میرا جنم ہوا - جس حساب سے میں شہنشاہ ایدورڈ ہفتم سے ایک سال بڑا ہوں - کیونکہ انکی ولادت سنہ ۱۸۴۱ ع کی ہے - ان باتوں سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اپنی پیدائش کے اعتبار سے میں کیسا خوش اقبال ہوں ؟ کیسا مبارک فال ہوں ؟ جو کوئی ملکہ وکتوریہ کی شادی کے زمانے میں خاص انکی اقبالمندی کا مژدہ سننے کے لئے پیدا ہوا ہو اس سے زیادہ خوش نصیب کون ہو سکتا ہے ؟ مگر میں اور میرے تمام ہم جنس سچ یہ ہے کہ انقلاب عالم کی سیر دیکھنے اور نشیب و فراز زمانہ کی تھوکریں ہی کھانے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں - اس لئے اس مبارک فالی سے میں کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکا -

پیدا ہونے کے درہی چار روز بعد میں دمدم کے ایک گورے کی تنخواہ میں دیا گیا - اس ظالم نے دوسرے ہی دن وہاں کے ایک شراب خانے میں جائے شراب پی - اور

میں — ”فائدہ ہو یا نہ ہو - مگر جہاں تک میرا بس چلے گا تمہیں کہیں جانے نہ دوں گا۔“

وہ — ”میرے لئے یہ کوئی نئی مصیبت نہیں - بارہا ایسی قیدیں جھیل چکا ہوں - اور ہمیشہ یہی دیکھا کہ جنہوں نے مجھے قید کر کے رکھا نہایت ذلیل و خراب ہوئے اور آخر میں انہیں تباہ و حقیر کر کے اُن کی قید سے نکلا۔“

اُسکی زبان سے یہ پُر اثر اور عبرتناک و خوفناک الفاظ سن کے میں نے کہا ”اچھا تم اپنی سرگذشت بیان کرو۔ اور بتاؤ کہ تم پر کیا کیا گزری ہے - ممکن ہے کہ تمہارے حالات سن کے میں اس خیال سے باز آجاؤں - اور تمہیں آزاد کر دوں۔“

وہ — ”اچھا تو سنئے - مگر کان لگا کر سنئے - میرے حالات ایسے مختلف اور عجیب و غریب ہیں کہ انکا خیال کر کے اکثر خود مجھے ہنسی آجاتی ہے - میری ولادت یا میری اس صورت کا جنم بڑی مسرت و شادمانی اور عیش و عشرت کے زمانے میں ہوا - یعنی جس سال ملکہ رکتوریہ کی شادی ہوئی تھی - اُسی سال میں پیدا ہوا - مرحومہ سنہ ۱۸۱۹ ع میں پیدا ہوئی تھیں - اٹھارویں برس سنہ

تم نے یہ بھی نہیں سنا کہ میں اُسکا ساتھی ہوں جسکا اقبال
 ارج و عروج پر ہو۔ جب تک ملکہ معظمہ رکتوریہ کے اقبال
 کا زمانہ تھا میں نے انکا ساتھ دیا۔ اب تو شہنشاہ جارج
 پنجم کا اقبال ہے۔ اس لئے میں بھی اب انہیں کا
 ساتھ دوں گا۔“

میں — ”تو تم نے شاہ ایدورد ہفتم کے اقبال کا کیوں
 نہ ساتھ دیا؟“

وہ — ”اُسکی تو مجھے آرزو تھی۔ کسی نے توجہ نہ کی
 اور میں ایسے ہاتھوں میں تھا جنہوں نے کمال بے رحمی کے
 ساتھ مجھے اس خوش نصیبی سے محروم رکھا۔“

میں — ”تو تم بیوفا ہو؟“

وہ — ”بیشک یہ کوئی نئی بات نہیں۔ سارا عالم جانتا
 ہے کہ روپیہ بیوفا ہے۔“

میں — ”مگر میں ملکہ معظمہ آنجہانی کی محبت میں
 تمہیں وفاداری سکھاؤں گا۔“

وہ — ”چاہے تم زبردستی پکڑ رکھو مگر اس طرح نہ میں
 تمہارے کچھ کام آؤں گا اور نہ تمہیں کوئی فائدہ حاصل
 ہوگا۔ کوئی زبردستی چھین لے گا اور اسوقت پچھاؤ گے۔“

خاموشی سے یہ الفاظ سنے ”مجھے کیوں زبردستی قید کر رکھا ہے؟ میں تھہرنے کے لئے نہیں چلنے کے لئے ہوں۔“

میں۔ ”مگر میرا تو یہ جی چاہتا ہے کہ تم ہمیشہ میرے ہی پاس رہو۔“

رہ۔ ”تم خوشی سے نہ چھوڑو گے تو میں زبردستی چھینا جاؤں گا۔ میں رہنے والی چیز ہی نہیں ہوں۔“

میں۔ ”لیکن آج کل کا زمانہ تمہارے چلنے کے موافق نہیں۔ اب دوسرے روپے کا چلن ہے۔ اس لئے تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ منہ چھپائے ایک جگہ بیٹھ رہو۔ اور ایک کے ہو جاؤ۔“

رہ۔ ”نہ میں مٹنے کی چیز ہوں اور نہ کوئی مجھے مٹا سکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ میری ہڈیت و صورت بگاڑ کے مجھے دوسرا لباس پہنا دیا جائے۔ تو تناسخ کا یہ فطری عمل مجھے دل و جان سے منظور ہے۔ مگر یہ نہیں گوارا کہ پاؤں توڑ کے ایک جگہ بیٹھ جاؤں۔“

میں۔ ”لیکن مجھے تو تمہاری یہی موجودہ صورت و وضع پسند ہے۔“

رہ۔ ”ہوا کرے۔ زمانے کو تو نہیں پسند۔ اور کیا

کے سکے کا تھا۔ میں شکرگزار ہوا کہ اُس نے مجھے میری عزیز چیز لائے دی۔ اور وہ احسانمند تھا کہ جس روپئے کو اکثر لوگ پھیر دیتے ہیں میں نے لے لیا۔ بہر حال میں نے اُس روپئے کو لیا اور سب روپئوں سے الگ کر کے اور حرز جان بنائے جیب میں رکھ لیا۔ جب تنہائی میں موقع ملا اُسے نکال کے دیکھتا۔ اُسکے نقش و نگار اور ملکہ موحومہ کے خوبصورت چہرے پر غور کرتا اور خوش ہوتا۔ چارہی پانچ روز میں میری نظر کی مقناطیسی قوت بلا ارادہ حرکت میں آئی اور وہ روپیہ اور وہ صورت جو اُس پر نقش تھی میری آنکھوں کے سامنے اس طرح قائم ہو گئی کہ ہٹاتا ہوں تو تکلیف سے ہٹتی ہے اور میں اُسکی طرف توجہ کروں یا نہ کروں جب اُسکا جی چاہتا ہے ایک بے تکلف مہ جبین کی طرح خلوت گاہ تصور میں چلی آتی ہے۔ اور جب تک جی چاہتا ہے سامنے رہتی ہے۔

اسی حالت میں ایک دن میں نے اُس روپئے کو جیب سے نکال کے نظر کے سامنے کیا تو خیال کے کان بجنے سے لگے۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ کچھہ کہتا ہے۔ میں نے مراقبے کی شان سے آواز پر کان لگا دئے۔ اور اُس روپئے کی زبان

بھولا اور سادہ جوڑے دار چہرہ ہی زیادہ عزیز ہے مگر میری
 بدقسمتی سے گورنمنٹ اب اُسی روپے کی دشمن نظر آتی ہے ۔
 سرکاری ہاتھوں میں پہنچتے ہی وہ کٹ ڈالا جاتا ہے ۔ بازار
 میں اُس پر بعض لوگ ہتھ لگا لیتے ہیں ۔ ریلوے والے اُسکے
 لینے سے انکار کرتے ہیں ۔ یہ حالت دیکھنے کے مجھے اندیشہ
 ہو چلا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ چند روز میں میری مشتاق
 آنکھیں اس خوبصورت چہرے اور اس پیارے سگے کے دیکھنے کو
 ترسنے نہ لگیں ۔ اس اندیشے سے چاہتا ہوں کہ اس کے
 روپوں کو روک کے رکھوں ۔ تاکہ دستبرد زمانہ سے محفوظ رہے ۔
 اور کسی ایسے کے ہاتھ میں نہ پڑے جو اُسے مٹا کے رکھ دے ۔
 مگر خدا جانے کسی فقیر کی بددعا ہے یا اپنی شامت اعمال
 کہ روپیہ میرے ہاتھ میں کسی طرح ٹھہرتا ہی نہیں ۔ آیا اور
 گیا ۔ ہزار روک روک کے رکھتا ہوں ، مٹھیاں کستا ہوں ، مگر
 کسی نہ کسی بہانے نکل ہی جاتا ہے یہی بے مائگی (جس کا
 ملال مجھے اپنی مفلسی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے تھا
 کہ ملکہ وکٹوریہ کے پیارے چہرے کا کوئی روپیہ میرے پاس
 نہیں رہا) ایک دن زیادہ دلگیر بنائے ہوئے تھی کہ ڈاکیے نے
 لاکے چند روپے دئے جن میں ایک روپیہ اتفاقاً اُسی سنہ ۱۸۴۰ء

ممکن ہے؟ جب مجھے ملکہ رکتوریہ سے محبت ہے تو اُنکے اقبال مند بیٹے اور پوتے سے بدرجہ اولیٰ ہونی چاہئے۔ تاہم مجھے یہ کہنے میں تامل نہ کرنا چاہئے کہ رکتوریہ سے ایک خاص قسم کا اُنس ہے جسکی وجہ سے میں اُنکی ہر یادگار کو زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ اُنکی تصویریں۔ اُنکے عہد کے تمغے۔ اور اُنکے دور کے سگے دیکھے کے میرے دل کو بے حد مسرت ہوتی ہے۔ جب کسی سے روپیہ لیتا ہوں تو ملکہ رکتوریہ کے سگور کے روپئے چھانت کے نکال لیتا ہوں۔ افسوس سرکاری خزانہ ان روپئوں کو گلا گلا کے معدوم کئے دیتا ہے۔ اور یہ عمل اس سختی اور مستعدی سے کیا گیا کہ اب بازار میں ملکہ معظمہ کے نام کے سگے آدھے رہ گئے ہیں۔ اور جہاں کہیں سے روپئے ملیں اُن میں زیادہ تعداد شاہ ایدرہ ہفتم کے روپیوں کی ہوتی ہے۔ مگر میں جھوٹ نہ کہوں گا کہ مجھے یہ روپیہ پسند نہیں۔ میری ہمیشہ یہی کوشش رہتی ہے کہ میرے پاس وہی روپئے ہوں جن پر کوئین رکتوریہ کا پیارا چہرہ بنا ہو۔ تاجدار چہرہ اُن لوگوں کو مبارک رہے جو شان و شوکت اور دھوم دھام پسند کرتے ہیں۔ یا کسی خط میں مبتلا ہیں۔ مجھے تو ملکہ رکتوریہ کا

اچھا اے رازداران قدیم نہ بولو - ہم بھی دیکھتے ہیں
 کہ تم کب تک نہیں بولتے - ایک ایسا دن آنیوالا ہے کہ
 تمہیں خواہ مخواہ بولنا پڑیگا - عرصہ حشر اور روز جزا میں
 اُس حضرت رب العزت کے دربار میں تم کو اگلوں کے تمام
 کارناموں کی گواہی دینا پڑیگی - جو کچھ دیکھا ہے کہنا
 اور بتانا پڑے گا - اس لئے تم ہم سے نہیں بولتے تو جاؤ ہم بھی
 تم سے نہیں بولتے - آج نہیں تو اُسی روز ہم تمہاری دلچسپ
 داستان سن لیں گے اور یاد رکھو کہ بے سنے نہ رہیں گے -

(د) ایک روپیہ کی سرگذشت

مجھ ملکہ معظمہ مرحومہ کوئین رکنوریہ سے بے انتہا
 محبت ہے - اُنکے اوصاف حمیدہ اور اُنکی نیک نفسی و
 غریب نوازی کے جو واقعات سن چکا ہوں اُنہوں نے مجھ
 اُن کے نام کا شیدا بنا دیا ہے - اس سے کوئی صاحب یہ
 نتیجہ نہ نکالیں کہ میں کنگ ایڈورڈ مرحوم یا اپنے موجودہ
 قاجدار حضور جارج پنجم کو ناپسند کرتا ہوں - بھلا یہ کیونکر

کہتا ہے کہ نہیں وہ کوئی اور ہی قوم تھے - اگرچہ اُنکے حُلّے
 رسم و رواج اور عادات و اطوار بنی سام سے ملتے جلتے ہیں
 مگر اطمینان نہیں ہوتا - تم ذرا زبان ہلاکے اس معمعہ کو
 حل کردو - تمہیں اُن کی ابتدائی حالت - انکی وضع قطع
 اور وہ سرزمین جہاں سے وہ آئے تھے یاد بھی ہوگی -

سکندر سے پہلے اور بھی بہت سے فاتحین ہندوستان میں
 آئے - فراعنہ مصر اُسائرس اور سبیسنا سنزیس - ملکہ بابل
 سمیرامیس - تبایعہ یمن میں سے بھی بعض زبردست فاتحین -
 قاتار کے مغل فرماں رواؤں میں سے اُغاس اور سیاکزارس -
 تاجدارانِ ایران میں سے فریدون - کیخسرو - افرا سیاب - گشتاسپ
 اور نوشیروانِ عادل ہندوستان پر اپنی اپنی باری حملہ
 اور حکومت کرنے والے بتائے جاتے ہیں - مگر ٹھیک
 طور پر نہیں معلوم ہوتا کہ ان لوگوں کے دعوے کہاں تک
 قابلِ تسلیم ہیں - ان سب زمانوں اور یہاں کے آنیوالوں کی
 آمد کو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے - مگر افسوس تم
 جواب نہیں دیتے - جس خموشی سے ان سب لوگوں کے
 واقعات کا تماشہ دیکھتے رہے ہو ہمارا تماشہ بھی دیکھ رہے
 ہو - مگر کہتے کچھ نہیں - گویا خدا نے تمہیں فقط دیکھنے کے
 لئے بنایا ہے بتانے کے لئے نہیں -

ہوگی - آدم و نوح کے درمیان جو زمانہ گذرا اسکی کیفیت ہمیں بالکل نہیں معلوم - تم لب ہلاؤ تو معلوم ہو۔

اچھا یہ بتاؤ کہ طوفان نوح یہاں بھی آیا تھا یا نہیں؟ اور آیا تھا تو کسی قدر؟ اُسکا پانی تمہارے کہاں تک پہنچا تھا؟ تمہارے قرب و جوار میں بھی کوئی شخص اُس عالمگیر طوفان سے جانبر ہوا تھا یا حضرت نوح کے سوا دنیا میں کوئی نہیں بچا؟ ضرور نے جب آسمان تک پہنچنے اور آسمان والوں سے باتیں کرنے کیلئے ایک نہایت ہی اونچا برج بنوایا ہے وہ تو تمہیں یاد ہوگا؟ اگرچہ درمیان میں بہت سے پہاڑ حائل ہیں مگر چونکہ تمہارا سر سب سے زیادہ اونچا ہے اس لئے دور سے تم نے اُس برج کو دیکھا ضرور ہوگا - خدا کیلئے بتاؤ کہ وہ کیسا تھا اور کس شان کا تھا؟

حضرت ابراہیم کی ولادت اور انکے نشور نما کا حال شاید تم کو نہ معلوم ہو۔ کیونکہ یہ تم سے دور کی باتیں ہیں۔ مگر ہندوستان کے اگلے حالات تو سناؤ۔ آریہ لوگوں کے آنے سے پہلے یہاں کون لوگ رہتے تھے؟ اور وہ کس گروہ سے تعلق رکھتے تھے؟ کوئی کہتا ہے کہ وہ سمٹک (بني سام) یعنی عربوں اسرائیلوں اور بابل والوں کے ہم قوم اور بھائی بند تھے۔ اور کوئی

اسے دیکھنے والے یا تو یہ آسمان کے شب زندہ دار تارے ہیں
 ارر یا تم ہو۔ تارے بھی اپنی جگہ سے رینگتے ارر چلتے پھرتے
 رہتے ہیں۔ اُنکی آنکھیں بھی جھپک جاتی ہیں۔ مگر تم
 جس وضع سے کھڑی ہوئی تھیں اُسی وضع ر قطع سے آج تک
 کمال استقلال کے ساتھ کھڑی ہوئی ہو۔ لہذا اگلی سرگزشتیں
 جیسی تمہاری نظر سے گزری ہیں کسی کی نظر سے نہیں
 گذریں۔ تم نے سب ہی کچھ دیکھا ہے۔ لیکن افسوس غضب
 کی بات ہے کہ تم بولتی نہیں۔

بتاؤ تو سہی کہ انسان کی تخلیق سے پہلے دنیا کی کیا حالت
 تھی؟ ارر جب آدمی نہ تھے تو یہاں کون لوگ بستے تھے؟
 کبھی تم نے عزازیل کو بھی دیکھا تھا جسے سنتے ہیں فرشتے
 دنیا سے پکڑ لے گئے تھے؟ وہ کہیں تمہارے ہی اُس پاس تو
 نہیں رہتا تھا؟ اگلے زمانے کے راکٹشوں سے اُسکا حلیہ بہت
 کچھ ملتا جلتا معلوم ہوتا ہے۔ تخلیق آدم کی کچھ کیفیت
 سناؤ۔ سنتے ہیں کہ وہ تمہارے سامنے اتر کی طرف سیلوں
 کی ایک چوٹی پر گرے تھے۔ جہاں آج تک اُن کا نقش قدم
 بنا ہوا ہے۔ جب اتنے زور سے گرے کہ پتھر میں ایسا گہرا
 نقش قدم بن گیا تو اُنکے گرنے کی دھمک تم تک ضرور پہنچی

اس ذوق و شوق اور ہمارے اس خلوص عقیدت کو دیکھ کے
بھی تمہیں اتنا ترس نہیں آتا کہ ہمیں اپنے قریب آنے
درو؟ کیا اپنے دنیوی معشوقوں کی طرح تم سے بھی ہم کچھ
امید نہ رکھیں؟

اچھا ہمیں اپنے پاس نہیں آنے دیتے - یا یہ سمجھتے
ہو کہ ہمارے قدم سے تمہارا پاک خلوت کدہ ناپاک ہو جائیگا -
یہ نہیں پسند کرتے کہ تمہارے حسینوں کی بارگاہ حسن تک
ہماری رسائی ہو - تمہارے آغوش میں سونیوالی دیویوں کے
معصومانہ چہروں پر ہماری ناپاک نظر پڑے اور راجہ اندر
کے اکھارے کا تماشہ دیکھ سکیں - آسمان کی کسی دلربا
حور کے چہرے پر ہماری نظر پڑ جائے - یا آسمان کی اُس
خزینہ گاہِ آرزو سے ہم کوئی اپنے مطلب کی تمنا یا ہوس
چرالے بھاگیں - یہ باتیں تمہیں نہیں منظور ہیں تو نہ سہی
مگر خدا کے لئے دور ہی سے سہی اپنی خموشی کا قفل توڑ کے
دور ایک باتیں تو کرلو -

جب سے دنیا بنی ہے تم یوں ہی سر اٹھائے کھڑی ہو -
اور دنیا کی نیرنگیوں اور اس کے انقلابات کا تماشہ دیکھتی
رہی ہو - دنیا میں اس وقت تک جو کچھ ہوتا رہا ہے

”ایجاد بندہ“ کا مرض ہے۔ اس کے قدم یقیناً قدرت کی اچھوتی بہار کو ناپاک کر دیتے ہیں۔ اور اسکا جہاں گذر ہوتا ہے بغیر دخل در معقولات دئے نہیں رہتا۔ مگر ہم سے قسم لے لو۔ جو تمہاری سادگی اور ازلی نفاست میں ذرا بھی ہاتھ لگائیں۔ ہم تو اول درجہ کے نیچر پرست ہیں۔ اور اس قدرتی بہار کے دیکھنے اور قدرت کے بے تکلف چمن کی سیر کرنے یا یوں کہئے کہ اُس بے تکلفی کے حرم میں حاضر ہو کے اپنا حق عبادت بجالانے ہی کے لئے وہاں آنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی بھی وہاں تک آنے کا مستحق ہے تو رہ ہم ہیں۔

تم نے یہ بھی دیکھا کہ جو ندیاں تمہاری خلوت گاہ اور تمہاری اس سدا بہار جنت سے اتر کے ہمارے یہاں آتی ہیں انکی ہم کیسی قدر کرتے ہیں؟ ہم میں سے اکثر لوگ انکی پرستش کرتے۔ انکے پانی سے اپنی جسمانی کثافت ہی نہیں اپنی روحانی نجاستوں کو بھی دھو کے گناہوں سے پاک و صاف ہوتے، اور ان پر بیش قیمت قربانیاں چڑھاتے ہیں۔ اور محض اس خیال سے کہ ”حدیث عہد بر بڑا“ یعنی خدا کے پاس سے ابھی ابھی چلی آتی ہیں۔ ہمارے

طرح پیچ و تاب کھانے والی بیلوں نے اُس فرش پر نہایت
 ہی نظر فریب نقش و نگار بنا رکھے ہیں - عالم بالا سے آنیوالی
 اور لہرا لہرا کے بہنے والی نہروں اور جابجا گر گئے مچل
 جانے والی آبشاروں نے تمہارے آنہیں پرفضا دامنوں میں
 کہیں گوٹے اور لچکے کی لہریا بنا رکھی ہے - اور کہیں
 مقیش کی جھالریں تانکدی ہیں - نغمہ سنج طیور گلبذوں پر
 بیتہ بیتہ کے پھولوں کے حسن کی تعریف کرتے اور عشق
 کی داستان چھیڑتے ہیں - غزالان صحرا اپنی خوش فعلیوں
 سے لیلی اداؤں کی خرام ناز کی بہار دکھاتے ہیں - الغرض
 اے بے رحم اور سنگدل پہاڑو! وحوش و طیور تک کو
 تمہاری اُن مسرت و عیش کی خلوت گاہوں میں بار ملتا ہے -
 اور نہیں ملتا تو ہمکو!

شاید ہمارا یہ قصور ہو کہ انسان ہر جگہ اپنی ہنرمندی
 کے کرشمے دکھاتا اور قدرت کے سچے سادے اور بے تکلف حسن
 کو اپنے تکلفات کا زیور پہنا کے بہدا کر ڈالا کرتا ہے - اور تم کو
 اس سے نفرت ہے - تم چاہتے ہو کہ تمہارا باغ قدرتی محاسن کا
 اچھوتا اور پاک و صاف حرم بنا رہے جسکو مخلوق کی کاریگری کا
 ہاتھ چھو بھی نہ جائے - تمہارا یہ خیال صحیح ہے - بیشک انسان کو

داستانیں ہر قوم و ملت کے داستان گویوں سے سنی جاتی
 ہیں ان کا نشیمن تمہاری ہی بلندیوں پر ہے - ہم میں سے
 بہتوں کو یقین ہے کہ جنت کی حقیقی اور ابدی مسرتوں کا
 سرچشمہ ”کیلاس“ کہیں تمہارے ہی پاس ہے - اکثر رنگ
 برنگ اور خوبصورت بادلوں کا ہار تم اپنے گلے میں پہن
 لیا کرتی ہو - جس سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ اندر کا تخت
 بھی تمہاری ہی بلندیوں پر بچھا کرتا ہے - اور وہیں انکی
 عشرت گاہ میں آئے آسمان کی حوریں اور قاف کی پریاں
 ناچتی اور حسین و ناز آفرین دیویاں اپنا جلوہ دکھایا کرتی
 ہیں - سرور شان سے اتنی قربت اور اس کے ساتھ یہ لطف
 اور یہ روحانی مسرتیں ! کاش ہماری بھی رسائی ہوتی !
 تمہارے پہلوؤں اور دامنوں میں جو مسطح اور خوش
 سواد قطعات زمین ہیں ان میں قدرت نے عجیب و غریب
 نرہت بخش و فرحت افزا چمن لگا رکھے ہیں - جن کے باغبان
 انسان نہیں فرشتے ہیں - طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے
 ہیں - سبزہ خوابیدہ نے مخمل سبز کا فرش بچھا رکھا ہے -
 ہزار ہا رنگ کے عجیب و غریب گل بوٹوں - کسی مست
 خرام کی طرح جھومنے والے پودوں - اور کسی زلف برہم کی

تمہاری اُس بالائی خلوت گاہ تک بارمل جاؤ تو فرشتوں کی باتیں سننے لگیں۔ اور ان پر شوق آنکھوں سے جو دینوی حسن کے ہزاروں کرشمے دیکھے چکی ہیں حوروں کے جمال جہان آرا کی زیارت کر لیں۔ جنکے شوق میں ہمارے نیکوکاروں نے اپنی زندگیاں تلخ اور اپنے دوستوں کی صحبتیں بے مزہ کر رکھی ہیں۔

مگر افسوس تمہاری سرد مہری اور سرد مزاجی کسی کو پاس نہیں پہنکنے دیتی۔ یوں دیکھنے کے لئے تم لاکھ خوبصورت اور دلکش ہو مگر جو تمہارے پاس آنا چاہے اُسکے حق میں سچ یہ ہے کہ تم بڑے بے رحم ہو۔ اس پیاری صورت پر یہ بے پروائی اور اس تقدس مآبی کی سادی وضع پر یہ سنگدلی اچھی نہیں۔ مانا کہ تم حسین ہو، اور حسینوں کو اپنے چاہنے والوں کے ستانے ہی میں مزہ آتا ہے۔ مگر تمہارا حسن و جمال اُس قسم کا نہیں کہ اُس پر بے رحمی اور شرخ ادائی زیب دے۔

اگلے دنوں جب اس عالم اور اُس عالم میں اتنی غیریت نہ تھی تم ہی دیوتاؤں اور دیویوں کا مرکز تھیں۔ اور آج بھی سن رہے ہیں کہ وہ عالم آشوب حسن والی پریاں جنکی

تمناؤں کا خزانہ بلکہ ہماری دنیا داری و نیکو کاری کا مرجع
و ماری ہے تم سے بہت قریب ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
گویا تم ہی فرد بان حقیقت ہو - اور وہ سیتڑھیاں ہو جن پر
چڑھ کے ہم عرش معلیٰ کے قریب تک پہنچ جائیں گے -
لیکن افسوس یہ سیتڑھیاں لگا دینے پر بھی تم نے ہمارا راستہ
بند کر رکھا ہے -

عالم بالا اور اُس سرور شانِ نور سے قریب ہونے کی
یہ برکت ہے کہ تمہیں اُس محترم عالم نور سے تقدس مآبی
کا سفید خلعت عطا ہوا ہے - اور تم پر رلیانہ سکوت و خموشی
اور متانت و معویت کا ایک عجیب عالم طاری رہتا ہے -
تمہاری خوبصورتی میں کسی ناز آفرین کی شوخ ادائی نہیں
بلکہ فرشتہ سیرتی کی نورانیت اور تمکنت ہے - اور تمہاری
صورت دیکھتے دیکھتے خیال گذرتا ہے کہ اگر ہم تم تک پہنچ
جائیں تو اُس سے کوئی اچھا ہی تماشہ دیکھ لیں گے جو
موسیٰ کو کوہ طور پر نظر آیا تھا - جب ہم خوش عقیدگی کے
جوش میں رو بقبلہ کہتے ہو جاتے ہیں اُس وقت تم
ہمارے رادی ایمن بن جاتے ہو - اور فی الحقیقت ہمارے
رادی ایمن تم ہی ہو - اس میں شک نہیں کہ ہم کو اگر

صحبتوں کی بشاش صورتوں اور احباب کے ہنستے ہوئے
چہروں نے ان سب پر کیسا جادو کر دیا ہے کہ اپنے انجام سے
بالکل غافل ہیں - اور پروا بھی نہیں کرتے کہ کل کیا ہوگا -
انکی ہنسی نہایت ہی اطمینان سے اپنا غم غلط کرتی اور
زمانہ پر یہ شعر پڑھ پڑھ کے چوٹیں کر رہی ہے کہ

اب تو آرام سے گذرتی ہے

عاقبت کی خبر خدا جانے

(ج) ہمالیہ کی چوٹیاں

اے ہمالیہ کی سر بہ فلک چوٹیو تم دور سے کیسی بھلی
معلوم ہوتی ہو! تمہارا اُجلاپن ہماری نظروں میں کھپا
جاتا ہے - تمہاری خوبصورتی ہمیں اپنی طرف کھینچ رہی
ہے - جی چاہتا ہے کہ جس طرح بنے گر پڑے اور مرکپ کے
تم تک پہنچیں - مگر افسوس تم تک نہیں پہنچ سکتے -
تمہاری بلندی اور سربرآوردگی بتا رہی ہے کہ تم آسمان سے
قریب ہو - عالم بالا اور عالم ملکوت جس میں ہماری
ساری ارزوئیں محفوظ ہیں اور جو ہماری زندگی بھر کی

دنیا میں کون ہے جو اپنے ان دشمنوں کو نہیں جانتا؟
یا زمانے کے اس سلوک سے ناراقد ہے؟ مگر اسی خندہ
جبینی کا جادو سب پر اثر کرتا، سب کو از خود رفتہ کر کے
مست و لایعقل بناتا اور ان سے ایسے ایسے حرکات صادر کراتا
ہے جنکو دیکھ کے دھوکا ہوتا ہے کہ گویا انہیں اپنے انجام
کی خبر ہی نہیں ہے۔

انکی صحبت عیش میں مے پرستی و شاہد پرستی کا
زور و شور ہے۔ ہر قسم کا سامان عیش فراہم کر لیا گیا ہے۔
ناز و نیاز اور ناز آفرینی و ناز برداری کے کرشمے ہیں۔
تمنا و آرزو کے ہاتھ باگاہ حسن میں جی کھول کے گستاخیاں
کر رہے ہیں۔ یاران صحبت بذلہ سنجیاں کر رہے ہیں اور قہقہوں
کا شور آسمان کو سر پر اٹھائے لیتا ہے۔ اگرچہ خوشامدیوں نے
ان سب کو یہ کہہ کہہ کے اطمینان دلا رکھا ہے کہ ”ہنستے ہی
گھر بستے ہیں“۔ مگر زمانہ انکی غفلتوں پر ہنس رہا ہے۔
اور اپنی خموشی کی فصیح و راضح زبان میں بتاتا ہے کہ
یہ صحبت کس بے لطفی و حسرتناکی سے برہم ہوگئی۔

وہ خیر زمانہ ان سے جو چاہے کہے اور یہ جو چاہیں
سمجھیں ہمیں تو اس وقت صرف اس قدر ظاہر کرنا ہے کہ ہم

طرف کہینچ رہی کہ حشرات الارض کے لئے ہمارے جسم سے ایک
 پر تکلف خزان نعمت تیار کرے۔ صدھا درندے۔ ہزارھا
 زہردار کیتے مکررے۔ ہمارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور
 چاہتے ہیں کہ ہمارا خاتمہ کر دیں۔ ان محسوس دشمنوں سے
 اگر لڑجھگڑ کے ہم بچ بھی جائیں تو زمانے کی خاموش
 رفتار ہی ہمارے ساتھ کیا کم عداوت کر رہی ہے۔ یہ ہمارے
 جسم کو روز بروز گھلاتی اور ہمارے قویٰ کر ساعت بہ ساعت
 کمزور کرتی جاتی ہے۔ ہم تو ہم افسوس کہ اُن نازنیں و
 ناز آفرین دلرباؤں کے ساتھ بھی رفتار زمانہ کا سلوک نہایت
 ہی ظالمانہ، سخت بیرحمانہ، اور کسی طرح قابل برداشت
 نہیں۔ کیسے کیسے حسن اس نے بگاڑ دیے۔ اور کیسی کیسی
 پیداری صورتوں کو اس نے خاک میں ملا دیا۔ ع۔
 خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں۔
 لیکن ان تمام شکایتوں۔ ان مذکورہ بالا بدگمانیوں پر بھی
 جب فصل گل میں سارا عالم ہنستا ہنساتا نظر آتا ہے۔
 اسی خندہ روئی کی کرامت سے بے اختیار یہی جی میں
 آتا ہے کہ ان سب جانی دشمنوں پر ہم اعتبار کر لیں۔
 اور اپنا انجام چاہے کچھ ہی ہونے والا ہو اس کشت زعفران
 کو دیکھ کے در چار قہقہے ضرور لگادیں۔

اس وقت نظر آتا ہے کہ گویا سارا عالم ہنس رہا ہے ۔ اور
 زمین و آسمان میں کوئی شے ایسی نہیں جس سے اپنی
 ہنسی ضبط ہو سکے ۔ ایسے وقت میں تم نے کبھی خیال بھی
 کیا ہے کہ ہمارا کیا عالم ہو جاتا ہے ؟ ہم مست و از خود
 رفتہ ہوئے ساری شکایت زمانہ بھول جاتے ہیں ۔
 تم نے بارہا ہمیں زمانے کی شکایت کرتے سنا ہوگا ۔ اور
 ہماری باتوں سے تمہیں یقین آگیا ہوگا کہ ہمیں گرد و پیش
 کی کسی چیز کا اعتبار نہیں ۔ ہم ہر شخص اور ہر چیز سے
 بھڑکتے اور سارے عالم کو اپنا دشمن تصور کرتے ہیں ۔ اور
 ہے بھی ایسا ہی ۔ کیونکہ فلسفیانہ طور پر دیکھو تو قانون
 قدرت یہی ہے ۔ اور خدا نے ہر چیز میں اپنی حفاظت کے
 چند ذرائع پیدا کر دیے ہیں جن کی مدد سے اُسکی بقا ہے
 ورنہ گرد و پیش کی ہر چیز اسی کوشش میں لگی ہے کہ
 اُسے فنا کر دے ۔ گویا ہر زندہ مخلوق زندگی بھر اپنے
 دشمنوں ہی کے نرغے میں گھری رہا کرتی ہے ۔ آگ ہمارے
 جلا دالنے کی فکر میں ہے ۔ پانی ڈبونے کے لئے لہریں لے
 رہا ہے ۔ ہوا چاہتی ہے کہ اپنے جھونکوں میں آزا لیجائے ۔
 اور زمین پر پتک پتک کے ہمارا خاتمہ کر دے ۔ مٹی اپنی



ہوئی آتی اور اس طرح اچانک اپنا کام کر جاتی ہے کہ کسی کو یہ بھی نہیں نظر آتا کہ کب اُسکا وار پڑا اور کب کارگر ہوا۔ اسی طرح جوش گریہ اور چشم اشکبار سے جو اثر گھٹڑوں اور مدتوں میں کسی سنگدل پر پڑتا ہے وہ کسی کے ایک دلفریب مسکرا دینے سے ایک آن کی آن میں اُس پر پڑ جاتا ہے اور ایک نہیں ہزاروں دلوں کو مسخر کر لیتا ہے۔

سارے عالم کے محاسن اور قدرت کی تمام خوبیوں اگر بہلی معلوم ہوتی یا اچھی سمجھی گئی ہیں تو اسی لئے کہ ہمارے خندہ جبین دلدار کے ہنستے ہوئے منہ کی تصویریں ہیں۔ کلیوں کا کھلنا کسی کے مسکرانے سے اور پھولوں کا خوب شگفتہ ہر جانا کسی کے خندہ ناز سے تعبیر کیے گئے ہیں۔ چمنوں اور صحراؤں پر جب بہار کا جوش ہوتا ہے۔ جب نوںہالان قدرت سر سے پاؤں تک پھولوں کے زیور سے لدے ہوئے ہیں۔ مشاطہ قدرت رنگ رنگ کے پرتکلف لباس کے ساتھ انہیں سنہرا زیور پہناتی ہے۔ اور بسنت کی راگنی آئے بہار کی دھن میں یہ نغمہ سناتی ہے کہ

کیا فصل بہاری نے شگوفے ہیں کھلائے

صحرا یہ بسنتی ہے وہ گلزار بسنتی

ہنسانا کہ - ع - ”رہ آئی لب پہ ہنسی دیکھو مسکراتے ہو“ کوئی معمولی فتح نہیں - یہ رہ زبردست فتح ہے جو دل کو اپنے قبضے میں کر لیتی ہے - اور جو سوا ان پُر لطف اور بامذاق طریقوں اور خندہ روئی کے زبردست عمل کے اور کسی طرح حاصل ہی نہیں ہو سکتی - اسی نمایان فتح کو ہماری زبان کا یہ ضرب المثل مقولہ ظاہر کر رہا ہے کہ ”ہنسے اور پھنسے“ -

ابرز برق ان قدرتی چیزوں میں سے ہیں جنکے ذریعہ سے اکثر سرکش اور گنہگار قوموں پر عذاب الہی نازل ہوا کیا ہے - ان میں سے ابر اگر ہمارے گریۂ بیتابانہ کا نمونہ ہے تو برق اُس دلربا کے خندہ ناز کی دلفریب تصویر - اسی وجہ سے ابر و باراں نے دنیا کو کبھی ایسا سخت اور اتنا فوری نقصان نہ پہنچایا ہوگا جتنا کہ بجلی ایک آن کی آن اور چشم زدن میں پہنچا دیا کرتی ہے - مانا کہ طوفان نوح نے سارے عالم کو ڈبو دیا تھا اور ہر سال کی بارش سینکڑوں بلکہ ہزاروں عمارتوں کو منہدم کر دیا کرتی ہے - مگر پھر بھی اُس میں ایک متانت اور ایک قسم کا تحمل ہے - بخلاف بجلی کے وہ کسی شوخ ادا کی طرح تلملاتی

شعرا عاشق بے شک ہیں مگر چالاک اور ہوشیار عاشق
 نہیں۔ وہ اپنے مشق ستم کرنے والے کے سامنے زار و قطار
 روتے۔ اُسکی یاد میں آنسو بہاتے۔ اور اُسکے سامنے اپنی
 رقت کی سرگزشت سنانے کو بیٹھ جاتے ہیں۔ اپنی مظلومی
 و بیکسی کا قصہ سنا سنا کے اور سنگدلان نازک اندام کے آگے
 رو پیت کے چاہتے ہیں کہ انہیں اپنے حال پر مہربان بنالیں۔
 اور اُمید رکھتے ہیں کہ ستم کیشاں جفا شعار کو انکی مصیبت
 سن کے اُنپر ترس آجائیگا۔ لیکن ان اچھی صورت والوں میں
 ایسے بہت ہی کم ہیں جنکا دل پسیدجے یا جو کسی کی مصیبت
 سن کے رحم پر آمادہ ہوں۔ نواب مرزا شوق نے بہ روایت ”فریب
 عشق“ اپنی ایک دلربا کے دل پر صرف رو رو کے اور آنسوؤں
 کا دریا بہا کے فتح حاصل کی تھی۔ لیکن اگر اُنہوں نے ایک
 جفا شعار کو جوش گریہ سے اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ تو
 خندہ روئی کی مدد سے ہزارہا حرمان نصیب لطف رسال
 حاصل کرچکے ہیں۔ اور لاکھوں مہ جبین ہیں جنکے دلوں پر
 عشاق کی خندہ جبینی اور اُنکی ہنسی نے فتح پالی ہے۔
 کسی روتے اور بگڑے ہوئے شرح ادا کو بہلا بہلا کے راہ پر
 لانا اور جہاں گدگدی کا بھی زور نہ چلتا ہو وہاں یہ کہہ کے

شمشیر و خنجر سے حاصل ہوتی ہے نہ تیر و تبر سے - یہ صرف ایک دلوں کو مستخر کرنیوالی ہنسی سے نہایت آسانی کے ساتھ حاصل ہو جاتی ہے -

دلوں پر سب سے زیادہ فتح پانے والے یہی رخ زیبا والے ہوتے ہیں - برے برے مضبوط دلوں کو مغلوب و مقہور کرنے کے لئے خدا نے انہیں بھی برے برے زبردست اسلحہ دئے ہیں - وہ تیغ ابرو سے قتل کرتے ہیں - تیر نظر کو سینے میں پیوست کر دیتے ہیں - خنجر مڑگان سے کلیجہ خون کر ڈالتے - گیسوے پیچھاں کے سانپ سے قسواتے اور اپنی ایک ٹھوکر سے عالم کو زیر و زبر کر کے حشر برپا کر دیتے ہیں - مگر ان تمام کاری اور جانستان اسلحہ سے انہیں کبھی اتنی کامیابی نہ حاصل ہوئی ہوگی جتنی کہ ایک دلستان خندہ ناز سے ہوتی ہے - وہ مسکرا مسکرا کے اپنا دار کرتے اور ہنس ہنس کے دل چھین لیتے ہیں - لہذا اگر وہ جیتے ہیں تو اپنے تبسم ناز سے - اور کبھی ہمارا بھی اُن پر زور چل گیا ہے تو محض خندہ روئی سے -

اس نظیر کو پیش نظر رکھ کر اگر تم کام کر دو دنیا کے ہر میدان میں کامیاب رہو گے اور ہر معرکے میں تم ہی مرد میدان ثابت ہو گے -

نذر کرنے کو تیار رہتے ہیں - یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ گوان کا دل سخت ہے مگر آنکھیں رسیلی ہیں - سینے کے اندر چاہے کانتے ہی بہرے ہوں مگر رخ زیبا پر قیامت کی ہنسی نمودار ہے -

ایسے بے رحموں اور ایسے شوخ و چالاک سنگدلوں پر قابو پانا اگرچہ قریب قریب غیر ممکن ہے - اور ان دلستانوں کی دستبرد سے دل کا بچانا آسان نہیں جو ہنس ہنس کے متاع دل پر دست درازی کرتے ہوں - لیکن اُن پر بھی اگر کوئی جادو چلتا ہے تو اسی خندہ روئی کا - اور وہی ہنس مکھ چالاک حسن پرست اُن پر قابو پاسکے ہیں جو ہنستے ہوئے منہ سے اظہار حال کرتے اور بشاش چہرے کے ساتھ اپنی آرزوؤں کو پیش کرتے ہیں -

ایک برہم مزاج ترش رو ممکن ہے کہ اپنی شجاعت و دلیری اور اپنے رفیقوں اور طرفداروں کی کثرت سے دنیا کو فتح کر لے اور بری بری سلطنتوں کو دم بہر میں درہم و برہم کر کے رکھ دے - مگر سچ یہ ہے کہ اُسکی فتح سچی فتح نہیں - کیونکہ سچی فتح وہ ہے جس میں انسان ملکوں اور سلطنتوں کو نہیں بلکہ دلوں کو فتح کرے - اور یہ فتح نہ

کے رخ زیبا کے لئے تو رہے ہی - مگر یہ وہ بلا کی چیز ہے کہ
دشمن کے چہرے پر بھی نظر آجائے تو اُس سے بھی ایک
قسم کا اُنس ہو جاتا ہے -

ہنسنا ہوا منہ ایک معجزہ یا چلتا ہوا جادو یا وہ تسخیر کا
عمل ہے جو چاہے کہیں ہو اور کسی میں ہو بے اثر کئے نہیں
رہتا - جن مہ رخوں نے ہنس ہنس کے ہمیں دیوانہ بنا دیا
ہے اور جن کے متبسم ہونٹوں پر دنیا جان فدا کرنے کو تیار
رہتی ہے اُن کا تو ذکر ہی کیا دیکھنا تو یہ ہے کہ خود آپ
اپنی خندہ جبینی سے کیسی کیسی کرامتیں دکھا دیا کرتے
ہیں - ایک سخت سے سخت دشمن کو آپ کی خندہ جبینی
مستخر کر کے اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے - مگر اس کے خلاف آپ
کے کڑے ٹیور دیکھ کے آپ کا سچا اور خالص دوست بھی
دشمن و بدخواہ بن جاتا ہے -

جن بے رفاؤں کے جور و ستم کی شکایت کی جاتی ہے - جن
کی بے مہری سے زمانہ چیخ اُٹھا ہے - جن کی مشق ستم کی
داستانیں ہر شخص کی زبان پر ہیں - وہ باوجود اپنی
سنگدلی و بیوفائی کے ہر دل عزیز بنے ہوئے ہیں - اُنکے مظالم
اور انکی کج ادائیگوں سے واقف ہونے پر بھی ہم نقد جان

کرنا چاہے کہ میں نے اپنی طولانی زندگی میں کیا کیا دیکھا ہے۔ کن کن لوگوں کے آنے کی شان و شوکت اور جانے کی مصیبت میری آنکھوں سے گذری ہے۔ کون قومیں میری ان بیدار آنکھوں کے سامنے بنی ہیں اور کون بگڑی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ میری رام کہانی میری ہی زبان سے سنئے تو اُسے معلوم ہو کہ کیسے کیسے تاریخی واقعات مجھے یاد ہیں اور ان آنکھوں نے کیا کیا دیکھا ہے۔“

مگر افسوس کہ اسوقت ہمیں اس حیرت انگیز دریا کے حالات زندگی سننے کی فرصت نہیں۔ لہذا دوستو ہم اس صحبت کو اسی مقام پر ختم کرتے ہیں۔ اور فرصت ملی تو کبھی اسکی یہ داستان بھی اطمینان سے بیٹھ کے سنیں گے۔ اور اپنے پُرشوق ناظرین کو سنائیں گے۔

(ب) خندہ روئی

کسی چلبلی شوخ ادا کا تبسم ناز ایک بے چین دل والے کے ساتھ جو کچھہ کر جاتا ہے وہ تو چیز ہی اور ہے۔ کیونکہ دلدادگان یار کے مذہب میں سارے عالم کا آجالا کسی پردہ نشین کے ایک خندہ دندان نما ہی سے عبارت ہے۔ شوخ طبعی کی ہنسی اور تبسم ناز دل چہین لینے والے ماہ طلعتوں

ہے کسی خوبصورت انگوٹھی کے نگینوں کی طرح میں نے
 بہت سے ٹاپو اپنے درمیان میں اسے لئے ہیں۔ جن میں سے
 بعض میں آبادی بھی ہے۔ اور در ایک شہر بھی آباد ہو
 گئے ہیں۔ اب سمندر مجھ سے صرف سو سو میل کی مسافت
 پر رہ گیا ہے اور وصال کا ذوق و شوق مجھ میں اسقدر
 بڑھ گیا ہے کہ میں آپ سے باہر ہونے لگا ہوں۔ بے صبری و
 بیقراری اور شوق بقائے مواصلت کے بیسوں راستے پیدا کر دئے
 ہیں۔ اور جنوبی سندھ کی زمین پر میں نے اپنی مستانہ
 خرامی سے ایک ایسا جال بچھا دیا ہے جو تقریباً تین ہزار
 میل مربع زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ یوں اور اس شان سے میں
 اٹھارہ سو میل سے زیادہ کی مسافت طے کر کے گرتا پرتا،
 لرتا اور ٹکراتا، پھیلتا اور سمٹتا، مست خرامی و سیدہ
 چاکی کے تماشے دکھاتا بحر عرب میں گرے سمندر کی آغوش
 شوق میں غائب ہو گیا ہوں۔ سمندر کی سطح پر کچھ دور
 تک تو نظر بھی آتا ہے کہ میرا آب شیریں کس طرح بہتا
 اور کدھر جاتا ہے۔ پھر کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ میں
 کیا ہوا اور کہاں گیا۔

یہ تو میرا سفر نامہ تھا۔ لیکن اگر کوئی اس بات کو معلوم

منزلیں طے کرنے اور تجربہ کاری کی حیثیت سے میں اُس سے زیادہ بار وقعت تھا مگر بلحاظ زور و شور پھیلاؤ پانی کی مقدار اور بہاؤ کے وہ مجھ سے کم نہ تھا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں نے برابر کا مقابلہ کیا اور اس مقابلے میں گو ہم نے اپنی اصلی غرض یعنی سمندر کے رصال کے شوق سے ذرا بھی غفلت نہیں کی مگر دور تک ہماری لہریں اور موجیں باہم دست و گریباں ہوتی لڑتی بھڑتی اور ایک دوسرے کو مغلوب و پسپا کرتی چلی گئی ہیں۔

ہمارا یہ غصہ بہت دور پر جائے کم ہوا ہے۔ شہر اٹک میں جاکر میں اپنے اصلی مرکز اور سرچشمے سے در ہزار فٹ نشیب میں آگیا ہوں۔ اب میں مملکت پنجاب کے مغربی پہلو پر کوہستان سلیمان کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف دوڑنے لگا ہوں۔ اور جوں جوں آگے بڑھتا گیا ہوں پنجاب کی ندیاں مجھ سے ملتی گئی ہیں۔ اور میرا زور و شور بڑھتا گیا ہے۔ ان دریاؤں کے ملنے سے پہلے میرا پات ۶۰۰ گز کا تھا۔ انکے ملنے کے بعد ۱۰۷۶ گز کا پھیلاؤ ہو گیا۔ اور آگے بڑھ کے میں در ہزار گز زمیں پر پھیلا ہوا بھٹا ہوں۔

پنجاب کے پورے علاقے میں جہاں جہاں میرا گذر ہوا

پھر رہا ہے جب وہ کشتیوں میں بیٹھکے میری سطح پر سفر کرتا تھا۔ اور میں اُسکے بیڑوں کے لئے ایک سبک سیر راہوار کا کام دیتا تھا۔ اور اسی لئے رادی چچ میں پہنچ کے پہاڑوں کی کھمکش اور گھاٹیوں کی روک تھام سے آزاد ہوتے ہی میں نے ادھر ادھر پھیلنا شروع کر دیا ہے۔ اور گو بہت کم گہرا اور جابجا سے پایاب ہوں مگر اس قابل ہو گیا ہوں کہ میری سطح پر کشتیاں آمد و رفت کر سکیں۔ اسی بے محل پھیلاؤ کی وجہ سے یہاں میری آغوش میں جابجا بہت سے جزیرے اور بالو کے چھوٹے چھوٹے میدان پیدا ہو گئے ہیں۔ غرض اب میں وسیع میدان میں زنجیرہ بندی کرتا اور بالو اور پانی کا جال بچھاتا ہوا چلا جاتا تھا کہ دریائے کابل سے متدبیر ہو گئی۔ اور وہ اس طرح اچانک مجھ پر آئے گرا ہے جس طرح کوئی زبردست دشمن برے بہاری لشکر کے ساتھ روانہ ہو کے اپنے حریف پر آپرتا ہے۔ یہ دریا چونکہ ہندو کش - کوہ سفید - قلمر افغانستان - اور چترال کی رادیوں کی سیر کرتا ہوا اور بڑی زبردست قوموں کی جفا کشی و نبرد آزمائی کے تماشے دیکھتا ہوا آیا ہے۔ لہذا عجب سپہگراںہ تھاتھ کے ساتھ مجھ سے ملا ہے۔ اگرچہ دشوار گزار

ڀرياں ميري رواني کي بهار دیکھتي هيں - اور روحاني
 مخلوق کي زندہ دل ميري مست خراميوں سے لطف اُٹھائے
 هيں - جابجا مجھے کشادہ اور سدا بهار مرغزار مل گئے هيں
 جنکي آبياري و باغباني کرتا هوا ميں اپنے ابدی سفر کي
 منزليں طے کرتا چلا آيا هوں - يهاں تک کہ آخر کار پهاريں
 کي بلندي سے نيچے اترنے لگا هوں - اسوقت تک مير
 سفر جيسا دشوار اور حيرت انگيز هے دیکھنے کي قابل هے مگر
 افسوس کوئي دیکھنے والا نهیں - مجھے آج تک دنيا ميں کوئي
 ايسا اولوالعزم نهیں ملا جو در قدم بهی مير ساتھ دے سکا
 هو - اب ميں علاقہ دربند ميں داخل هوا هوں جو پنجاب کا
 سرحدی علاقہ هے - اور جهاں تک ميں اپنے اصل مرکز و منبع
 سے ۸۱۲ ميل کي کوھستاني مسافت طے کر کے پہنچا هوں -

يهاں سے آگے بڑھکر ميس رادي چچ ميس داخل هوا -
 جو اس آخري دور کي اولوالعزم هندو راجہ کو ياد دلا
 رهي هے جس نے مملکت سندھ کي حدود کو کشمير کي
 حدود سے لائے بھرا ديا تھا اور جسکي عظمت و جبروت کي
 گواهي دينے کو ميس آج بهی موجود هوں - اس لئے کہ
 ميں نے اُسے دیکھا هے - اور وہ زمانہ ميري آنکھوں کي سامنے

مقام اسکرودھہ کے قریب روح افزا اور دلفریب وادیوں اور
 فرحت بخش گھاٹیوں میں مجھے ایک سرنگ مل گئی اور
 میں بے تکلف اُس میں گھس پڑا۔ اور گو میں ارض مغرب
 کی طرف رخ کئے آگے بڑھتا چلا جاتا تھا مگر اس سرنگ کے
 آغوش میں قدم رکھتے ہی میں جنوب کی طرف جھک پڑا۔
 اور میرے دل میں اُس ملک کی سیر کرنے کی آرزو پیدا
 ہوئی جسکے دیکھنے کی قدیم الایام سے آج تک تمام قومیں
 آرزومند چلی آئی ہیں۔ یہاں سے چند قدم آگے چل کے
 گلگت نام ایک چھوٹی ندی مجھ سے آگے ہم آغوش ہو گئی
 ہے۔ اور اُسے مبداء فیاض کی ایک امانت کی طرح اپنی
 گود میں لیکر میں سمندر کی طرف چلا ہوں۔ تقریباً ایک
 سو بیس میل تک میں پہاڑوں کی گھاٹیوں اور ہمالیہ کے
 نشیب و فراز میں کسی آوارہ گرد کی طرح سر تکراتا پہرا
 ہوں۔ اور ایسے ایسے مقامات پر میرا گذر ہوا ہے جہاں تک
 انسان کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ مجھے ایسی ایسی
 تیرہ و تار گھاٹیاں ملی ہیں جنکے دونوں طرف سربفلک
 دیواریں ہیں اور درمیان میں میں ہوں۔ کہیں اتنی
 گنجائش نہیں کہ انسان کا قدم ٹک سکے۔ ان مقاموں پر

دامن پر اُترا۔ اور اُسکے دامن میں نقرئی چٹکی کا لہریا
 بناتا اس جبروت و عظمت کی شان سے تبت کے سرسبز
 میدانوں میں پہنچ کے مغرب کی طرف دوڑا کہ میری اس
 جہیت کو دیکھ کر لوگ مجھے ”سنگھہ کا باپ“ یا ”شیر کا
 منہ“ کہنے لگے۔ اور اسی نام سے میں وہاں مشہور ہوں۔
 وہاں دس دس کوس کی اُتھہ منزلیں طے کر کے میں ایک
 دوسرے دریا ”گار“ سے بغلیں ہوا ہوں۔ اب ایک ہم مذاق
 دوست کے مل جانے سے میری ہمت بڑھ گئی ہے۔ حوصلوں
 میں ترقی ہوئی ہے۔ اور اب ہم دونوں نے ایک ساتھ
 اور ایک جان دو قالب ہو کے سفر کرنا شروع کیا ہے۔ تھوڑی ہی
 دور چلا تھا کہ خدا نے مجھے کشمیر کی پرفضا وادیوں اور
 اس جنتِ ارضی کے مرغزاروں میں پہنچا دیا اور مجھے
 ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں جنت سے چلا اور پھر جنت
 میں پہنچ گیا۔ یہاں کی بعض دلچسپ اور کسی کا پہلوں سے
 بھرا دامن بنی ہوئی پہاڑیوں نے مجھے چھیرا۔ اور میں نے
 انکی خدمت میں گستاخیاں کیں۔ بلکہ انکے ستانے اور
 ادھر ادھر پہلو میں تھوڑے کھانے سے میں اور زیادہ اُتھلا
 اُتھلا کے اور لہرا لہرا کے چلا۔ تھوڑی ہی دور گیا ہونگا کہ

مستعدی - پھرتی - چالاکی اور مصروفیت و مشغولیت کی تصویر تھا - بڑے بڑے پہاڑ اور گہنے سے گہنے جنگل میرے راستے میں آئے - مگر میں کودتا پھاندتا - ڈانٹتا ڈپٹتا - گرتا پڑتا اور پھیلتا سمٹتا چلا ہی آیا - کوہستانوں نے میرا راستہ روکنے کے لئے چٹانوں کی دیواریں کھڑی کیں مگر میں بغیر اسکے کہ ایک دم کے لئے بھی رکوں یا آنکی ذرا بھی پروا کروں انہیں پھاند کر یا اُنکے پہلو سے چکر کھاکے نکل ہی آیا - جنگلوں کے زبردست درختوں نے اپنی ٹہنیوں کے ہاتھ جھکا جھکا کے میرا دامن پکڑنا چاہا مگر میں نے اُنکی کمزور گرفت کا بھی خیال نہ کیا اور اُنکے ناتوان ہاتھوں سے دامن چھڑا کے چلا آیا -

میں ہمالیہ کے اس حصے سے نکلا ہوں جو کیلاس کہلاتا ہے - جواہل ہند کی جنت ہے - یہاں پریوں اور دیوؤں کا نشیمن ہے - اور وہاں سے آتا ہوں جہاں تک جانے اور بار پانے کی بڑے بڑے ناموروں کو تمنا ہوتی ہے - کیلاس کی صدها اُرنچی چوٹیاں برف کی سفید تریپیاں پہنے رہتی ہیں - اُنکی ان نظر فریب تریپوں کی چاندی کی جھلجھل بڑکے میں غاروں اور سوراخوں میں ہوتا ہوا پہاڑ کے شمالی

جن میں سے ہر ایک کے سفر کی سرگذشت بیان کرنے کے لئے ہماری موجودہ عمر کافی نہیں۔ لہذا ہم ایک ایسے دریا کا سفرنامہ سناتے ہیں جو ہندوستان ہی میں بہتا ہے۔ اُسکی حد بندی کرتا ہے۔ جو پنجاب کا سرمایہ ناز ہے۔ اور جو اپنی وضع و حالت سے مغربی ہندوستان کو مملکت مصر کے مماثل ثابت کر رہا ہے۔ واقعی دریائے اٹک کی سرگذشت سننے کے قابل ہے اور جو لطف اسکی داستان میں ہے کسی میں نہیں۔ ایک گھڑی بھر کے لئے اسکے دھانے کے پاس جا کھڑے ہو جہاں وہ ہزارہا کوس کا تھکا ماندہ آئے سمندر کے آغوش میں چھپ جاتا ہے۔ اور پتہ بھی نہیں چلتا کہ کیا ہوا اور کہاں گیا۔ لیکن اگر گوشِ عبرت کھول کے کھڑے ہو تو وہ اس آغوشِ راحت میں سونے سے پہلے تمہیں زبانِ حال سے اپنی کہانی سنا دے گا۔ دیکھو اُس شور کی آواز سے جسے لوگ مہمل و بے معنی خیال کرتے ہیں۔ وہ حقیقت شناسوں سے کہہ رہا ہے کہ ”میں بہت تھکا ہوا ہوں اور بڑی محنتیں برداشت کر کے یہاں تک پہنچا ہوں۔ سست اور کھل لوگوں کی طرح میں نے کسی جگہ ایک گھڑی کو بھی قرار نہ لیا اور گویا مجمعِ سستائی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ میرا سفر

کی ازلی و ابدی سفر کرنے والیو! تم کیوں ایسی چپ
ہو کہ کسی کو ایک لفظ بھی نہیں سناتیں۔

تمہاری داستان اور تمہارے سفر کی سرگزشت نہایت
دلچپ تھی مگر افسوس کسی کے سننے میں نہیں آئی۔
تمہارے تجربات بہت کارآمد تھے مگر کسی کے گوش گزار نہ
ہوئے۔ تم نے ان مقامات کو دیکھا ہے اور ان کیفیتوں کا
لطف اُٹھایا ہے اور تم ان مقامات میں گزاری ہو۔ ان
نظر فریب رادیوں اور دلکش مرغزاروں کو تم نے دیکھا ہے
جن سے ہمارے کان آشنا نہیں۔ تاہم یہ کہنا غلطی ہے کہ
تم خاموش ہو اور تمہاری زبان نہیں۔ نہیں خدا نے تمہیں
ایک زبان دی ہے اور ایسی زبان جو کسی وقت رنتی ہی
نہیں۔ لیکن گوش شنوا چاہئے جو سنے اور چشم بینا چاہئے جو
دیکھے۔ تم اپنی زبان بے زبانی سے بولتی اور زبان حال سے
وہ وہ باتیں بیان کر رہی ہو جن کو اگر کوئی سنے تو ساری
دنیا کے سفرناموں کو بھول جائے۔

اُو تمہاری ہی زبان حال سے سن کر تمہارے سفر کا حال
ان سیاحوں کو سنائیں جو اپنے سفروں اور اپنے چند روز کے
کارناموں پر فخر کر رہے ہیں۔ دنیا کے بہت سے دریا ہیں

بو باس اور سامنے آبشاروں کی روانی اور تالاب مصفا کی
جھلک وہ لطف دکھاتی ہے کہ قابل دید ہے ۔ بترے خوش
نصیب وہ لوگ ہیں جو اس فرحناک کوهستان میں زندگی
بسر کرتے ہیں ۔

انتخاب از مضامین شرر

(۱) نڈیوں کا بہاؤ

اے دلفریب اداؤں اور دلستان مستانہ خوامیوں سے
بہنے والی نڈیو! تم اگرچہ شور کرتی اور ہنگامہ مچاتی
ہوئی چلتی ہو مگر پھر بھی خاموش ہو ۔ ہمارے سیاحوں کا
معمول ہے کہ دنیا کے کسی چھوٹے حصے کی بھی سیر کر آتے
ہیں تو جہاں درگہری کو بیٹھ جاتے ہیں اپنے سفر کے حالات
اور اپنی آپ بیتی کہانیاں سنانا شروع کر دیتے ہیں ۔ اپنے
سفر کے حالات اخباروں میں چھپواتے ۔ سفر نامے شایع کرتے ۔
اور بترے بترے مجمعوں میں کہتے ہوئے اپنے تجربات
اور چشم دید واقعات بیان کرتے ہیں ۔ مگر اے باغ آفرینش

پہاڑوں کی فرح بخش آب و ہوا

اب محمد عسکری کو دل و جان سے اس بات کی چٹیک تھی کہ پہاڑ کا حال دریافت کریں۔ اور مرزا صاحب نے بڑی خوش بیانی سے پہاڑوں کی تعریف کرنا شروع کی اور کہا کہ جن لوگوں کو خدا نے عقل دربین عطا فرمائی ہے وہ گرمی کے چار پانچ مہینے کو ہستانی مقاموں ہی میں صرف کرتے ہیں مگر ان لوگوں کے لئے ہے جو سرمایہ و افراد و جائداد کافی رکھتے ہیں۔ کل حکام بالادست ۱۵۔ ماہ اپریل کے قریب قریب فیضی تال چلے جاتے ہیں اور جولائی یا اگست میں پہاڑ سے اترتے ہیں۔ پہاڑوں کے اس قیام سے انکے دماغ کو قوت آنکھوں کو نور روح کو سرور دل کو تازگی اور اعضائے رئیسہ کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ تہندی تہندی ہوا کے جھونکے اور وہ آب سرد کہ سبحان اللہ چاہے جس قدر کھانا کھاؤ فوراً ہضم۔ پانی چورن کی خاصیت رکھتا ہے۔ دن بھر میں چار دفعہ کھائے ہضم۔ یہ آب و ہوا کی خاصیت ہے اور جس طرف رخ کیجئے وہ سمان نظر آتا ہے کہ راہ راہ۔ پہاڑوں کی ارنچی ارنچی چوٹیاں اور دور تک سلسلہ کوہ اور ان پر اشجار پر بہار اور پھولوں کی لپٹ اور بھینی بھینی

بیگم صاحب کو تشفی دیکر محمد عسکری باہر تشریف
 لے گئے تو ایک دوست سے ملاقات ہوئی - کہا بھئی واللہ
 خوب ملے ہم چاہتے تھے کہ تمہارے ہی سے کوئی جہانیاں
 جہاں گشت دوست ملیں ہمیں یہ بتائے مرزا صاحب کہ آپ
 نے کبھی پہاڑ کا بھی سفر کیا ہے - مرزا صاحب نے ہنس کر جواب
 دیا کہ چہ خرش - یہ اچھا سوال کیا آپ نے کبھی کی ایک ہی
 کبھی واللہ ہر سال گرمی کے دن پہاڑ پر بسر کرتا ہوں آپ
 کبھی کی لڈے پھرتے ہیں بڑے خوش نصیب وہ لوگ ہیں
 جو گرمی کے دن پہاڑوں پر بسر کرتے ہیں - ہمارے دوستوں
 میں ایک صاحب ہیں آغا حسن دائم المرض - ڈاکٹر کی
 صلاح سے چھ مہینے نیننی تال میں رہے برسوں کا عارضہ اُس
 قیام نے کھو دیا وہاں کی آب و ہوا دور دور مشہور ہے -
 ایسا سرد و خنک اور ہاضم پانی ہے کہ میں کیا عرض
 کروں مگر ہمارے ملک کے امرا جانتے ہی نہیں کہ صحت
 جسمانی کے برقرار رکھنے کا کیا طریقہ ہے - بتیہ بازی اور
 مرغ بازی اور پتنگ بازی کے ہاتھوں تباہ ہیں - آپ اتنے
 امیر ہو کر قدم بھر پر نیننی تال ہے اُس سے بھی ناواقف ہیں - بس
 حد ہو گئی خدا گواہ ہے عجب فرح بخش و دلچسپ مقام ہے -

کیا حقیقت چرخ کی ہم سے چھوڑائے لکھنؤ
لکھنؤ ہم پر فدا ہے ہم فداے لکھنؤ

پہاڑ کوئی اور ہی جایا کرتے ہونگے۔

ب۔ بندی ان باتوں میں نہ آنے کی۔ شرعی قسم
کھاؤ تو مانوں یوں بندی ایک نہ مانگی۔ ہاں ہمارے
سر کی قسم کھاؤ تو شاید یقین آجائے۔

عسکری۔ یا خدا۔ یہ بدگمانی! شرعی قسم کھاؤں اور
اس سے بڑھ کر یہ کہ تمہارے سر کی قسم کھاؤں اور پھر بھی
شاید یقین آئے یا نہ آئے۔ تو ایسی قسم کھانے سے کیا فائدہ۔

الغرض تھوڑی دیر میں لاڈلے نے دروازہ کھول دیا اور
محمد عسکری اریز داخل ہوئے۔ بیگم صاحب کے پاس زانو

بزانو بیٹھ گئے اور کہا تم بڑی عقلمند ہو۔ بس تمہاری
عقل آزمائی۔ ذرا سی بات میں کوئی اس قدر روتھ جاتا
ہے۔ بیگم صاحب نے شوخی کے ساتھ چٹکی لیکے کہا یہ

تمہارے نزدیک ذرا سی بات ہے جس بات میں دشمنوں کی
جان کا خطرہ ہو اسکو ذرا سی بات سمجھتے ہو۔

بیگم صاحب بولیں ہم کو یہ لگی لپٹی اچھی نہیں معلوم
ہوتی صفائی عجب شے ہے اگر ہم سے تم نے یہ لگی لپٹی
باتیں کیں تو ہم اُتھ کے چلے جائیں گے۔

ب۔۔ اے لو اور سزو۔ غضب خدا کا اتنا جھوٹ۔ میں
اپنے کانوں سے سننے چلی آتی ہوں۔ ایک بیچارہ کہہ رہا تھا
کہ ابا مرتے دم یہ وصیت کر گئے ہیں کہ بیٹا خبردار پہاڑوں
کی طرف رخ نہ کرنا اور تم کہتے ہو اس بات کا کہیں
ذکر بھی نہ تھا۔ ہمارے بھی گریں دے چھوڑتے رہتے ہیں۔
ہمکو رتی رتی خبر پہنچتی ہے یہ نہ جاندا۔

ع۔۔ ان سب آدمیوں کو نہ ایکدم سے برطرف کیا ہو تو
سہی ادھر کی ادھر لگاتے ہیں۔ یہ تمسے آئے کس نے
زتل اڑائی ذرا اس کا نام تو بتاؤ۔ ابھی ابھی اسی دم
نہ برطرف کیا ہو تو سہی۔

ب۔۔ راہ را کیا ہنسی تھتا ہے موقوف کر دینگے۔ جب سے
میں نے سنا ہے۔ کلیجہ کانپ اٹھا ہے کہ گھر بار سب چھوڑ
کے پہاڑ پر چلے۔ راہ کیا سوچھی ہے۔

ع۔۔ اچھا اب دروازہ تو کھولو۔ قسم کھائے کہتا ہوں
کہ یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ جانا اور آنا کیسا ہملرگ
سفر کی زحمتوں کے عادی ہیں بھلا۔ اور پھر پہاڑ کا سفر!
الہی توبہ! انسان کا وہاں گذر کہاں اور رہ گذر ہو بھی
تو ہم بھلا اپنے وطن کو چھوڑ کے کب جانے والے ہیں۔

اور کہا کہ بھئی کیا کیا باندھن لوگ باندھتے ہیں۔ اور
انکی بھی کیا عقل ہے واللہ۔ لاحول ولا قوۃ بات کا بتنگڑ اسی
کو کہتے ہیں۔ بہلا پہاڑ کے سفر میں کیا رکھا ہوا ہے۔ اگر
سفر کو جی چاہتا بھی تو کسی فرحناک مقام پر جاتے جہاں
روح کو تازگی اور بالیدگی ہوتی نہ کہ پہاڑ اور جنگل اور
کوہ و صحرا۔ سکے بعد نواب صاحب نے مہری کو آواز دی
اور کہا (لاڈر) بیگم کو سمجھا دو کہ یہ کسی نے گپ آزادی
ہے۔ بیگم صاحب تذک کر بولیں بس بہت بڑھ بڑھ کے
باتیں نہ بناؤ گپ آرائی ہے یا میں اپنے کانوں سن چکی ہوں۔
ع۔ یہ بڑے عیب کی بات ہے۔ مرد آپس میں خدا
جانے کیا کیا باتیں کرتے ہیں۔ عورتوں کا چھپ چھپ کے
سننا کیا معنی۔ مگر تم سے کون کہے۔

ب۔ تم ایسے مرد اسی قابل ہیں۔ جو اتنی رہ نہ
کروں تو تم میرے سر پر چکی دلو۔ تمہارا اعتبار کس کو ہے۔
بیٹھے بیٹھے یہ آپج کی لی کہ پہاڑ پر جائیں گے۔ کوئی پوچھے
مورے پہاڑ میں کیا ہے۔ گھر بار کو تھج کر جنگل میں جانا
کس نے بتایا ہے۔ یہ سوجھی کیا انوکھی؟

ع۔ تو جاتا کون ہے۔ اس بات کا تو کوئی تذکرہ بھی
نہ تھا۔ تم تو خواہ مخواہ لڑنے لگیں۔

کی جانب مخاطب ہو کر) ہمارے حضور دریافت کرتے
ہیں کہ آپ کا ہے سے خفا ہو گئیں۔

عسکری نے باراز بلند کہا۔

ہردم آزر دگی غیر سبب را چہ علاج

ما گذشتیم ز لطف تو غضب را چہ علاج

میں تو فقط اتنا دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ہے کیا

ماجرا۔ بی مغلانی ہنسنے لگیں۔

سفر کہسار کے عزم سے انکار

محمد عسکری نے جو یہ رنگ دیکھا تو دنگ ہو گئے

اور مغلانی سے اسکی وجہ دریافت کی۔ اس نے صاف صاف عرض

کر دیا کہ حضور کسی نے بیگم صاحب سے آن کے جڑ دی کہ سرکار

پہاڑ کے سفر کی تیاریاں کر رہے ہیں اور عنقریب جانے والے

ہیں۔ بس اتنا سننا تھا کہ جیسے ہاتھوں کے طوطے آڑ گئے۔

کئی دفعہ مہری کو بھیجا کہ جا کے بلا لاؤ۔ حضور آرام میں تھے۔

خدمتگار نے کہا ابھی ابھی آنکھ لگی ہے۔ کچی نیند جگانے

کی کسی نے صلاح نہیں دی بارے خدا خدا کر کے حضور

تشریف لائے۔

مغلانی کی زبانی یہ حال سنکر محمد عسکری مسکرائے

شرع کیا کہ دروازہ کھول دو مگر صدائے برنخاست اب انکو
اور بھی زیادہ حیرت ہوئی انہوں نے لاڈ کو پکارا اور کہا
دروازہ کھول دے۔ لاڈر بھلا بیگم صاحب کے حکم کے بغیر کیونکر
دروازہ کھول سکتی تھی۔ خاموش ہو گئی۔

عسکری — لاڈر اگر نہ کھولو گی تو تماشہ بھی دیکھ لو گی
کہ دیا ہے۔

لاڈر — اے تو حضور اسمیں لونڈی کا کونسا قصور ہے۔
عسکری — میاں بیوی کی لڑائی جیسے ساون بہادرن کی
جہڑی ہم از رہ پھر ایک ہو جائیں گے تمہاری بیچ میں
کم بختی آجائیگی۔

لاڈر — یہ بڑے اندھیر کی بات ہے۔ اب سرکار تو منع
کر رہی ہیں بھلا حکم کے بغیر میں کیسے دروازہ کھول دوں
حضور بھی انصاف کریں۔

عسکری — آخر یہ خفگی کا سبب بھی تو کچھ معلوم ہو۔

لاڈر — یہ حضور جانیں یا بیگم صاحب جانیں۔

عسکری — اچھا تم ہماری طرف سے رکالت کرو۔ پوچھو

ہم سے کیا گناہ ہوا جو صورت تک دیکھنا ناگوار ہوا۔

لاڈر نے کہا ہاں یہ بات مانی۔ کیوں سرکار (بیگم صاحب

ب — ابھی ایسا نہیں ہے کہ ہمارے حکم کو ٹال دیں۔

ل — جی نہیں بیگم صاحب بہت مانتے ہیں۔

ب — نہ کیونکر مانیں۔ نہ ماننا کیا معنی۔

ل — حضور بات ساری یہ ہے کہ کسی نے بہکا دیا ہے۔

ب — اسمیں بھی دس بارہ ہزار بلٹینگے۔

ل — اسمیں کیا شک ہے حضور۔ مگر ہمارا دل گواہی

دیتا ہے کہ جب حضور کی خفگی کا حال دیکھینگے تو پھر جانے

کا نام نہ لینگے۔

اتنے میں محمد عسکری صاحب آنکھیں ملتے ہوئے مجلسرا

میں تشریف لائے۔ بیگم صاحب نے آنکھ دیکھتے ہی منہ پھیر

لیا اور جیسے یہ قریب آنے کو تھے انہوں نے ایک عجیب

دلربا شوخی کے ساتھ طرارہ بہرا تو کوٹے پر ہو رہیں۔ لاقر

مہری۔ ساتھ گئی اور جھپ سے دروازہ بند کر لیا۔ محمد

عسکری کے فرشتے کو بھی خبر نہیں کہ اس بد دماغی اور

خفگی اور عتاب کا سبب کیا ہے۔ یہ سخت متحیر ہوئے

اور خواصوں سے پوچھنے لگے کہ آج یہ کیا ماجرا ہے کہ بیگم

ہمکو دیکھتے ہی خفا ہو گئیں اور اس قدر خفا ہو گئیں کہ

کوٹے پر چل دیں۔ زینے کے دروازے کے پاس جا کر غل مچانا

وقت موقع نہیں ہے - کہنے کو کہو جا کر عرض کردوں - مگر
خفا ہو جائینگے - لادو نے کہا تمکو اس سے کیا بحث ہے - جو
حکم سرکار نے دیا وہ بجالاؤ - حسین علی نے جا کر دیکھا تو
سب کے سب پترے خراٹے لے رہے تھے - پنکھا قلی نے کہا دے
پاؤں جاؤ - ابھی ابھی سرکار کی آنکھ لگی ہے اتنے میں
ایک مصاحب نے آہستہ سے کہا -

سرہانے میرے آہستہ بولو -

ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے -

حسین علی نے جا کر لادو سے کہہ دیا کہ سرکار آرام میں
ہیں - لادو نے بیگم صاحب سے عرض کی کہ حضور سرکار
آرام میں ہیں ابھی ابھی آنکھ لگی ہے - کوئی در گھنٹے
میں بیدار ہونگے -

بیگم — (ب) ابھی ہم کچھ نہ کہیں تو بہتر ہے - دیکھیں
ہم سے کیا ذکر کرتے ہیں -

لادو — (ل) حضور کی بلا اجازت تو حشر تک نہ جائینگے -

ب — ہم سے جس وقت ذرا ابھی ذکر کریں گے ہم کہیں گے

اگر تم نے پہاڑ کے سفر کی تیاری کی تو ہم زہر کھالین گے -

ل — اے ہ کانپ اٹھیں حضور -

بیگم صاحب کا روٹھنا

اب سنئے کہ لاڈل مہرہ کی کو ان چہ میگوئیوں کی پوری پوری خبر پہنچ گئی اور اُس نے محل سرا میں جا کر بیگم صاحب سے کچا چٹھا کہ سنایا۔ سنتے ہی بد دماغ ہو گئیں اور کہا۔ اُنکو کیا کیا بے فکری کی باتیں سوچھتی ہیں اور اللہ کی عنایت سے جو سوچھتی ہے انوکھی ہی سوچھتی ہے۔ اس بے تکی پن کے صدقے کوئی پوچھے پہاڑ نگوڑے میں کیا دھرا ہے۔ لاڈل نے کہا حضور ہمارے محلہ میں ایک خانسامان رھتا ہے وہ پہاڑ کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے اور کہتا ہے چاہے کوئی دس کی عوض پچاس روپیہ مہینہ بھی دے تو میں حاشا پہاڑ پر نہ جانے کا۔ حضور وہاں تو ذری سی پگڈنڈی ہے۔ بے ایمان کی قبر کی طرح تنگ۔ ہے ہے جو ایک ذری پاؤں پھسلے تو انسان کہیں کا نہ رھے۔ بیگم صاحب نے کہا۔ لاڈل۔ حسین علی سے کہدو کہ ذری بلالے۔ کہے ہمکو ایک ضروری کام ہے۔ لاڈل نے حسین علی کو دروازے کے پاس بلا کر کہا۔ سرکار سے کہدو کہ بیگم صاحب حضور کو بلاتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ بڑا ضروری کام ہے۔ ذری کہتے کہتے ہو جاؤں۔ حسین علی نے کہا اس

بولا خداوند ابقو یہ زمین اور آسمان کے قلابے ملانے لگے -
 اسپر بڑا قہقہہ پڑا - محمد عسکری خوب کھل کھلا کر ہنسنے
 فرمایا کہ زمین اور آسمان کے قلابے کیسا خوب کہا ہے -
 مصاحب نے اُٹھ کر تین بار سلام عرض کیا اور کہا حضور یہ
 سب حضور ہی کے فیضان صحبت کا اثر ہے - ورنہ من انم
 کہ من دانم -

جمال ہمنشیں در من اثر کرد
 رگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

ع — جمال ہمنشیں یا کمال ہمنشیں -

ممن — کیا خوب بات فرمائی ہے -

ع — بھئی اس صحبت میں تو اختر شاعر ہیں - ان سے
 پوچھئے کہ جمال کا لفظ یہاں پر صحیح ہے یا کمال -

اختر — پیر و مرشد دونوں صحیح ہیں - جمال کے معنی
 ظاہری حسن و خوبصورتی کے نہیں ہیں میرے ناقص علم و
 یقین میں کمال کے لفظ سے جمال یہاں پر زیادہ موزوں ہے -
 یہ آدمی ہیں کہ برسوں جمال رہتا ہے

رگرنہ ماہ کو ایک شب کمال رہتا ہے

ع — ہم سے چڑھائی پر نہ چڑھا جائیگا اور ایسی چڑھائی !!
مگر کیا ادھر ادھر اینٹ یا پتھر کی منڈیر نہیں بنی
ہوئی ہے ۔

ممن — (قہقہہ لگا کر) خداوند منزلوں اور برسوں کے
راستے میں منڈیر کیسی ۔

اختر — انسان کا کام تو نہیں ہے ۔
ممن — اس میں کیا شک ہے ۔ در سو منزل تو ایک ادنیٰ
پہاڑی کا ایک حصہ ہوتا ہے ۔

کھانے سے فراغت پائی تو گرم گرم چائے آئی اور نواب
صاحب نے مع مصاحبین نوش فرمائی ۔ حقے پیچہ روان آئے ۔
مشکبر تمباکو نے ساری محفل کو بسا دیا ۔ محمد عسکری صاحب
پلنگ پر دراز ہوئے خسخانے کو بہشتی نے تر کر دیا ۔ قلی نے
پتکبا کھینچنا شروع کیا ۔ مصاحب بھی لیٹے ۔ اب خوش گپیاں
ہونے لگیں ایک مصاحب نے کہا کیوں حضور مجھے یہ حیرت
ہے کہ یہ آسمان بے ستون کے کیونکر کھڑا ہے ۔ دوسرا بولا
خداوند پلاؤ کھانے کے بعد بھی واللہ کیا دور کی سوجھتی
ہے ۔ دریافت فرماتے ہیں کہ یہ آسمان بے ستون کے کیونکر قائم
ہے ۔ تیسرے مصاحب نے کہا حضور دور کی سوجھی ۔ چوتھا

واجد — راہی ہو خاصے - اور جو لاکھوں آدمی پہاڑوں پر
رہتے ہیں یہ کیوں کر رہتے ہیں -

ممن — اُنکی اور بات ہے بھائی جان -

واجد — اور بات کیسی کیا وہ انسان نہیں ہیں ؟

ممن — بھلا حضور پہاڑ کے سفر کے قابل ہیں ؟

واجد — کیوں نہیں ہیں - تترؤں پر جائینگے -

ممن — تتر پر چہہ کوس کی چڑھائی پر جائینگے ؟ ہرش

کی دوا کر - اور جو تتر تھوکر لے -

ع — تتر پر ؟ راہ را ہم سے نہ جایا جائیگا - بندہ ایسے

سفر سے درگذرا اور جو تتر بھڑکے تو کہیں گے نہ رہے -

ممن — گریں تو ہدیاں تک نہ ملیں -

ع — اے توبہ چکنا چور ہو جائے -

ممن — خداوند ایک ذراسی بلندی پر سے انسان دیکھتا ہے

تو کانپنے لگتا ہے نہ کہ پہاڑ کی چڑھائی - خدا کی قسم

ذرا نیچے کی جانب نظر کی اور کانپ اُٹھا -

ع — چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی -

اختر — ہے تو پہاڑ کا سفر نہایت دشوار گزار -

ممن — اے حضرت توبہ ہی بھلی -

ع — اے تو صاحب کوئی سبب بھی بتائے گا۔

اختر — بھئی عجب قسم کے آدمی ہو رالہ۔ ارے میاں

پہاروں نے کیا قصور کیا ہے آخر کچھ معلوم تو ہو رہے۔

ممن — حضور بس یہ ملاحظہ فرمائیں کہ جناب والد نے

پہار کے سفر میں یہ تکلیف اُٹھائی کہ وصیت کر گئے۔

ع — بغیر اس کے نشیب و فراز سے انسان واقف نہیں ہوتا۔

ممن — پیر و مرشد یہ تو حضرت نور کی لفاظی ہے۔ باقی

عرض کر دینے سے مطلب تھا ماننا نہ ماننا آپ کے ہاتھ ہے۔

سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار

اب مان نہ مان تو ہے مختار

ارل تو حضور یہ ملاحظہ فرمائیں کہ کوسوں کی چڑھائی

چڑھنا۔ بھلا حضور سے چڑھی جائیگی۔ استغفر اللہ۔ درگاہ

تک جاتے ہوئے ہانپ جاتے ہیں حضور نہ کہ کوسوں کی

چڑھائی۔ پھر راستہ اس قدر مخدوش کہ الامان۔ ذرا سی

پگدندی اور دونوں جانب کوسوں کا نشیب نیچے دیکھا اور

تھر تھرا کے آدمی گر پڑا۔ دائیں طرف دیکھو تو خوف۔ بائیں

طرف نظر ڈالو تو خوف۔ اور جو پتھروں میں آگ لگ گئی

تو چلئے بس ختم شد۔ جل بھن کے کباب ہو گئے۔

ممن — خیر باشد - یہ سفر کیسا خداوند ؟

ع — ہمیں شرم آتی ہے کہ آج تک پہاڑ نہیں دیکھا -

ممن — اسمیں شرم کی کیا بات ہے پیر و مرشد - پہاڑ

دیکھنے سے کیا قارون کا خزانہ مل جائیگا ؟

اختر — ایک پہاڑ پر کیا فرض ہے حضور - ابھی ہملوگوں

نے دیکھا ہی کیا ہے خاک ؟ جب ملکوں ملکوں کی سیر کرے

تب البتہ انسان پختہ مغز ہو مگر در دن کی زندگی میں

کیا کیا کرے -

دریا دیکھوں کہ کوہ و صحرا دیکھوں

یا معدن و دشت کا تماشا دیکھوں

ہر سو تیری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے

حیران ہوں کہ در آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

ممن — خداوند ہرگز ہرگز پہاڑ پر جانے کا قصد نہ فرمائے گا -

اے توبہ توبہ - جناب والد کو ایکبار جانے کا اتفاق ہوا تھا

وصیت کر گئے ہیں کہ بیٹا اگر کوئی کڑور در کڑور روپے بھی

دے تو پہاڑ کی طرف رخ نہ کرنا -

عسکری — یہ کیوں - یہ کیوں - آخر اسکا سبب ؟

ممن — خداوند غلام دست بستہ عرض کرتا ہے از برائے

خدا حضور یہ خیال دل سے نکال دالیں -

فرمائی تھی مگر حوالی موالی رفیق مصاحب سب خانہ
برانداز تہذیب - فروغ بازار تخریب ملے تھے - طرز معاشرت
قابل افسوس تھا انکے یہاں ۱۱ بجے ترکا ہوتا تھا - ۱۱ بجے تک
خراب غفلت میں پڑے رہتے تھے ۱۱ بجے کر رہیں ادھر ادھر
بدلیں - آنکھیں ملتے ہوئے اُرتھے اور پھر لیٹ گئے - خدمت گار
حاضر ہوا اور پاؤں دبانے شروع کئے تو پھر آنکھ لگ گئی
۱۲ بجے کے بعد آنکھ کھلی - پلنگ ہی پر بیٹھے بیٹھے منہ
دھویا - آبدار خانے والا پیچوان بھر کر لایا - محمد علی کی
درکان کا درسیرا مشکبو تمباکو - خاصدان میں گلوڑیاں آئیں -
سرکار نے لیٹے ہی لیٹے کھائیں - اتنے میں مصاحب آئے -
فقہ بازی شروع ہوئی - ایک گنتہ تک گپیں آرائیں - ایک
گنتہ کے بعد چاند کا شغل ہوا - خود ما بدولت اور کل حاضرین
ر مصاحبین ارندھے پڑے ہوئے چاند آڑا لگے - جب
کئی چہینٹے پی چکے اور خوب غین ہوئے تو تھوڑی دیر میں
خدمت گار نے عرض کیا خداوند خاصہ چنا گیا کھانے کے وقت
چہ میگوڑیاں شروع ہوئیں -

عسکری - قصد ہے کہ ابکے پہاڑ کا سفر کریں -

اختر - حضور پہاڑ کا سفر کریں گے ؟

یہ تہرزا ہی ممکن ہے کہ پہاڑ کی چوٹی پر آپ سیدھے ہی پہنچ جائے۔ یہ بھی کوئی میدان ہے کہ انسان سیدھا چلا جائے چکر کھائے جانا پڑتا ہے۔ چیل کو کبھی مندلاتے ہوئے دیکھا ہے۔
ع — آپ نے بھی غضب کیا واللہ۔ اب کیا چیل اور کرے کر بھی اڑتے نہیں دیکھا ہے۔ معقول!

ن — اچھا بہلا چیل کیونکر اڑتی ہے۔ چیل کو کبھی سیدھا اڑتے ہوئے نہ دیکھا ہوگا۔ جب اڑیگی چکر کھائے اور مندلاتی ہوئی اگر سیدھی اڑے تو دم ٹوٹ جائے۔ حقیقت حال یوں ہے کہ پہاڑ کے دیکھے بغیر دنیا کے نشیب و فراز سے انسان واقف نہیں ہو سکتا۔ نشیب و فراز تو انسان جب ہی دیکھ سکتا ہے جب پہاڑ کی چوٹی پر چڑھے اور پھر نیچے اترے۔
ع — واللہ کیا بات کہی ہے تو حضرت کسی ترکیب سے پہاڑوں کی سیر کرنی چاہئے۔

سفر کوہی کا شوق

میاں نور کی روشنی طبع اور لسانی و لفاظی و جادو بیانی و معجز طرازی نے وہ رنگ اثر جمایا کہ محمد عسکری کو سفر کوہی کا شوق چرایا۔ گو انہوں نے عذایت ایزدی سے طبع نورانی پائی تھی۔ جناب باری نے عقل در ربیں عطا

ع — سات ہزار فت کی بلندی !!! ہوش آر گئے۔
 واللہ سات ہزار فت کی بلندی کچھ تھکانا ہے۔ بھئی ہمیں
 تو یقین نہیں آتا۔ آپ ہمیں نواقف سمجھ کر بناتے ہیں۔
 سات ہزار فت۔ کچھ آپ نے دل لگی مقرر کی ہے پہاڑ نہ
 ہوا کوئی آسمان ہوا۔ آسمان بھی تو آخر۔

ن — ہاں ہاں کیا! آسمان بھی تو آخر کیا۔ آپ کچھ
 فرمانے کو تھے مگر دے دانتوں کہ کے رہ گئے۔ سات
 ہزار فت کی بلندی تو کوئی بلندی میں بلندی نہیں ہے۔
 بھائی جان اُنٹیس اُنٹیس ہزار فت کی بلندی ہوتی ہے۔
 پانچ میل کے قریب ہوئی۔ دھائی کوس۔ آپ ہیں کس
 خیال میں بندہ نواز۔ آپ نے شہر کی چڑھائی کی اچھی
 کہی واللہ۔ ایک دفعہ چل کے دیکھئے تو کہ پہاڑ کیا شے ہے۔
 ع — خدا کی پناہ! تو انسان کوئی سات آٹھ گھنٹے
 میں پہاڑ کی دھائی کوس چڑھائی چڑھ سکتا ہوگا۔ ہم
 ایسے نواقف آدمی تو ہانپ ہی جائیں۔

ن — (ہنسکر) سات آٹھ گھنٹے! ماشاء اللہ! اجی جناب
 پہاڑوں کی دشوار گذاری سے آپ ابھی واقف ہی نہیں
 اس چکر کے ساتھ جانا ہوتا ہے کہ الامان کچھ نہ پوچھئے۔

ع — مگر صاحب لوگ پہاڑوں پر جاتے کیونکر ہیں -
 ہم نے تو سنا ہے کہ وہاں کوئی جاہلی نہیں سکتا اور اگر
 کوئی گیا بھی تو سخت مصیبت سے انسان کا گذر ہوتا ہے
 اور کئی فت کی چڑھائی چڑھنی ہوتی ہے بھلا عقل کبھی
 گوارا کر سکتی ہے کہ اتنی بڑی چڑھائی کوئی چڑھ سکے
 لاحول ولا قوۃ بہت ہوئی بھائی صاحب - یہاں تو بھائی صاحب
 اگر سیدھے زینے ہوں تو چالیس زینوں کے بعد دم ٹوٹ
 جائے اور جو کسی مکان کے زینے چوڑے چوڑے ہوں اور
 سیدھے چلے گئے ہوں تو معاذ اللہ ۱۰ دس بھی درپہر ہو جائیں -
 نہ کہ کوسوں کی چڑھائی چڑھنی اور کون چڑھائی پہاڑوں
 کی معاذ اللہ کا مقام ہے -

ن — (مسکرا کر) آپ بھی اُن ہی رئیسوں میں معلوم
 ہوتے ہیں جو خشکے کے کہیت دھونڈھتے ہیں - پہاڑوں سے
 بالکل ہی واقف نہیں پہاڑ کو تو آپ بالکل کھلونا ہی سمجھتے
 ہوئے ہیں - آپ کئی فت کی چڑھائی کر رہے ہیں اور
 یہ معلوم ہی نہیں کہ پہاڑوں کی چوٹیاں سات سات ہزار
 فت بلند ہیں - ہر ش تو اُڑ گئے ہونگے جناب -

تم نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے -

سردی میں اگا دگا ہی کوئی رخصت لیتا ہوتا لیتا ہو ورنہ جسے دیکھئے دورے پر۔ یہ کیا بات ہے۔

ن — حضور سبب اسکا یہ ہے کہ گرمیوں میں اکثر صاحب لوگ پہاڑ پر جایا کرتے ہیں انکا ملک تو سرد ہوتا ہے نا۔ یہاں کی گرمی ان کو بہت کھلتی ہے۔ بس اسی سبب سے کچھ دن کیلئے پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں۔

ع — یہ پہاڑ ہے کیا شئے؟ پہاڑ کا نام تو برسوں سے سنتے آئے ہیں مگر کبھی جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ جتنی مشکل اصطلاحیں ہیں وہ سب پہاڑوں ہی کے متعلق ہیں۔ مثلاً لوگ کہتے ہیں فلان کام کرنا کیا پہاڑ اٹھانا ہے۔ تو حضرت اس سے تو پایا جاتا ہے پہاڑ کوئی رزنی شئے ہے۔

ن — رزنی تو ضرور ہوگا۔ مگر آخر رزن کی بھی کوئی انتہا ہے۔ بہت رزنی ہوگا کوئی ۶ چھ من کا ہوگا۔

ع — نہیں ۶ چھ من تو کیا ہوگا اور اگر واقعی چھ ہی من ہوتا ہے۔ تو لا حول ولا قوۃ۔ کوئی ایسی رزنی شئے نہیں ہے۔ لوگ تو ہاتھی اتنے بڑے جانور کو دم پکڑ کے روک لیتے ہیں تو ہمسے نہیں دیتے۔ ہاتھی کیا اب۔ چھ من سے بھی کم ہوگا۔

سیر کہسار

از پندت رتن ناتھ سرشار

پہ۔ مار کیا شئے ہے

۱۔ عسکری - ع - نواب محمد عسکری صاحب بہادر صولت
جنگ لکھنؤ کے رئیس زادے امیر کبیر کے لڑکے ناز و نعم کے
پروردہ مگر نخاس اور نواز گنج اور حسین آباد مبارک کے
باہر قدم نہیں رکھا۔

۲۔ نور - ن - تربیت یافتہ اور تجربہ کار آدمی -

ع - (نواب محمد عسکری) کیوں صاحب یہ گرمیوں میں
صاحب لوگ رخصت کیوں زیادہ لیتے ہیں - اسکا کوئی
سبب ضرور ہے کیونکہ یہ لوگ اپنے وقت کے لقمان ہیں -
انکا کوئی فعل خالی از حکمت نہیں ہوتا اور گرمی کی
فصل میں کم سے کم فیصدی ۸۰ ضرور مہینے در مہینے
کی رخصت لینگے - آج بڑے صاحب رخصت پر ہیں اور کل
چھوٹے صاحب گئے - اور پرسوں جرنیل (جنرل) صاحب کا
اسباب لدرہا ہے - گرمیوں بھر یہی تار بندھا رہتا ہے - اور

ہیں بہ قدر مشترک کوئی معہود خارجی نہیں ہے نہ کسی خاص معہود خارجی کے مطابق ہے۔ لیکن ایک قسم کا وجدان ہے جو بہت سے جزئیات کے دیکھنے اور ان میں سے بعض اوصاف کے مشترک پانے سے پیدا ہوتا ہے اس وجدان کا نام تعقل ہے اور اسی کو کلیات کا ادراک کہتے ہیں۔

منطق میں جس چیز کو تصور کہا جاتا ہے وہ تصور نہیں بلکہ یہی تعقل ہے کیونکہ تصور کے لئے صورت کی ضرورت ہے اور کلیات کے ادراک میں کوئی خاص صورت نہیں حاصل ہوتی بلکہ بہت سے جزئیات کے استقصار سے اس طرح منتزع ہوتا ہے کہ ہم افراد کے خصوصیات کو حذف کرتے جاتے ہیں اور ایک مفہوم عام پیدا کر لیتے ہیں۔ ہم نے زید، بکر، عمرو کو دیکھا۔ ان کی جو الگ الگ خصوصیتیں تھیں مثلاً قومیت وطن، جسمانی ترکیب وغیرہ وغیرہ سب کو حذف کرتے گئے تو صرف انسانیت ایک ایسی چیز باقی رہی جو سب میں مشترک ہے یہ انسانیت خارج میں موجود نہیں اور اس لئے وہ کسی حاسہ سے محسوس نہیں ہو سکتی بلکہ جزئیات کے دیکھنے سے منتزع ہوتی ہے اس لئے اس کو تصور نہیں بلکہ شعور یا تعقل پر صرف اکتفا کرنا چاہیئے۔

بلکہ ایک حاصل شدہ صورت کا تذکرہ ہوتا ہے ۔ ہمارے
 حافظہ میں بہت سی معلومات ہیں جب ہم انکی طرف
 متوجہ ہوتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ہم نے ان کا تصور کیا ۔ اب
 اگر تصور کی حقیقت رہ رہو جو یونانی بیان کرتے ہیں تو
 معنی یہ ہونگے کہ اُس وقت کوئی نئی صورت حاصل ہوئی
 ہے حالانکہ اُس وقت کوئی نئی صورت حاصل نہیں ہوئی
 بلکہ جو صورت پہلے سے حاصل تھی اُسی کی طرف ہمارا ذہن
 متوجہ ہوا ہے کیونکہ کسی شے کی صورت اُس وقت حاصل
 ہوتی ہے جب وہ شے ہمارے حواس کے سامنے موجود ہو ۔
 اس مسامحت کی وجہ یہ ہے کہ کسی شے کی حاصل شدہ
 صورت کی یاد دلانے کا بڑا ذریعہ رویت ہے اور رویت میں اشیاء کی
 صورت آنکھ کے پردہ میں منطبع ہوتی ہے ۔ اس لئے احساسِ بصری
 میں جو صورت حاصل ہوتی ہے وہ تصور نہیں بلکہ تصور کی
 پیدا کرنے والی ہے ۔ لیکن یہ تمام ادراکات یعنی احساس
 بالفعل احساسِ مرکب، تصور محض سب ادراک کے ابتدائی
 درجے ہیں ۔ یعنی یہ سب جزئیات کے ادراک کے طریقے ہیں ۔
 کلیات کا ادراک اس طرح ہوتا ہے کہ ہم بہت سے جزئیات
 کو دیکھتے ہیں ۔ ان سب میں بعض چیزیں مشترک پاتے

کیونکہ بالذات حواس ظاہری کے ذریعہ سے حاصل ہوا ہے۔ لیکن اس میں غلطی یہ ہے کہ سب کا علم یہاں صرف حواس سے نہیں حاصل ہوا ہے۔ حواس نے صرف رنگت اور شکل محسوس کی ہے باقی اس کا مزہ اور خوشبو تو چونکہ اس کا احساس پہلے ہو چکا تھا اس لئے ہم نے قیاس کر لیا کہ جب صورت اور رنگ رہی ہے تو مزہ اور خوشبو بھی رہی ہوگی۔ اس لئے محسوس بالفعل صرف شکل اور رنگ ہے باقی گزشتہ محسوس کی یاد ہے۔ اب جبکہ ہمارے سامنے سرے سے ایک شے موجود نہیں لیکن اس کے مختلف آثار ہم پہلے محسوس کر چکے ہوں اور اس لئے اس کا خیال ہمارے ذہن میں آئے تو یہ تصور ہوگا۔ اس بنیاد پر تصور کی تعریف یہ ہوگی کہ کسی شے سے گزشتہ احساسات کی یاد۔

ان بیانات سے ثابت ہوگا کہ تصور کی تعریف جو یونانیوں نے کی تھی یعنی کسی شے کی صورت جو ذہن میں حاصل ہو رہے کئی لحاظ سے غلط ہے۔

پہلی غلطی تو یہ ہے کہ ذہن یا عقل کوئی مادی شے نہیں جس میں صورت کا انعکاس یا انطباع ہو دوسری غلطی یہ ہے کہ تصور کے وقت کوئی نئی صورت حاصل نہیں ہوتی

(۱) معض احساس بالفعل مثلاً ہم ایک سیب کو دیکھ رہے ہیں - (۲) احساس سابق اور احساس بالفعل دونوں مثلاً ہم نے شہد کو دیکھا اور اسکا مزہ جو پہلے ہم نے چکھا تھا اس وقت یاد آگیا تو اُسکی رنگت کا ادراک موجودہ احساس کے ذریعہ سے ہے اور مزہ کا ادراک گزشتہ احساس کی یاد ہے - (۳) معض تصور مثلاً ہم نے شہد کو کبھی سونگھا اور چکھا تھا - اب شہد ہمارے سامنے نہیں ہے لیکن ہم کو یاد آگیا اور اُسکے ساتھ اسکا رنگ، مزہ، خوشبو سب یاد آگئی تو انمیں سے کوئی چیز موجودہ بالفعل نہیں بلکہ احساس سابق کا تذکرہ ہے اور اس لحاظ سے اس وقت ہم کو شہد کا معض تصور ہی تصور ہے - یہاں یہ نکتہ خاص لحاظ کے قابل ہے کہ جو علم احساس بالفعل سے حاصل ہوتا ہے وہ قطعی اور یقینی ہے - اور جس میں گزشتہ احساس سے کام لینا پڑتا ہے وہ یقینی نہیں ہے - کیونکہ ممکن ہے کہ گزشتہ احساس کی یاد میں ہم نے غلطی کی ہو - ادراک اور احساس کی نوعیت کے متعلق ایک عام غلطی کی جاتی ہے کہ جب ہم مثلاً سیب کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ مجھکو سیب کا علم ہوا تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ علم بدیہی ہے

ادراک نہیں کر سکتی۔ شامہ آواز اور صورت کا احساس نہیں کر سکتی۔

اکثر چیزیں مختلف چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہیں جو مختلف حواس سے محسوس ہوتے ہیں مثلاً شہد میں لزوجیت ہے جس کو لامسہ محسوس کرتا ہے۔ رنگ ہے جو آنکھ سے محسوس ہوتا ہے۔ خوشبو ہے جسکو شامہ سے تعلق ہے۔ وزن ہے جس کا ادراک لامسہ کی استعانت سے ہوتا ہے۔

جب ہم کسی چیز کو مختلف حواس سے محسوس کرتے ہیں تو جو کیفیتیں محسوس ہوتی ہیں وہ ہمارے حافظہ کے خزانہ میں جمع ہوتی ہیں۔ اب ان میں سے جب کسی ایک کا احساس ہوتا ہے تو اس چیز کی باقی کیفیتیں ہمکو یاد آجاتی ہیں مثلاً ہم نے کسی وقت شہد کو دیکھا، چکھا اور سونگھا تھا اس سے شہد کی نسبت ہمارے حافظہ میں تین کیفیتیں جمع ہوئیں۔ رنگ۔ مزہ۔ خوشبو اب فرض کرو کہ ہم نے دور سے شہد کو دیکھا اور اُس کی خوشبو یا مزہ ہمکو محسوس نہیں ہوا۔ تاہم اسکا مزہ اور خوشبو خود بخود ہمکو یاد آجالیگی۔ اس بنا پر احساس اور ادراک کے متعدد مدارج ہیں۔

علوم جدیدہ علم کی حقیقت

علوم جدیدہ کے مسائل بعض ایسے ہیں جو بالکل حال کی ایجاد ہیں اگلے زمانہ میں ان کا نام و نشان تک نہ تھا۔ بعض ایسے ہیں جو پہلے بھی موجود تھے لیکن آج ان کی تشریح جس طرح کی جاتی ہے اگلوں نے نہیں کی تھی۔ اس سلسلہ کی ابتدا ہم پہلے اسی قسم کے ایک مسئلہ سے کرتے ہیں کیونکہ اس سے قدیم و جدید کے موازنہ کا موقع بخوبی مل سکتا ہے۔

علم کی حقیقت یونانیوں نے یہ بیان کی تھی کہ کسی چیز کی صورت جو ذہن میں حاصل ہوتی ہے اس کا نام علم ہے اس کے متعلق حصولی، حضوری، حصول اشیاء کی طویل طریق بحثیں تمام متداول کتابوں میں مذکور ہیں۔ حکمائے حال نے علم کی جس طرح تشریح کی ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:—

انسان کو خدا نے مختلف حواس دئے ہیں اور ہر حس کے مدركات جدا ہیں۔ قوتِ سامعہ صرف آواز کو محسوس کرتی ہے۔ اجسام یا رنگ اور خوشبو وغیرہ کو

پہاڑوں سے آسکتی تھی لیکن یہاں کے لوگوں کو اپنی وحشیانہ زندگی میں آب سرد کی ضرورت کیا تھی لیکن مسلمان عجم سے آئے تو وہ ایسی زندگی کیونکر بسر کر سکتے تھے۔ اکبر نے شورہ سے پانی سرد کرنے کو رواج دیا۔ پہاڑوں سے برف آکر بازاروں میں بکنے لگی۔ خس کی تٹی بھی اکبر ہی کی ایجاد ہے۔

عمارت :- فن عمارت میں جو نفاستیں اور ایجادیں پیدا ہوئیں ان کا بیان تاج گنج اور جامع مسجد دہلی کی زبان سے ہر شخص سن سکتا ہے۔ ہندوؤں کے مکانات کی جو اصلی وضع تھی اُسکی زندہ مثالیں بنارس میں آج ہزاروں موجود ہیں۔ یہ مکانات کروڑ پتیوں کے ہیں جن پر لاکھوں روپے خرچ ہوئے ہیں لیکن دروازے اتنے نیچے ہیں کہ سرکش سے سرکش آدمی کو ان کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔ ہوا کو تو کبھی کبھی ان میں آنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن روشنی کو مشکل سے بار مل سکتا ہے۔ بلند دروازے وسیع دالان شاندار شہ نشیں مسلمانوں کی بدولت ملک میں رواج پائے۔

احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے - ہندوؤں کا کیا ذکر ہے
مسلمانوں میں بھی نورجہان سے پہلے زیورات بھدے اور
ناموزوں ہوتے تھے جیسے آجکل ہندوؤں کے ہوتے ہیں -
لباس اور وضع قطع میں بھی نازک ادائیاں نہ تھیں - آج
دلی اور لکھنؤ کی بیگمات کے لباس اور وضع کی تمام
تراش خراش سب نورجہان کے عہد کی یاد گاریں ہیں جن
میں خفیف تغیرات ہوتے گئے - خود جہانگیر کہا کرتا تھا کہ
جب تک نورجہان میرے گھر میں نہیں آئی میں گھر کی
زیب و زینت سے واقف نہ ہوا -

آسائش اور آرام و راحت کے جو ہزاروں سامان پیدا
ہوئے ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا - ہندوستان میں قدرتی
تمام اشیاء پیدا ہوتی تھیں لیکن لوگوں کو ان سے کام لینا نہیں
آتا تھا - مسلمانوں کی خوش مذاقی اور جدت طلبی سے
ہزاروں چیزیں کام میں آئیں اور ایک نئی دنیا پیدا
ہو گئی - شورہ خاص یہاں کی پیداوار ہے - لیکن کسی کو
ہزاروں برس تک یہ خیال نہ آیا کہ اس سے پانی تھنڈا
کیا جاسکتا ہے حالانکہ تھنڈا پانی کی ضرورت جس قدر اسے
گرم ملک میں ہو سکتی تھی محتاج بیان نہیں - برف بھی

یہ تو قدیم تہذیب تھی - نئے فیشن نے اس پر اور بھی نئے
نئے حاشیے چڑھائے -

ہندوستان میں مسلمان آئے تو یہاں وہ حالت تھی جس کی
تصویر بابر نے کھینچی ہے کہ لنگوٹی لگائے پھرتے تھے یا مسلمانوں
نے ایک ایک چیز میں تہذیب و تمدن کی ہزاروں شاخیں
پیدا کر دیں مثلاً پہلے گھوڑوں پر زندگی پیتھہ پر سوار ہوتے تھے یا
کمبل وغیرہ ڈال لیتے تھے - تیموریوں کے عہد میں گھوڑے
کے لئے جو سامان پیدا ہوئے اُسکی یہ تفصیل ہے :-

زین - ارتک - یال پوش - پشمین روپاک - جل - تختہ بند -
پشت تنگ - مگس ران - نکتہ - قنیرہ - دست مال خرخرہ -
رکاب - آئین اکبری میں ان سب کی تصویریں بھی دی ہیں -
گھوڑوں کی تربیت، خدمت اور نگہداشت کے لئے جن نوکروں
کی ضرورت ہوتی تھی انکی تفصیل یہ ہے -

داروغہ، مشرف، دیدہ در، چابک سوار، ہاداد، مردہہ،
بیطار، نقیب، سائیس، جلودار، نعلبند، زین دار، آب کش،
فراش، سپند سوز، خاکروب -

زنانہ لباس اور زیور اور آرائش کے متعلق نورجہان
بیگم نے جو جو اختراعات کئے تہذیب و تمدن قیامت تک اسکے

ایک ایسی تھی کہ چوڑیوں کے حلقہ کی طرح الگ الگ ہو جاتی تھی اور ضرورت کے وقت حلقے ملا دیتے تو ایک توپ بن جاتی تھی۔

گولے آتشین: — اکبر کبھی کبھی راتوں کو گیند کھیلتا تھا اس لئے اس قسم کے گیند ایجاد کئے کہ رات کو شعلہ کی طرح روشن نظر آئیں۔ اس قسم کی بہت سی ایجادیں ہوئیں جن کی تفصیل ایک مضمون میں سما نہیں سکتی۔

نفاست پسندی - ضروریات کی وسعت - آسائش کے

سامان: — تمدن کا سب سے مقدم اثر یہ ہوتا ہے کہ ضروریات معاشرت بڑھتے جاتے ہیں مثلاً سادہ زندگی یہ ہے کہ زمیں پر بیٹھے اور کیلا کے پتے پر کھانا رکھ کر کھا لیا۔ تمدن آتا ہے تو یہ سامان ساتھ لاتا ہے کہ چاندنی کا فرش ہے اس پر زیر انداز، زیر انداز پر طشت یا سیلابچی۔ آدمی نے آفتابہ لیکر ہاتھ دھوئے پھر دسترخوان بچھایا گیا۔ رنگ برنگ کے مختلف برتنوں میں کھانے آئے کھانوں کی مناسبت سے ہر ہر برتن کا رنگ اور صورت شکل مختلف ہے۔ کھانا کھا چکے تو طشت، سیلابچی، آفتابہ وغیرہ آیا اب کی دفعہ ہاتھ دھونے کیلئے بیسن بھی ہے ہاتھ دھو کر رومال سے صاف کیا

ایسی بوالعجبی تھی جس کی نظیر آج بھی مشکل سے ملیگی۔
اس کا موجد حکیم علی تھا۔ جو اکبر کے دربار کا مشہور حکیم
اور موجد تھا۔ یہ حوض حکیم مرصوف نے سنہ ۳۹۰ جارس
اکبری میں بنایا تھا جس کی یہ کیفیت تھی کہ حوض کے
اندر ایک مختصر سا کمرہ تھا جس میں دس بارہ آدمی
بیٹھ سکتے تھے۔ کمرہ میں ہر طرف سے روشنی آتی تھی۔
لیکن ہوا کا رخ اس طرح قائم کیا تھا کہ پانی نہیں آسکتا
تھا کمرہ فرش و فرش سے آراستہ رہتا تھا کھانا بھی
تیار ملتا تھا۔

کل کی چکی :- یہ چکی امیر فتح اللہ شیرازی نے ایجاد
کی تھی جو سنہ ۹۹۱ھ میں اکبر کے حسب الحکم فتح پور میں
آیا اور امین الملک کے عہدہ پر ممتاز ہوا تھا۔ یہ چکی
پانی اور ہوا وغیرہ کے زور سے نہیں بلکہ خود بخود چلتی
تھی۔ آج تو یہ ایجاد ایک معمولی بات ہے لیکن اُس
زمانے میں یورپ میں بھی عجیب سمجھی جاتی ہوگی۔

توپ کی مختلف قسمیں :- اکبر کے صنّاعوں نے مختلف
طرح کی توپیں ایجاد کیں۔ ان میں سے ایک سترہ نال
کی تھی اور ایک ہی دفعہ سب نالیں سر ہوتی تھیں۔

سنہ ۱۱ جلوس میں جب اسکے دسترخوان پر مختلف ملکوں کے تازہ میوے ایک ساتھ چنے گئے تو اسکو بھی حیرت ہوئی اور بول اُٹھا کہ اس نعمت کا شکریہ کس زبان سے ادا کیا جائے۔

یہ نہیں خیال کرنا چاہیئے کہ یہ انتظام بادشاہوں کے لئے مخصوص تھا بلکہ ہرکس و ناکس کو یہ چیزیں بازار میں میسر آسکتی تھیں۔ آئین اکبری میں تفصیل سے لکھا ہے کہ کہاں کہاں سے میوہ جات آتے تھے اور تمام بازاروں میں بکتے تھے۔ آج اس وسعت اس انتظام اس ترقی کے زمانے میں ہم کو بلوچستان اور کابل سے ادھر کے میوے نصیب نہیں ہو سکتے۔ راستوں کے انتظام اور قاک کے بیان میں یہ بات بھی لکھنے کے قابل ہے کہ معمولی طریقے کے علاوہ نامہ بر کبوتر بھی تیار کئے گئے اور ان سے کام لیا گیا۔

ایجادات و اختراعات:— تمدن کی ترقی کا ایک ضروری

نتیجہ ایجادات اور اختراعات ہیں۔ تیموریوں کے زمانے میں ہر شاخ میں طرح طرح کی چیزیں ایجاد ہوئیں ان میں سے جو علمی ایجادات تھے بعض کا حال ہم لکھتے ہیں۔

ایک عجیب و غریب حوض:— یہ حوض فن عمارت کی

تالاب تعمیر کئے جائیں اور پلوں کی مرمت کرائی جائے -
 ان ہی احکام درازدہ گانہ میں یہ بھی تھا کہ تمام برے برے
 شہروں میں اسپتال بنائے جائیں جس میں سرکاری طبیب
 علاج کے لئے مقرر ہوں اور درازدہ کا صرف سرکار سے دیا جائے -
 سال اول جلوس میں جہانگیر نے حکم دیا کہ تمام
 شہروں میں غلہ خانے قائم کئے جائیں جہاں راہگیروں اور
 مسافروں کو کھانا تقسیم کیا جائے - سنہ ۱۰۲۰ھ میں اس
 صیغہ کو اور وسعت دی یعنی عام طور پر فقراء کے لئے
 لنگر خانے بنوائے -

جہانگیر نے سرک پر جو میل بنوائے تھے وہ برے برے
 چوڑے مینار کی شکل کے تھے اور آج بھی پنجاب کی راہ میں
 موجود ہیں اور ریل پر سے نظر آتے ہیں - راستے کی امن
 و امان اور سفر کی آسانی کا یہ نتیجہ تھا کہ ایران اور بغداد
 اور شام کی چیزیں ہندوستان کے بازاروں میں اس کثرت
 سے ملتی تھیں کہ خود ان ملکوں میں نہیں مل سکتی تھیں -
 دیرپا چیزیں ایک طرف - پھل اور میوے تین تین مہینے کے
 راستے سے تازہ بہ تازہ پہنچتے تھے - جہانگیر نے ایک موقع پر
 خود اس انتظام پر استعجاب کے ساتھ خدا کا شکر کیا ہے

خان کو گودا میں بھیجا کہ وہاں سے یورپ وغیرہ کے نادر جانور خرید کر کے لائے۔ مقرب خان بے شمار روپیہ خرچ کر کے بہت سے عجیب و غریب جانور لایا۔ ان ہی میں پیروز بھی تھا۔ چنانچہ اس واقعہ کو جہانگیر نے نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔

سنہ ۱۰۲۳ھ میں رلایت زیرباد سے ایک عجیب و غریب پرند چڑیا خانہ میں داخل ہوا جسکی کیفیت جہانگیر نے لکھی ہے۔

رفاہ عام کے کام عمارت و سڑک وغیرہ :- اس محکمہ کو تیموریوں نے بے انتہا ترقی دی لیکن انصاف یہ ہے کہ اس کا سنگ بنیاد شیرشاہ نے رکھا تھا۔ تیموری اس کے مقلد تھے۔ شیرشاہ نے بنگالہ سے آگرہ ماندر اور سونیپت تک راستہ میں مسجدیں، پختہ کنوئیں اور سرائیں بنوائیں اور حکم دیا کہ ہندو اور مسلمان سب کے لئے سرائوں میں کھانا مہیا رہے۔ سڑکوں کے دونوں طرف سایہ دار درخت لگائے۔

جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے پہلے ہی سال اس محکمہ کی طرف توجہ کی۔ چنانچہ احکام درازدہ گانہ میں سے دوسرا حکم یہ تھا کہ راستوں میں مسجدیں، کنوئیں اور سرائیں تیار کی جائیں۔ اس کے ساتھ یہ حکم دیا کہ جو شخص لارارٹ مرے اس کی مقررہ سے مسجدیں اور سرائیں، کنوئیں اور

ترقی دی کہ ہزار روپیے تک اسکی قیمت پہنچی اور لوگوں کو اس کی سواری سے عار نہ رہا۔ اکثر جانور ایسے ہیں جو جنگل کے سوا بچے نہیں جنتے مثلاً ہاتھی - شیر - چیتے - چکور - سارس وغیرہ لیکن تربیت کے ذریعے سے اس قدر اُن کے اخلاق اور عادات میں تغیر پیدا کیا گیا کہ گھروں میں ان سے بچے اور اندے پیدا ہوئے۔ اکبر کے ایک زمانے میں ہزار چیتوں کو یکجا کیا اور چاہا کہ نر و مادہ سے جفت ہو لیکن ناکامیابی ہوئی جہانگیر کے عہد میں اس قدر تغیر ہوا کہ ہاتھی اور چیتے مادہ سے جفت ہوئے اور بچے جنے۔

جہانگیر نے فخریہ لکھا ہے کہ میرے زمانے میں صحرائی جانور اس قدر رام ہو گئے ہیں کہ شیر اور چیتے قطار در قطار بے قید و زنجیر شہر میں چھوٹے پھرتے ہیں اور کسی کو نہیں ستاتے۔ ہتھنی - شیرنی - چکور کے بچہ جننے اور اندے دینے کا حال جہانگیر نے تزک میں لکھا ہے۔ جہانگیر نے ایک عظیم الشان جانور خانہ تیار کرایا تھا اسکو حیوانات کا اس قدر شوق تھا کہ اپنے ایجنٹوں کو دور و دراز مقامات پر نئے نئے جانوروں کے مہیا کرنے کے لئے بھیجتا تھا۔ ایک دفعہ مقرب

بالکل نہیں ہوتے تھے ضرورت کے لئے باہر سے منگوائے جاتے تھے اور اس وجہ سے ہر شخص کو میسر نہیں آسکتے تھے۔ اکبر نے اس کے لئے ایک خاص محکمہ قائم کیا اور چند روز میں نہایت عمدہ نسلیں تیار ہو گئیں۔

اجمیر - جودھپور - ناگور - بیکانیر - جیسلمیر - بہنڈا میں کثرت سے نسلیں پھیلیں۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ ایک شخص کے پاس دس دس ہزار اونت تک ہوتے تھے۔ ہندوستان کے اصلی گھوڑے پست قد ہوتے تھے جن کو اس زمانہ میں گوت یا ٹانگن کہتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں سوداگر عراق - عرب - روم - ترکستان - تبت وغیرہ سے گھوڑے لاتے تھے لیکن اکبر نے نئی نسلوں کے پیدا کرنے کا انتظام کیا اور نہایت اعلیٰ درجہ کے گھوڑوں کی نسلیں تیار ہوئیں۔ اسکے بعد گھوڑوں کی خرید و فروخت اور ترقی و نمائش کے لئے اکبر نے جو انتظامات کئے تھے اسکو ابوالفضل نے بہ تفصیل لکھا ہے۔

خچر صرف پگھلی کے علاقہ میں ہوتے تھے۔ لیکن سواری کے قابل نہیں ہوتے تھے۔ اور لوگ اس کی سواری کو گدھ کی طرح ننگ سمجھتے تھے۔ اکبر نے اس کی نسل کو اس قدر

طریقہ میں فی بیگہ چوتھائی پیداوار لی جاتی تھی - شاید ایک نکتہ چین بول اُٹھے کہ زمین کا بندوبست وغیرہ جو کچھہ کیا تھا تو درمل نے کیا تھا جو ہندو تھا لیکن یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں - ہر سلطنت میں دوسری قوموں سے بھی کام لیا جاتا ہے لیکن وہ سلطنت ہی کے کارناموں میں محسوب ہوتا ہے - اس کے علاوہ یہ بات بھی لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ تو درمل کے اکثر کاموں میں امیر فتح اللہ شیرازی کی شرکت تھی جس کے فضل و کمال کا تمام ہندوستان اور ایران میں جواب نہ تھا - ابو الفضل اسکی نسبت کہا کرتا تھا کہ ”اگر کہیں نامہ ہائے دانش مفقود شوند اور اساس نو بر نہد“ سنہ ۳۰ جلوس اکبری میں وہ امین الملک مقرر ہوا اور حکم ہوا کہ تو درمل اُسکے مشورہ سے ملکی اور مالی کاموں کو انجام دے -

افزائش و ترقی حیوانات :- کسی ملک کے تمدن کی ترقی کا ایک بڑا لازمہ یہ ہے کہ غیر ملک کے حیوانات کی نسلیں اضافہ کی جائیں ملکی جانوروں کی نسلوں کی ترقی و تربیت اور وسعت کا انتظام کیا جائے - تیموریوں نے اس صیغہ کو بے انتہا ترقی دی - اورنت اس ملک میں

اکبر کے عہد سنہ ۲۷ جلوس شاہی میں راجہ تودرمل نے زمین کی پیمائش کرائی - اس کے مختلف درجے قائم کئے اور اختلاف درجات کے لحاظ سے مختلف شرحیں مقرر کیں - لیکن دکن میں اب تک وہی قدیم طریقہ جاری تھا - شاہجہان کے عہد میں مرشد قلی خان نے جو دکن کا صوبہ دار تھا حسب ذیل انتظامات کئے :-

(۱) زمین کی پیمائش کرائی (۲) قابل زراعت اور ناقابل زراعت کی تفریق کی - (۳) تقاری دینے کا قاعدہ جاری کیا - (۴) تشخیص جمع کے متعدد طریقے مقرر کئے جنکی تفصیل حسب ذیل ہے :-

(۱) بتائی اس میں زمین کی تین قسمیں کیں - بارانی اس میں نصف بتائی مقرر کی یعنی جس قدر غلہ پیدا ہو اس میں آدھا سرکاری حق ہے - چاہی یعنی وہ زمین جو آبپاشی کے ذریعہ سے کام میں لائی جائے اس میں صرف ایک تہائی سرکار کا حق تھا - ایکھ - انگور - کیلا - زیرہ - اسپغول ان چیزوں میں نوے حصے سے لیکر چھارم تک سرکاری مالگزاری میں داخل ہوتا تھا - نہری یعنی وہ زمین جس میں نہروں سے آبپاشی کی جاتی تھی (۲) جریب اس

تھے۔ اور غالباً اُن کو گزری گارھے کے سوا اور کچھ بُنا نہ آتا
 ہوگا۔ اکبر نے دہلی، لاہور، آگرہ، فتح پور، احمد آباد،
 گجرات میں پارچہ بافی کے برے برے کارخانے جاری کیئے۔
 اور ایران اور چین سے کاریگر بلا کر ہر قسم کے قیمتی کپڑے
 تیار کرائے۔

شال جو کشمیر میں بنتی تھی اکبر نے اس کو بھی بہت
 ترقی دی پہلے صرف تین چار رنگ کی شالیں ہوتی تھیں۔
 اکبر نے طرح طرح کے نئے رنگ ایجاد کئے۔ مثلاً نارنجی،
 برنجی، قرمزی، کاہی، ارغوانی، عذابی، سوسنی، جگری، زمردی
 وغیرہ وغیرہ۔ پوری تفصیل آئین اکبری میں ہیں۔ اسکے
 علاوہ پہلے سادی شال بنتی تھی۔ اکبر نے اور بہت سی
 قسمیں ایجاد کیں۔ پہلے شال کا کارخانہ صرف کشمیر میں
 تھا۔ اکبر کے زمانہ میں خاص لاہور میں ہزار سے زیادہ
 کارخانے جاری ہو گئے۔

بندوبست آراضی اور پیمائش:۔ ہندوؤں کے زمانے میں
 تشخیص مالگزاری کا صرف یہ طریقہ تھا کہ ہل پیچھے کچھ رقم
 مقرر کر دیتے تھے۔ زمین کی پیمائش اور مختلف لیاقتوں کے
 لحاظ سے جمع کی تشخیص نہیں جانتے تھے۔ سب سے پہلے

ہندوستان میں پیدا نہیں ہوتا ہے لیکن اکبر کے زمانے میں
پستہ کا درخت بویا گیا تھا۔

پہول ہندوستان میں یوں بھی کثرت سے تھے یہاں تک کہ
جہانگیر جب کشمیر گیا تو استاد منصور کو جو شاہی مصور تھا
حکم دیا کہ خاص کشمیر کے پہولوں کی تصویر کھینچے۔ چنانچہ
سو سے زیادہ پہولوں کی تصویریں لی گئیں۔ تیموریوں کی
خوش مذاقی نے اس پر قناعت نہ کی بلکہ ایران اور
توران کے پہول منگوا کر ہندوستان کو ایران کا چمن زار بنا دیا۔
ہندوستان کے گنوار مالی باغ میں یونہی بے ترتیب درخت
لگاتے تھے۔ چمن بندی خیابان جدول تختہ بندی کا کسی نے
نام بھی نہیں سنا تھا نہ باغوں میں کسی قسم کی عمارت
اور آبشار ہوتے تھے۔ بابر نے ہندوستان میں آکر ان چیزوں
کو رواج دیا۔

صنعت اور مصنوعات: تیموریوں نے سینکڑوں قسم کی
صنعتیں جاری کیں جن سے یہاں کے اصلی باشندے نواقف
تھے۔ ان سب کی تفصیل کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت
ہے۔ ہم صرف بعض کے نام اور مختصر کیفیت لکھتے ہیں۔
پارچہ جات: ہندو ہمیشہ سے نہایت سادہ لباس پہنتے

کہاں پہنچا دیا - تہذیب و تمدن کی سینکڑوں جزئیات ہیں
 ان میں سے مختصراً ہم بعض بعض کی تفصیل لکھتے ہیں -
زمین کی پیداوار :- ہندوستان اگرچہ زراعتی ملک
 ہے اس لئے نباتات اور ثمرات کی قسم سے تمام چیزیں یہاں پیدا
 ہونی چاہئے تھیں لیکن ہندو چونکہ ملک سے کبھی نکلتے
 نہ تھے اس لئے ان کو دنیا کے ثمرات اور مزروعات کی خبر
 نہ تھی اسکے سوا ان کی قناعت پسند طبیعت کے لئے بڑھل
 کٹھل اور پھوت کیا کم تھی - تیموریوں نے یہاں آنے کے ساتھ
 اس طرف توجہ کی اور ایران و خراسان کے لطیف پھول اور
 پھل لاکر تمام ہندوستان میں پھیلا دئے - قلم اور پیوند لگانے
 سے ہندو مطلقاً واقف نہ تھے - سب سے پہلے اکبر کے زمانے میں
 محمد قلی افشار نے جو کشمیر میں داروغہ باغات تھا کابل سے
 شاہ آلہ منگرا کر پیوند لگایا اور پھر عام رواج ہو گیا تاہم
 اکبر کے زمانے تک ام کی قلم نہیں لگ سکتی تھی - اسی زمانہ
 میں اور بہت سے میوے ولایت سے آئے انناس بھی اسی
 زمانہ میں یورپ سے آیا - اس زمانے میں صندل کے درخت
 عموماً باغوں میں ہوتے تھے حالانکہ آج اس ترقی کے زمانے
 میں بھی یہاں صندل کا نام و نشان نہیں - پستہ بھی آجکل

ہندوستان میں آئے کس شان سے آئے اور ملک پر ان کا کیا اثر ہوا۔ لیکن اس مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم کو بتانا چاہئے کہ ہندوستان کی قدیم تہذیب و تمدن کی حالت کیا تھی۔ چونکہ اس مضمون میں صرف تیموری حکومت کے دور سے بحث کرنی چاہتے ہیں اس لئے اسی زمانے سے پہلے کی حالت کا دکھانا کافی ہوگا۔

اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ اس سے قبل کی اسلامی حکومتوں نے بھی ہندوستان کی تہذیب و تمدن کو کچھ نہ کچھ ضرور ترقی دی تھی تاہم بابر نے ترکستان سے آکر ہندوستان کو جس حالت میں دیکھا اسکی تصویر اُسی کے لفظوں میں یہ ہے:—

ہندوستان میں اچھے گھوڑے نہیں۔ اچھا گوشت نہیں انگور نہیں، برف نہیں، آبِ سرد نہیں، حمام نہیں، مدرسہ نہیں، شمع نہیں شمع دان نہیں شمع کے بجائے دیوت ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بابر کو قریباً چار سو برس ہوئے لیکن آج بھی ہندوستان اُس کے بیان کی عینی شہادت دینے کو موجود ہے۔ اب دیکھو تیموریوں نے ہندوستان میں آکر تہذیب و تمدن کو کہاں سے

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر

کسی غیر قوم کا کسی غیر ملک پر قبضہ کرنا کوئی جرم نہیں ورنہ دنیا کے سب سے بڑے فاتح سب سے بڑے مجرم ہونگے لیکن یہ دیکھنا چاہئے کہ فاتح قوم نے ملک کی تہذیب و تمدن پر کیا اثر پیدا کیا - چنگیز خان فتوحات کے لحاظ سے دنیا کا فاتح اعظم ہے - لیکن اسکی داستان کا ایک ایک حرف خون سے رنگین ہے - مرہٹے ایک زمانے میں تمام ہندوستان پر چھا گئے لیکن اس طرح کہ آندھی کی طرح اٹھے لوٹا مارا - چوتھے رسول کی ازر نکل گئے - بخلاف اس کے متمدن قوم جب کسی ملک پر قبضہ کرتی ہے تو وہاں کی تہذیب و تمدن دفعۃً بدل جاتی ہے - سفر کے وسائل، رہنے سہنے کا طور، کھانے پینے کے طریقے، رضع و لباس کا انداز، مکانوں کی سجاوٹ، گھروں کی صفائی، تجارت کے سامان، صنعت و حرفت کی حالت ہر چیز پر ایک نیا عالم نظر آتا ہے - ازر گو مفتوح قوم ضد سے احسان نہ مانے لیکن در و دیوار سے شکرگزاری کی صدائیں آتی ہیں - اسی معیار سے ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ مسلمان جو

اسلئے یہ ہمارے روشوں پر چلنے والوں کو دنیا میں
پہنچا دئے جائیں۔ تاکہ اس ہارے خار کو اپنا دستور العمل
بنا کر زبانِ اُردو کی ترقی میں ہمہ تن کوشاں رہیں۔
اب مجھے خیال آیا۔ کہ یہاں سے تو کوئی دنیا میں
کاٹے کو جائیگا میں لپک کر یہ ہار لے لوں۔ اور ایک
اعظم گدھے پہنچا دوں۔ اور دوسرا توڑ کر پنجاب میں پھیلا دوں۔
جہاں اس رقت حیدر آباد کے بعد سب سے زیادہ اُردو کی
ریل درزی جا رہی ہے۔ اس ارادے سے دونوں ہاتھ بڑھایا
چاہتا تھا۔ کہ ہاتھ آپس میں ٹکرائے۔ اور آنکھ کھل
گئی۔ دیکھا تو۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

اس پر حضرت آزاد نے مولنا شبلی کو مخاطب کیا اور فرمایا۔ کہ خوش قسمت ہیں آپ کہ اپنے بعد ایسے جانشین چھوڑے۔ جنہوں نے آپ کے کام کو سنبھالا۔ بلکہ اس میں اور ایسے ایسے اشخاص انہوں نے پیدا کر لئے۔ کہ اب ہر شخص اپنی اپنی جگہ شبلی ہے۔ مگر افسوس ہے ہمارے شاگردوں پر جو کچھ انہوں نے کیا ہمیں خوب معلوم ہے۔ ہمارے فرزندانِ معنوی کے ساتھ حسنِ سلوک تو کرنے سے رہے تھے۔ کم از کم انہیں ذبح تو نہ کر دالتے مگر خدا کارساز ہے۔ اس نے بچا لیا۔ اب دعا ہے۔ کہ خدا اُردو کی تمام تصانیف کو جو اس اہل مجلس کے بعد انکی نشانیاں دنیا میں باقی ہیں۔ قیامت تک نیست و نابود ہونے سے بچائے۔ بلکہ انہیں اور ترقی کے راستے نکلیں۔

اب سہانا رقت سحر قریب تھا۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ اس فرشتہ رحمت نے در پھولوں کے ہار مہکتے اور لہکتے دامن سے نکالے۔ اور ایک حضرت آزاد اور دوسرا مولانا شبلی کے گلے میں ڈال دیا۔ ان دونوں نے اسکو دیکھا سونگھا اور فرمایا۔ کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے آنے کے بعد ہمیشہ تک یہ راستہ چلتے رہیں۔ اور یہ کام جاری رہیں۔

مگر علم و فضل اور زبان دانی و زبان آری میں جو سنگلاخ میدان انہوں نے مارے ہیں۔ اور جو جو نظم کی دشوار گزار گھاٹیوں کو چیر کر نئے انتظام کے ساتھ نظم کی تخم ریزی کی ہے۔ اس کی گرد کو بھی کوئی شخص نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے میں اپنے عزیز و محترم مولینا کو صدارت کا تاج پہنا کر اردو کی شان کو دربالا کرتا ہوں۔

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے۔ اور مولینا کا ہاتھ تھام کر تخت پر بیٹھا دیا۔ مولینا ایک خاص لٹک سے سنبھل کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور سب کی طرف محبت خیز نگاہیں ڈالیں۔ مگر مولینا شبلی نے کچھ ایسی چشمک سے نظر لڑائی کہ مولینا مسکرائے۔ اور فرمایا جو کچھ ہم کر چکے وہ ہو گیا اب تمہارے جوابوں سے وہ اثر مت تھوڑی سکتا ہے۔ تم سے جو کچھ بن پڑا کم نہیں کیا۔

اب ہر طرف سے تحسین و آفرین کی صدائیں پسندِ عام کے غلغلے بلند ہوئے سونے اور چاندی کے پترے ہوا میں لرزتے دیکھائی دئے وہ رات سلطانِ آسمانی کو اسقدر بھائی کہ حکم ہوا۔ جو کچھ تم لوگ مانگ سکتے ہو مانگ لو۔ کہ آج کے لئے بہت بخششیں اُٹھا رکھی تھیں۔

ہوئی - تحقیق کرنے سے معلوم ہوا - کہ اس مستانہ باغ
 میں گہستے ہی وہ ایک چھوٹے سے پارک میں چلے گئے -
 وہاں جذب کی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں - اور استغراق کے
 فرگس کسی کے انتظار میں نگران تھے - معلوم ہوتا ہے -
 کہ یہ وہیں معر ہو کر رہ گئے - یہ سنتے ہی اکثر دردمند
 ادھر کو دوڑے - اور حضرت آزاد کو سمجھا بچھا کر ادھر
 لے ہی آئے -

حضرت آزاد دور سے آئے دکھائی دئے - تو نثر کے
 علم برداروں نے جھنڈے بلند کئے - انشا پر دازی کے مورروں نے
 پر پھڑ پھڑائے - خوشی کے نقارہ پر چوت پڑی - نثر کی
 تکیسال میں حضرت آزاد کے نام کے سکوں پر ضرب لگ گئی -
 سب اہل بزم دروازہ تک استقبال کو آئے - خوش آمدید
 اور خوشا آدرید کے شور و ولولے سنائی دئے - سب آنکھوں
 اور پلکوں پر اندر لائے - تو پھر وہی صدر کا قصہ شروع
 ہوا - سب کی نگاہیں حضرت سید پر پڑیں - مگر وہ اٹھے
 اور فرمایا - کہ اے میرے پرستارو - جو کچھ تمہارا خیال
 ہے - وہ سب کچھ درست - مگر حق یوں ہی ہے - کہ اگرچہ
 ظاہر حضرت آزاد مجھ سے سن ر سال میں چھوٹے ہیں -

تھا۔ فلک کچھ رفتار نے آفتاب کو چکر دے کر مغرب کے
 کونے میں ذبح کر ڈالا تھا۔ جسکی چھینٹیں شفق بن بن کر
 گواہی کے لئے اگٹی تھیں۔ کہ شام کے چوبدار نے رات کی
 سواری دنیا کے دروازے پر لا کھڑی کی۔ پرندوں نے شاخوں
 پر شب نواز گیت گائے۔ درندوں نے رات کو آرام کے لئے
 چشموں کے کنارے دھونڈے۔ ملک شہرت کے ستاروں نے
 دھان کی آخری محفل آرائی کے لئے اپنی آرائش کا سارا
 تھیلا اُلت دیا۔ مشرقی فانوس خیال میں مغربی بجلی نے
 روشنی کے اندے بہم پہنچائے۔ آس پاس کے سمندروں نے
 نسیم جانفزا کو تھنڈا کر کے ادھر کو بھیجا۔ غنچے مشک
 و عنبر کی گرہیں کھولنے لگے۔ سارا مکان ایک بقعہ نور بن
 گیا۔ تو کارپردازانِ مجلس نے دربار شہرت کی جگمگی
 کرسی سنگِ مرمر کے تخت پر لا کر بچھائی اور نہایت ادب
 و احترام سے آراز لگائی۔ کہ صاحب صدر کا انتخاب کیا جائے۔
 سب کی نگاہیں ایک دوسرے سے لڑیں۔ اور آپس میں
 کن انکھیرن میں باتیں شروع ہوئیں۔ تو ہر طرف سے آرازیں
 آئیں کہ حضرت آزاد کو بلاؤ۔ وہ اب تک کیوں نہیں آئے۔
 اب تو سب کو خیال ہوا۔ اور ادھر ادھر سرور کو جنبش

میں آچکی ہے اور اب کوئی فرد ایسا باقی نہیں - جو دربار شہرت میں آنے کا حق رکھتا ہو اور کسی وجہ سے نہ آیا ہو - کہ اتنے میں دروازہ پر ایک گروہ اور نازل ہوا کہ لباس فقیرانہ - انداز زندانہ - کلائیوں میں لوہے کی چوڑیاں چھنکاتے - ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے دندے بجاتے - منہ سے طرح بہ طرح کی نظمیں پڑھتے سارے مکان کو گھیر لیا - دریافت کرنے سے معلوم ہوا - کہ حضرت نظیر اکبر آبادی کے چیلے چائٹے ہیں - انہیں شکایت ہے - کہ ہم لوگ اور ہمارے پیشوا ملا نظیر تمام دنیا میں قسم قسم کا فلسفہ اس بھیس میں پھیلانے رہے - مگر افسوس ہے آپ حضرات کی پہچان اور ناقدر شناسی پر کہ ایک دفعہ بھی ہمارا نام کسی کی زبان سے نہ نکلا - ملا تو آسمانِ تخیل سے گذر کر فنا کی منزل میں جاگزیں ہو گئے - مگر ہماری شکایت برقرار ہے - جب یہ خبر دربار میں پہنچی تو سب نے افسوس کیا - مگر اب کیا ہو سکتا تھا - اب حیات ختم ہو چکا تھا - وہیں کے کسی چشمہ سے پانی لیکر ملا کے نام پر چہر کا - اور پھر انہیں کو واپس دے دیا - کہ جاؤ - ملکِ خدا فراخ ہے -

آمد آمد شب کی خبر گرم تھی - دن کا خون ہو چکا

کی ایک صف میں ایک بلند جگہ پر لے جا کر بٹھا دیا ان کے
 تشریف رکھتے ہی مغربی خاتونوں کی طرف سے ایک درخواست
 گذری کہ تمہارے اس فلسفی نے تمام عمر ہمارے خلاف
 زہر پھیلایا ہے۔ اسکو ایسے مقدس دربار میں اس قدر عزت
 نہ ملنی چاہیئے۔ مگر اس کاغذ کی پشت پر مصلحت وقت
 اور اصلاح قوم لکھ کر واپس کر دیا۔ کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔
 ابھی متانت اور سنجیدگی کے پُرزے ہوا میں اڑھی رہے
 تھے۔ کہ ایک طرف سے ایک اور بادل گرجا اور اس میں سے
 ایک کرشن کنہیا ترکی ٹوپی پہنے آتے۔ بیٹھتے۔ لڑتے۔ بھاگے
 آئے۔ ہاتھوں میں کچھ کتابیں بھی تھیں۔ مگر دیکھنے کی نوبت نہ
 آئی۔ زبانی ہی سب کچھ ادا ہو گیا۔ انہوں نے پہلے منہ بسورا۔
 پھر کھل کھلا کر ہنسنے۔ اور فرمایا۔ کہ ابھی کیا ہے۔
 گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔ گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔
 اس نرالی آواز کو سن کر سب حیران ہوئے۔ نقیب نے آواز
 لگائی۔ کہ حضرت مولینا رتن ناتھ سرشار یہ ہی ہیں۔ سب
 خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ مگر تصانیف کو دیکھ کر ان کی
 محنت پر افسوس ہی ہوا۔
 معلوم ہوا۔ کہ یہ سب خلقت سمت کر اس قصرِ عالی شان

پر تہذیب و طریقہ نے خوب خوب تالیاں بجاائیں - یہ لوگ جب
 عین صدر میں پہنچے - تو ایک ضعیف و کمزور جٹلمیں کو
 فوراً کندھوں پر اُٹھا لیا - وہ شخص عجیب و غریب مزاج رکھتا
 تھا - کبھی ہنستا تھا - کبھی فلاسفروں کی طرح سرچ و بچار
 میں جا پڑتا تھا - کبھی آسمان کی طرف دیکھتا کبھی اپنے آپ کو
 دیکھ دیکھ کر کھلا جاتا تھا - اور پھر ان سب باتوں کے باوجود
 درنوں ہاتھوں میں در طپنچہ لٹے تھا - اور سینکڑوں پیٹیاں
 چہروں کی کمر سے باندھے رکھی تھیں - گھڑی گھڑی درنوں
 طپنچوں کو بھرتا اور اپنے آسمان کی جانب مارتا - کہ یہ اہل
 مغرب کو لگیں گے - اکثر طپنچے سر سید کی طرف رخ کر کے
 خالی کرتا - باقی دھڑا دھڑا اپنے ہی گروہ پر خالی کٹے جاتا -
 مگر وہاں کچھ ایسی بے خبری کی شان نظر آرہی تھی - کہ
 وہ تعلیم یافتہ گروہ جو ان کو سرپر اُٹھا کر لایا تھا - اس
 نشانہ بازی سے زخمی ہوتا - مگر تس سے مس نہ ہوتا اور نہ
 ان کی طرف کبھی پھری ہوئی نگاہ سے دیکھتا - بلکہ ہر دم
 لحظہ بہ لحظہ زیادہ گریدہ ہوتا چلا جاتا - ان کے اس انداز
 رندانہ سے معلوم ہوا - کہ حضرت اکبر الہ آبادی زبان اردو میں
 نئے پھول کھلا کر آئے ہیں - سر سید نے گلے سے لگایا - اور سامنے

سرمایہ شاعری حضرت پیارے صاحب رشید لکھنوی ہیں۔
جنہوں نے مراٹھی کی میراث ہوتے سائے غزل اور رباعی کے
ملکوں پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔ سب نے ادب کی گردنیں
جھکا دیں۔ اور میر صاحب کے علم کے نیچے ایک کرسی بچھا کر
بٹھا دیا۔

اس وقت دن ڈھل چکا تھا۔ اور ہال میں تل دھرنے
کی جگہ باقی نہ تھی۔ فرش و کرسیوں سے لیکر گیلری اور
چھت پر آدمیوں کے تہتہ کے تہتہ لگ چکے تھے۔ کہ ایک حضرت
اژدہام کو چیرتے شائقین کو ڈھکیلتے زبردستی اندر چلے آئے۔
دیکھا تو بہت بھاری بھرکم۔ خواہ مخواہ مرد آدمی ہیں
جب گفتگو پر نوبت آئی۔ تو معلوم ہوا۔ کہ اردو معلے ان
کی جاگیر ہے۔ نام و نشان کی جگہ قرہنگ آصفیہ کی چارون
جلدیں نکال کر سامنے رکھ دیں۔ سب نے محنت اور جانکاهی کی
داد دی۔ اور نہایت قدر و منزلت کے ساتھ برابر میں
بٹھا لیا۔ اب محفل کا رنگ بدلنا شروع ہوا۔ نکھت مغرب
عجب ساز و سامان ساتھ لائی تھی۔ کہ اکثر کے لباس دیکھتے
دیکھتے رنگ تبدیل کرنے لگے کہ اتنے میں ایک بہت بڑا
عظیم الشان تعلیم یافتہ گروہ داخلِ دربار ہوا۔ ان کے آنے

ہوائیں چلیں - تخت کے آس پاس در علم بندہ رہے تھے - ان
 کے پھریرے لہرائے - راہ راہ - اے سبحان اللہ کا شور اُٹھا -
 تو سامنے کے بڑے دروازہ سے شعرا کا جہرمت آتا دکھائی دیا -
 رضع قطع اہل اکھنؤ کی سی تھی مگر جو صاحب فن آگے آگے
 راستہ دکھاتے چلے آتے تھے - ان کے لفظ لفظ پر دلی والوں کے
 کان کھڑے ہو رہے تھے - اور اپنی ہم وطنی کی خوشبو آتی
 تھی - وہ بلند و بالا مگر نحیف و نزار - لاغر اندام - سرخ و
 سپید چہرہ پر بڑھاپے نے جھریاں ڈال کر رونق بڑھادی تھی -
 ان کے آنے پر پسندِ عام کے شور مچے - وہ پہلے میرانیس کے
 جھنڈے کے پاس کھڑے ہوئے - پتکے کو آنکھوں سے لگایا -
 بوسہ دیا - اور وہیں کھڑے کھڑے رعشہ دار ہاتھ اُٹھا کر یہ
 رباعی پڑھی -

ایسا بھی نہ انقلاب دیکھا ہوگا -

کب میری طرح شباب دیکھا ہوگا -

کہتا ہوں جو میں کہہ تھی جوانی میری -

میری کہتی ہے کہ خواب دیکھا ہوگا

سب کے منہ سے بے ساختہ ہائے نکلا - اور تحسین کے سر ہلے تو

سب نے پہچانا - کہ میرانیس کے نوا سے - میر عشق و تعشق کے

علامہ خرد بھی کبھی کبھی کھلم کھلا چوٹیں کرتے تھے - مگر
 اس میں زبانِ لطفِ سخن سے آسمان پر پہنچ جاتی تھی -
 معلوم ہوا کہ ایک امیرمیںائی لکھنوی اور دوسرے مرزا داغ
 دہلوی ہیں - مرزا داغ کی عوام پسند غزلیں ہر طرف اس
 زور سے گونجیں - کہ امیرمیںائی اس رنگ سے گھبرا گھبرا گئے -
 مگر رقت کی مجبوری اور پسندِ عام پھر ادھر کو لے آتی
 تھی - ان حالوں کو دیکھ کر حضرت جلال لکھنوی آگے بڑھے -
 اور درنوں کا ہاتھ تھام ادھر ادھر لے کر بیٹھ گئے -

سب اہل مجلس تو اس منظر میں مست تھے - کہ ایک
 خاموش ہستی ایک طرف سے آکر سب شعرا کے پیچھے کھڑی
 ہو گئی - جب کیفِ سخن سے طبیعتیں ذرا سنبھلیں - تو سب
 استقبال کر کھڑے ہوئے - خاندانی جاہ و جلال کے لحاظ سے
 آنکھوں پر ہتھایا - انہوں نے کچھ عجب انداز سے اشعار اور رباعیاں
 سنا کر سارے جہان کو مسحور کر لیا - کلام اگرچہ مستانہ اور
 نصیحت انگیز تھا - مگر کہیں کہیں غم کی جھلک صاف
 نظر آتی تھی - معلوم ہوا کہ دردِ مانِ گورگان سے مولینا
 راشد بھی ہیں -

اب مشاعرہ خرب گرم ہو چکا تھا - فصاحت و بلاغت کی

میں ایسے مست تھے کہ خدا جانے انہوں نے اپنے آپکو
کہاں اور کس حال میں سمجھا کہ بیٹھتے ہی فرمایا -

میری تڑپ ہوئی توبہ کے تکرے
اٹھا لادر در پیر مغاں سے
کہ ان کو جوڑ کر پھر توڑ دالوں
یہیں پر ایک جامِ ارغواں سے

اس پر ہر طرف سے راہ راہ کا شور اٹھا اور تعریفوں کے
پھول برسے - وہ مسکرائے اور ایک نہایت عالیشان کرسی پر
بیٹھ گئے - معلوم ہوا کہ یہ مرزا نوشہ کے شاگرد رشید میر
مہدی مجروح ہیں اس پر فرشتہ رحمت نے سخن فہمی
کا خلعت اُنکے کندھوں پر ڈال ہی دیا -

اس راہ راہ کے شور میں عشق مجازی کی پتلیاں ناچتی
ہوئی نظر آئیں - معلوم ہوا کہ یہ سب در شعراء خاص کر
استقبال کر کے لائے ہیں - یہ دونوں ایک ہی دفعہ اور
ایک ہی دروازے سے اندر آئے - انہیں سے ہر شخص محفل
کو اپنی طرف مخاطب کرنا چاہتا تھا - اور جس طرف منہ
کر کے کوئی شعر پڑھ دیتا تھا - پرے کے پرے اس پر تعریفوں
کے ساتھ جھکے پڑتے تھے - دوسروں کی نکتہ چینوں کے

میں لئے ہے۔ یہ جواںمرد کچھ عجب مسکراہٹ سے دربار
میں آیا۔ آتے ہی جلسہ کو گرما دیا۔ بات کرتا شعر پڑھتا
تو منہ سے پھول جھرتے۔ موتی برستے۔ بعض اوقات وہ
موتی کچھ آدمیوں کو تعصب کے شرارے بھی معلوم ہوتے
مگر پھر فوراً وہ چنگارے بھی انہیں موتیوں میں مل جاتے۔
زبان اردو کی خدمات کی فہرست پیش ہوئی تو سب
شددر رہ گئے۔ سب کے اتفاق سے تحقیق کا خلعت پہنا کر
محققین میں اول درجہ پر بٹھا دیا گیا۔ اگرچہ عرب و
عجم کے حاسد بہتیرا شور مچاتے رہے کہ یہ اگر محقق
ہونگے تو اردو کے ہونگے۔ ہم سے کچھ واسطہ نہیں مگر
خدمات نے کارگزاری کے رومال سے سب کا منہ بند کر دیا
اور ہر طرف مولینا شبلی کا طوطی بولنے لگا۔ اب خاصہ
دن نکل آیا تھا۔ رنج و غم کے بادلوں کے چھوٹے چھوٹے
تکرے پھٹ پھٹ کر عیش و نشاط کی گھنگھور گھٹاؤں میں
شامل ہو رہے تھے کہ گل و بلبل والے دروازوں سے بھی
داخلہ شروع ہوا۔ سب کے آگے آگے ایک بزرگ۔ گردن
ذرا جھکی ہوئی ضعیف صورت۔ جوان سیرت آئے۔ اردو
شاعری اُن پر فخریہ شعر پڑھتی تھی اور وہ خود تخیل

دفتر اس قدر بے حساب ساتھ لائے تھے کہ دربار شہرت میں
اس کی سمائی نہ ہو سکتی تھی - وہ تو باہر ہی رہا -
مگر یہ خود اندر آئے - اُردو نے فلسفہ و تاریخ کا چتر لگا کر
حساب کا پیمانہ سامنے بچھایا اور سب سے بلند جگہ پر
بٹھا دیا اگرچہ عوام ہر طرف سے ناک بھونچتے رہے -
مگر یہ اپنا کام کئے ہی گئے پتہ چلانے سے معلوم ہوا کہ
شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ یہ ہی تو ہیں -

اسکے بعد فضائے عالم میں ایک غلغلہ مچا کہ سب کے
کان گنگ کر دئے - دیدہ دیدار کے دروازے کھلے - شعر و
شاعری کی نسیم چلی - بلبلوں نے نغمہ سرائی شروع کی -
غذیہ چٹکے - پھول مسکرائے تو سب کی نگاہیں باہر کو لگ
گئیں بقیوں نے خبر دی کہ کوئی مرد میدان اس آن بان
سے آیا ہے کہ پہلے آنے والوں کی شان اس کے کلام کے رواج
میں روٹی کے گالے بن بن کر آ رہی ہے - ظاہرہ جاہ و
حشم کے علاوہ ہزاروں بادشاہوں کی روحیں سایہ افکن ہیں -
فارسی شعرا بھی دامن کے ساتھ لپٹے چلے آتے ہیں - عرب
و عجم کے محدثین بھی راستہ بتا رہے ہیں اگرچہ لباس
علما کا زیب بدن ہے - مگر دل گردہ محمود و تیمور کا پہلو

اُردو انشا پر دلازی کے موکل آگے بڑھ کر ہاتھ چومنے
 تے۔ مگر یہ مسلمانوں کا سینا پتی ہاتھ کھینچ کر قومی چنڈے
 جمع کرتا تھا۔ اور سر سید کی جھولی میں لا کر ڈھیر
 کر دیتا تھا۔ اگرچہ تصانیف کے ذخیرے میلوں میں پھیلے
 پڑے تے۔ مگر بغل میں ایک حمال تھی۔ کہ سورج کی
 چمک کو ماند کئے دیتی تھی۔ یہ اسی پر نازاں تے۔ کہ
 زبانِ اُردو میں اسی نے بگڑی بات کو بنایا تھا۔ اگرچہ
 اُن کی حسنِ خدمات نے ایک جہان کو گردیدہ کر رکھا تھا۔
 مگر حسد کی چھاؤنی کے سامنے سے ہو کر انہیں بھی گذرنا
 پڑا۔ منہ در منہ تو کوئی حملہ نہ ہو سکا۔ مگر بیٹھتے ہی
 پشت پر ایک کفر کا تیر اس زور سے لگا کہ بے چین کر دیا۔
 درد مند دوزے اور پیسکان کو کھینچ کر نشانچی کے ہی توپ
 جیسے بدن میں بھونک دیا۔ یہ ڈاکٹر نذیر احمد تے۔ ان کو
 سر سید نے خود اپنے برابر بٹھا لیا۔

انکے بعد علوم و فنون کی خشک ہوائیں سرسرائیں۔
 ساتھ ہی بابِ تاریخ و حساب سے ایک پیرانہ وضع داخل
 محفل ہوئی۔ فکر و غور کرتے کرتے چہرے پر ایسی ہوائیاں
 آ رہی تھیں کہ کوئی پہچان نہ سکتا تھا۔ اور تصانیف

گھڑی گھڑی مجھے میں سے رومال کھول کر آنسو پونچھ لیتے
 تھے۔ انہوں نے آئے ہی ایک چھوٹی سی کتاب نکالی۔
 اور دونوں ہاتھوں پر رکھ کر سرسید کے سامنے نذر
 گذرانی۔ سرسید نے اٹھا کر آنکھوں سے لگائی۔ اور ہاتھ
 بلند کر کے چاہتے تھے۔ کہ کچھ دعا کریں۔ جو بقائے دوام کی
 ہوا لے اس کو ازا کر سارے جہان پر پھیلا دیا۔ معلوم ہوا۔
 کہ وہ کتاب مسدس تھی۔ اور یہ خود مولینا حالی مرحوم
 فرشتہ رحمت نے ان کو سرسید کے پہلو میں مسند دار زریں
 کرسی پر بٹھا دیا۔

درد و محبت کے دروازے کے ساتھ ہی جاہ و منصب کا
 درِ ملا ہوا تھا۔ اب کے وہ بھی کہلا۔ ہیبت اور دبدبہ کے
 عود دانوں میں انگریزی حیدر آبادی خوشبوئیں روشن
 کی گئیں۔ تو ایک بزرگوار نہایت تزک و احتشام سے داخل
 حال ہوئے۔ سر پر علم کا طرہ لپٹا ہوا تھا۔ کندھوں پر
 ایک بڑا گون پڑا تھا۔ کہ کئی نازک ہاتھ اس کو اٹھائے
 لارھے تھے۔ تصانیف کے ذخیرے انبار در انبار ساتھ تھے۔
 خدا نے اس شخص کو عجب آتش فشانی عفایت کی تھی۔
 کم ہر لفظ مذہ سے نکل کر مطلع عالم کو روشن کر دیتا تھا۔

بے خبری کے عالم میں خبر نہ ہوتی تھی - مگر دنوں طرف در بزرگ سفید ریش اور بھی ساتھ تھے - کہ دیکھنے والوں کو همزاد کا دھوکہ پڑتا تھا - رہ لحظہ بہ لحظہ سنبھالتے تھے - اور لئے چلے آتے تھے - جب یہ کمرے میں داخل ہوئے - تو ہر طرف سے سدا بہار پھولوں کا مینہ برسا - فرشتہ رحمت نے نہایت تعظیم و تکریم سے سنہری کرسیوں پر بٹھا دیا - معلوم ہوا - کہ پہلے بزرگوار تو مسلمانانِ ہند کے بیڑے کے ناخدا سرسید علیہ رحمۃ ہیں - اور یہ سایہ کی طرح نواب محسن الملک اور وقار الملک ساتھ ساتھ ہیں - ان لوگوں کے ہاتھ میں اگرچہ عام خیر خواہی کے گلاب پاش تھے - اور جگہ جگہ خوشبو کی جگہ اپنی جان تک چھڑکنے سے گریز نہ کرتے تھے - مگر ناقدِ شناسوں کی صف میں کئی تیر انداز تھے - تعصب کے ترکش میں سے کفر و الحاد کے تیر لیتے اور حسد کی کمان میں جوڑ کر مار ہی دیتے تھے جس سے دامن ضرور چھد جاتے تھے -

ان کے پیچھے ایک اور بزرگ صورت جوان سیرت خرامان خرامان آئے - ہمہ تن نیکی اور اخلاق کا فروتر تھے - چہرہ شگفتہ تھا - مگر دل پر کچھ ایسی چوت کھائی تھی کہ

برپا ہو گئی - تباہی کے جھکڑ چلے بربادی کی آندھیاں آئیں -
 سینکڑوں سر خزان کے پتوں کی طرح اڑتے نظر آئے -
 کچھ ایسا وحشت خیز منظر بندھا - کہ غدر دہلی کے افسانے
 آنکھوں میں پھر گئے - ہر طرف سے رونے پیتنے کی آوازیں -
 نالہ رشیوں کی فریادیں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی -
 کہ مغرب کی طرف سے ایک امن کے بادل کا ٹکرا آیا - اور
 آمان کی چھینٹوں سے گرد وحشت کا منہ کھلا - ذرا سکون
 ہوا تو اس غبار قیامت آثار میں سے ایک پیر مرد - خضر صورت -
 عیسیٰ حکمت بر آمد ہوئے - تیوری پر کئی بل تے - کہ
 رنجِ عالم کی زیادتی کی ترجمانی کر رہے تھے - تمام کپڑے خون
 کی بوندوں سے افشاں بن رہے تھے - ایک ہاتھ دل پر تھا دوسرے
 میں تہذیب الاخلاق کا بستہ تمام رکھا تھا - گلے میں ایک
 جھولی لٹک رہی تھی - جس پر سنہری لفظوں میں قومی
 چندہ لکھا ہوا تھا - رقرار و متانت زیادہ بولنے نہ دیتے تھے -
 مگر جس وقت نصیحت و حکمت کے سگے اردر کی ٹکسال
 میں ڈھل کر نکلتے - تو زبان اردر پیروں پر لوٹتی اور درد
 بھرے الفاظ پتھر کو پانی کر دیتے تھے - قومی تعلیم و اخلاق
 کے سدھارنے میں اسقدر غلطان و پیچان تھے - کہ اکثر

اس ایوان خاص کے بیچوں بیچ صدر میں سنگ مرمر کا
 ایک مرصع تخت دھرا تھا۔ کہ پایوں کے بجائے انشا پر رازی
 کے پری چہرہ طاؤس بازوؤں پر لئے کھڑے تھے۔ جب وہ اپنے
 پروں کو جنبش دیکر تھرتھراتے معلوم ہوتا۔ کہ ابھی آسمانِ تخیل
 پر لے آئیں گے۔ اس تخت کے دونوں طرف دو علم نصب
 تھے۔ جن کے ادائے ارتعاش سے ہوا عطربیز ہو کر دل و دماغ
 کو تازہ کر دیتی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ انکے پھریرے
 خود شیکسپئر اور ملٹن نے اپنے ہاتھ سے تیار کر کے بھیجے
 ہیں۔ ان میں میرانیس اور مرزا بیر کی تصویریں کشیدہ
 کی گئی تھیں۔ کہ وہ خود تو دنیا کی شہرت کو مذہب کے
 نام پر قربان کر کے سلطان آسمانی کے پاس عالم قدس میں
 چلے گئے۔ مگر انکا کلام ہمیشہ کے لئے اُردو زبان کی مردہ
 روح کو تازگی بخشتا ہے۔ اور درفشِ زبان دانی کی بلندی اور
 معاررے کی پابندی ہندوستان سے آکر فردوسی کو شرمندہ
 کرتی ہے۔ اور استادِی کا پھریرا ہوائے اُردو میں ہمیشہ لہراتا
 رہے گا۔ تاکہ بھولے بھٹکے اس سے راستہ پائیں۔

تھوڑی دیر بعد آمد آمد کی آوازیں آئیں۔ اور داخلہ
 کا طبل گونجا۔ ساتھ ہی ایک طرف سے شور اُٹھا۔ کہ قیامت

کھلنے شروع ہوئے سب سے پہلے دھبی کارپرداز جو سلطان آسمانی کی طرف سے درجے اور امتیاز قائم کرنے آیا تھا - صدر دروازہ سے باہر نکلا - اور سب گروہوں کے نام کے تختے علیحدہ علیحدہ دروازوں پر آویزان کر کے اندر چلا گیا - تاکہ سب لوگ اپنی باری پر اندر آئیں - اور اپنے مراتب و مناصب کے مطابق بیٹھ جائیں - اب میں حیران کھڑا تھا - کہ کیا کروں - اور کہاں جاؤں - کہ اتنے میں قسمت نے یاری کی - اور اسی فرشتہ رحمت نے اشارے سے اندر بلا ایک گوشہ خاموشی میں بٹھا کر عجائب بین عینک آنکھوں پر چڑھا دی -

اس ایران نشست کی سجاوٹ اور بناوٹ کا کیا کہنا ہے - گلکاری کی دیواریں ہر طرف گلزار کھلاتی تھیں - چہتوں کی جگہ ابری دار پربہار بہاری پتھر محرابی تراشوں میں کات کر رکھ دیئے تھے - فرش کے پیل بوٹوں نے نگارخانہ چین کو مات کیا تھا - دیواروں پر موزوں گیلری مقیش کی جہال کی طرح بل کھاتی تھی - غرضیکہ چاروں طرف مانی و بہڑاد کی روحیں اہتمام کرتی پھرتی تھیں - اور نکتہ نکتہ پر ترپتی تھیں -

شعرا بذلہ سنجوں لطیفہ طرازوں کی بدولت ایسے ایسے گوناگون سامان فراہم ہو گئے۔ کہ جن سے ان رنگ رلیوں پر ایک سے ہزار رنگ چڑھ گئے۔ اور اسی طرح جشنِ نشاط میں ایک ہفتہ برابر گذر گیا۔ تو سلطان آسمانی کی طرف سے منادی ہوئی۔

چونکہ اس بند محل کے کھلنے کا وقت قریب آیا ہے۔ یہ -بز عیش و نشاط بند اور زمزمہ اور ہمہ موقوف ہونا چاہیئے۔ تاکہ دربار عام آراستہ کیا جائے۔ اور ہر زندہ جارید اپنی جائے مناسب پر ہمیشہ کیلئے متمکن ہو جائے۔ جب اس طرح سکون و طمانیت قائم ہوئی۔ تو سب اپنے اپنے جرگے بنا کر علیحدہ علیحدہ چھٹ گئے۔ تاکہ الگ الگ دروازوں سے اندر پہنچ کر اپنے مرتبے اور عزت کے مطابق اقامت گزیں ہو سکیں۔

نشاط منتظرہ کے طرب انگیز لمحات غایت اشتیاق و بے تابی کے ساتھ بسر کرنے کے بعد ابھی صبح کا نور فضا کے عالم میں پھیل ہی رہا تھا۔ کہ نقیبوں کی دلکش آرازیں نے خون میں جنبش اور رگ و پے میں حرکت پیدا کی۔ اور ساتھ ہی اس قصرِ عجابت کے دروازے خود بخود

نشاط انگیز بدلیاں گھر گھر کر آئیں - مسرت خیز اور دل
 آریز پہواروں نے رائی سے پریت تک کو عروسِ بہار بنا کر
 سامنے کھڑا کر دیا - اور باغ کا وہ پُرکیف سمادِ بدم دل
 میں اترنے لگا - وہاں کے خدمت گار کہ فارسی نژاد اور
 ترک بچہ ہی ہونگے - فوراً شعرا کی خدمت پر جھکے - ان
 بیچاروں نے بھی مدتوں کے بعد آنکھیں سینکیں - اسپر طرہ
 یہ ہوا - کہ حضرت گلزارِ باشی مدارات اور مہمان نوازی
 کے سلسلے میں عام اجازت دیدی - کہ ہمارے نڈے مہمان
 نے اپنی تنہائی کا غم - منزلوں کی تکان جس شئے سے دور
 ہوتی دیکھیں - بے تکلف منگالیں -

چنانچہ اس اعلان سے دن عید اور رات شبِ برات بن
 گئی - اور جن صناعتوں کی صنعت گری اور ندرت کاری
 مردہ دلوں کو شگفتہ کرتی تھی - انہیں بلاوے بھیجے گئے -
 کہ آؤ - خوشی کا روپ بھر کر اس عید کے ہنگامہ کو اور
 چار چاند لگاؤ - گویے اور کلارنت بچے گانے بجانے میں اپنی
 ساری استادی ختم کرنے لگے - راگ رنگ کے ماہرین بھی
 مہمانوں کے سامنے اپنی کل کل توڑ کر ناچنے لگے -

اس عیش گاہ میں مزید شوشہ یہ نکلا - کہ ہمارے

نظر آتا ہے۔ کہ اس زرخش خلد کے اندر ایک قصرِ عالی شان
باغ کے عین وسط میں انگڑھی پر نگینہ کی طرح جڑا کھڑا
ہے۔ رہ اتنا وسیع رفیع اور ایسا پُرشکوہ و باعظمت معلوم
ہوتا ہے کہ بھول بھلیاں بھی اسکے سامنے آئے۔ تو سیٹی گم
ہو جائے۔ گویا شک و شبہ نے خود اس کا نقشہ کھینچ کر
نمونہ دیا ہے۔

اے میرے مکرم و معظم ہمسفر۔ ہم سب کو اس
طرف جلد چلنا چاہیئے کہ ہمارے مناسب حال اور سب
سے الگ تہلگ ہے۔ باقی قطع تو ہمارے تساہل اور
لا علمی نے کھو دیئے۔ ایسا نہ ہو۔ کہ یہ مرقع ندرت و عجابت
بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ غرضیکہ سب طرف سے بڑھو۔
چلو کی آرازیں آئیں۔ اور یہ باہمت گرہ اس گلشنِ
نوبہار کے سجانے والوں سے اجازت لیکر باغ کی طرف چلا۔
پھر کیا تھا۔ اُسی وقت وہ دروازہ بڑے باجے گاجے کے ساتھ
کھولا گیا۔ اور چند گھڑیوں میں دیکھتے ہی دیکھتے اردر
کا عظیم الشان لشکر اس چمن زار رضوانی میں ابرِ بہار کی
طرح پھیل گیا۔

رہاں پہنچتے ہی ہر طرف سے نکھت بار گھٹائیں اُٹھیں۔

اصحابِ ایجاد و اختراع نے اپنے اپنے مناسب حال قطع
انتخاب کر کے راستے اختیار کئے۔ جب سب بھیڑ چھٹ گئی۔
تو صاف نظر آنے لگا۔ کہ اس پڑاؤ میں تو فقط اردو کا
لشکر ہی چھاؤنی چھائے پڑا ہے بعد میں کسی سے یہ بھی سنا۔
کہ حضرت آزاد نے اپنے ساتھیوں کا ساتھ چھوڑنا آئیں مررت
سے بعید جانا۔ اور انہیں پیغامبروں کے ہاتھ سب بزرگواروں
کی خدمت میں پیغام و سلام زبانی کے علاوہ یہ بھی کہلا
بھیجا۔ کہ میری کرسی بھی انہیں مریدوں کے ساتھ رہے گئی۔
باقی میں ہر طرح خادم ہوں۔ جس رقت کوئی خدمت
میرے لائق درپیش ہو۔ بلا تکلف بلا بھیجئے۔ فوراً بے دریغ
آؤں گا۔ کیونکہ مجھے آپ ہی بزرگوں کے نقش قدم نے
یہ خوشی کا دن دکھایا ہے۔

ابھی ان باتوں کے چرچے ہی ہو رہے تھے۔ کہ ایک
نازک خیال نے خبر دی۔ کہ ہم ابھی سیر کرتے کرتے ایک
طرف جانکے تھے۔ وہاں ایک خطہ ایسا دکھائی دیا کہ باز
نظر نے آج تک اسکا نقشہ بھی نہ دیکھا تھا۔ بلکہ خیال کے
انجنیر نے اسکا گمان بھی تیار نہ کیا ہوگا۔ اگرچہ اس رقت
تک اس باغِ ارم کا پھاٹک بندھے مگر جالیوں سے اتنا

تمہارے کارہائے نمایاں اُن سے بدرجہا آگے بڑھ گئے ہیں ۔
 اس لئے ہم نہیں چاہتے کہ وہاں لیجا کر تمہیں نیچے درجوں
 میں بٹھائیں ۔ جس سے تمہیں مایوس اور انہیں معجب
 ہونا پڑے ۔ اس لئے مناسب یہ ہے ۔ کہ تم میں علوم و فنون
 کے لحاظ سے صنف رار تقسیم ہو جائے ۔ اور جس سمت جس
 کا جی چاہے ۔ بے دھڑک چلا جائے ۔ یہ ملک ختم ہونے والا
 نہیں ۔ جس گلشن میں چاہے اور جو مکان پسند آجائے ۔
 رہیں جلسہ جمالی ہماری تائیدی برکتیں بنکر ہر وقت
 شامل حال رہیں گی ۔ کہ ہمارے ائین سلطنت میں اخلاق
 و صورت کی باتیں قوانین اور ضوابط بن کر داخل ہو گئی
 ہیں ۔ البتہ دربار شہرت میں ایک کرسی آزاد کے نام کی
 خالی پڑی ہے ۔ اگر وہ پسند کرے ۔ تو بے تکلف چلا آئے ۔
 کیونکہ سب اہل دربار اُس کی مخصوص و مشکور خدمات
 کی وجہ سے اُس کو عزیز جانتے ہیں ۔ اور اُس کی مجالست
 کے خواہش مند ہیں ۔

اس فرمان کے پڑھ جانے کے بعد ایک نور آسمان سے
 پھیلنا شروع ہوا جس سے فضا میں ہر طرف مہتابیان سی
 چھوٹنے لگیں ۔ اور ہر ایک ملک کے ارباب علم و فن اور

ہم کو تسکین و دلا سے کے اشاروں سے اس جنت نظیر باغ میں
 تھہرنے کی اجازت دی - اور خود سرعت کے گھوڑے پر
 سوار ہو کر حصولِ اجازت کے لئے ہوا ہو گئے - ان کی آن میں
 کہ ان پیک ہائے برق رفتار کو سدھارے تھوڑی دیر بھی نہ
 گزری تھی - ایک طرف سے نسیم خوشگوار کے جھونکے عطریں
 کرتے ہوئے آئے - ساتھ ہی وہ پیامبرِ علاوہ پرورانہ اجازت کے
 مبارکباد کا پیغام بھی لائے - بلکہ ایک دور معتبر کار پرداز بھی
 ہمراہ لیتے آئے - تاکہ حق دار کا حق بے حق لوگ نہ مار سکیں -
 انہوں نے آتے ہی مبارکباد کا کرنا پھونکا - اور سب کو
 ایک جگہ جمع کر کے مسند آرائے سماری کا پیغام سنانا
 شروع کیا - اس میں لکھا تھا - اے آنیوالو! مرحبا مرحبا -
 تمہارا آنا مبارک - تمہاری محنتیں اور محبتیں ہمیں بہت
 خوش آئیں - تمہیں سلامتی کی نوید ہو - کہ ملکِ بقامیں
 پہنچ لیئے - اور اب ہمیشہ اسی میں رہو گے - مگر دربارِ
 شہرت میں اتنی وسعت کہاں - کہ تمہارے اس بے شمار
 گرہ کو عزت و حرمت کے مطابق جگہ مل سکے - اگرچہ
 وہاں کے کرسی نشین جو تمامی علوم و فنون کے موجد اور
 مخترع ہیں خود تمہارے ہی اسلاف ہیں - مگر چونکہ

ان امن و امان کے خیابانوں میں ٹہلتے اور نوبہار
 پتھروں پر خوش خرامی کرتے ہم سب آگے نکلا چاہتے تھے۔ کہ
 اس رشک فردوس کے محافظوں نے روزِ تہام کے تارکھینچکر
 حدِ نظر میں محصور کر لیا۔ اور سامنے سے آکر سدراہ ہوئے۔
 بلکہ یہاں بھی ہمارے تھرجانے سے مانع آئے اس سختی
 اور تذہبی پر ہمارے قافلے میں سے ایک بزرگوار باہر نکلے۔
 اور اپنا مطلب ان الفاظ میں ظاہر کیا۔ کہ اے محافظو !
 اے نگہبانو ! تم جانتے ہو۔ ہم کون ہیں ؟ ہم رہ اورگ ہیں۔
 کہ دنیا کے راحت و آرام۔ جاہ و منصب فقط بقائے درام کے
 نام پر قربان کر کے یہاں تک آئے ہیں۔ اور اب آرزو ہے۔
 کہ ہماری خدمات کے صلہ میں ہم سب کو شہرت عام کے دربار
 میں ہمارے مراتب مساعی کے مطابق جگہ مل جائے۔ بلکہ
 ہم میں سے بعض فرخندہ فرجام نفوس تو ایسے ہیں۔ کہ ان کے
 لئے رہاں پہلے ہی سے کرسیاں مقرر ہو چکی ہیں۔ تم کو زیبا ہے
 کہ ہمارے سدراہ ہونے کے بجائے کچھ امداد اور خاطر
 مدارات سے پیش آؤ۔ اور ہم کو ہماری منزل مقصود پر پہنچادو۔
 ہمارے ساتھی کی موثر تقریر نے جادو سے بڑھکر کام کیا۔
 مگر محافظ قاعدے اور قانون کی پابندی سے مجبور تھے۔

آبشاروں کے رنگ برنگی پھولوں نے قلمکار چادریں ارڑھا رکھی
تھیں۔ ہوا کے ہر ایک جھونکے کے ساتھ درختوں سے خوشوں -
پھولوں اور پھولوں کے مینہ برستے تھے۔ اور اس وسیع احاطہ
میں جو پیمانہ نظر سے بھی نہ نپ سکتا تھا ہری ہری گھاس
اور خوشنما جھاڑیوں کے چرنے والے کیا اہلی کیا وحشی سب
ہی طرح کے جانور رمے ہوئے تھے۔ کہ اُرنچے اُرنچے ٹیلوں
کی آڑوں میں نہچت پھرتے تھے۔ درندے یا شکاری کسی کا
کہنکا نہ تھا۔

اس سدا بہار گلزار سے اُگے برھے۔ تو ایک پُر فضا میدان
سامنے آیا۔ جس کی ہمیشہ رھنے والی بہار خزان پر کھڑی
ہنستی تھی۔ اور اپنے جوبن میں ہر انگڑائی۔ اور ہوا کے
ہر ایک جھونکے کے ساتھ ایک نیا نکھار اور نرالا انداز پیدا
کر لیتی تھی۔ جو ہر چیز کو اپنی طرف فرلاد سمجھ کر
مقناطیس سے زیادہ کھینچتا تھا۔ اس کے آبشاروں اور روشن
میں مسرتوں کے فوارے چھٹتے تھے۔ جن کی پھوہار ہر انسان
میں کیفیت سرخوشی پیدا کر دیتی تھی۔ صبح کا نور دن
بنکر آتا۔ اور مشک عنبر سے لبریز رات خوشبوئیں پھیلاتی
چلی جاتی تھی۔

ان کو ہساروں میں چشمے اور چھوٹی چھوٹی نہریں اس بہتات سے بہتی تھیں - کہ درے کو سرسبزی اور گلریزی میں رشکِ فردوس بنا رکھا تھا - پھر ان ساری دھاروں نے درے کے بیچوں بیچ جمع ہو کر ایک تالاب بنا دیا تھا - وہ ساگرِ پرترا ہوا ہمیشگی کی لہروں سے کھیلتا تھا - اور خوش آہنگی کی موجوں سے ہلکی ہلکی آوازیں پیدا کرتا تھا -

اس میں رنگِ برنگ کی لال سبز مچھلیاں اچھلتی پھرتی تھیں - جنکی دلفریب چمک سے نظر تار ہو کر بکھر جاتی تھی - اس سنہری جھیل کا ادنیٰ کرشمہ یہ تھا - کہ قدرت نے جس پرندے کو پانی میں بازرِ دبوئے سکھائے تھے - وہ اسی کشش میں فریفتہ ہو کر تمام سال میں ایک دفعہ ضرور حاضر ہوتا تھا آخر کار اس تمام پانی کا نکاس ایک نہر میں تھا - کہ قدرتی بہاؤ نے اس کا راستہ خود بخود نکالا تھا - وہ شمال میں غار کی طرف دھائیں دھائیں کر کے گرتی تھی - پھر وہاں سے نکل کر سنگستانی نشیب و فراز میں دل بہلاتی - پہاڑوں کی چوٹی چوٹی چڑھتی اور اترتی کہیں سے کہیں غائب ہو جاتی تھی -

ان پہاڑوں کو سر سے پاؤں تک سرسبز درختوں نے اور

تھے۔ کہ اُن کی چوٹیاں فضا کے آسمانی کے رہنے والوں سے سرگوشیاں کرتی تھیں۔ اور پستیاں فرطِ ادب سے اس قدر جھکی تھیں۔ کہ میلوں گہراؤ بنتے چلے گئے تھے۔ غرضیکہ اس نشیب و فراز کو دیکھ کر فرشتہٴ عقل کے بھی ہوش اُڑتے تھے۔ مگر سب نے اپنے تیئیں سنبھالا۔ اور اس طرف کو روانہ ہو ہی گئے۔ حسنِ اتفاق سے اس میں جانے کے لئے فقط ایک ہی راستہ کھلا تھا۔ جو برے پہاڑ کے نیچے سے ہو کر غار کی طرح اندر چلا جاتا تھا۔ جس کی بابت آج تک یہ فیصلہ نہیں ہوا۔ کہ اس ہوشربا دروازہ کو قدرت کے سنگتراش نے تراشا تھا۔ یا حضرت انسان کی جوہر کاری کا نمونہ ہے۔

ہم سب مناظرِ قدرت کو دیکھتے اپنے اپنے حال میں مست آگے بڑھے۔ مگر اس عالم میں ایسا طلسم بندھا تھا۔ کہ ہم ایک دوسرے کو نہ بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ نہ پہچان سکتے تھے۔ غرضیکہ ان کیفیات سے سرشار ہم غار کے دروازہ سے باہر نکلے۔ تو یہاں درختوں کا اتنا ہجوم دیکھا۔ کہ آسمان بھی نظر نہ آتا تھا۔ دروازہ پر فولاد کے ڈھلے ہوئے خاردار کواڑ چڑھے تھے۔ جن کو زمانہ قدیم کی صنعت نے ڈھالا تھا۔ بوجھوں اس قدر بھاری تھے۔ کہ جب تک انجن اور کلیں مدد کر نہ آئیں۔ تب تک نہ کھلتے تھے نہ بند ہوتے تھے۔

بادِ فنا کی سائیں سائیں - موت کی بھیا نک بھیا نک مورتیں
 دیکھ دیکھ کر ہی گرد بار ہو گیا - البتہ دوسرا فریق ذرا مطمئن
 تھا - وہ ذرا سی دیر سستا کر بقائے دوام کے راستے پر جا پڑا -
 فریق اول کہ دنیا میں اچھے کام انجام دینے سے محروم
 رہا تھا - اور زارِ راہ سے خالی ہاتھ تھا - دیکھتے ہی دیکھتے بادِ فنا کے
 تند جھونکوں سے ہوا ہو کر اُڑ گیا - یہاں تک کہ اس کے نام کا
 نشان بھی باقی نہ رہا مگر دوسرا فریق کہ حُسنِ خدمات کے
 امتیازی تمغے اور کارگزاری کی سندیں ساتھ لایا تھا - بڑے
 حوصلے اور ہمت کے ساتھ اُٹھا - اور بادِ فنا کا مُنہ موڑتا - آگے
 بڑھا - تاکہ ساحل کی تکالیف کی خاک اُڑاتا اُٹندہ کی
 کٹھن منزلوں پر گامزن ہو جائے - میں جو کہ دیوانہ وار ان کے
 انجام دیکھنے کا منتظر تھا - اُسی گروہ کے قدموں کی اُرتی
 ہوئی خاک کے پردہ میں ساتھ ساتھ ہولیا -

ابتدا میں ہر طرف ایک اندھیرا عالم تھا - مگر یہاں
 عقل کی روشنی نے بجلی کا کام کیا - اور دور اندیشی کے
 دُوربین نے ایک طرف کو راستہ نکالا - اِس راہ پر روانہ
 ہوئے ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے - کہ وسیع اور فراخ
 درہ نظر آیا - جس کے چاروں طرف ایسے ایسے بلند پہاڑ کھڑے

دربار داریوں نے تو ایسا محو کیا۔ کہ اپنے تن بدن کی بھی خبر نہ رہی۔ اور بار بار سوچتا تھا۔ کہ آخر اس خالی کرسی پر حضرت آزاد اب تک جلوہ افروز کیوں نہیں ہوئے؟ انہی خیالات میں غرق تھا۔ کہ بیدخودی نے ہوشیاری کو اشارہ کیا اور محویت نے خیال کو خواب سے بدل دیا۔ پھر استغراق کے گاؤ تکیہ پر ہاتھ تھا۔ اور ہاتھ پر مستحور سر کہ عالم خیال میں دیکھتا ہوں۔ میں ایک سمندر کے کنارے کھڑا ہوں۔ جس کو بہت لوگ عدم آباد اور بعض بقائے دوام کا بندرگاہ بتاتے ہیں۔ یہاں تھوڑی تھوڑی سی دیر بعد زندگیوں کے بودے بودے جہاز۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں۔ امراء کے آگنبوت سمندر کے تہیہ کردن سے چکنا چور ہو کر لنگر ڈالنے کے لئے دروازے چلے آتے ہیں۔ بعض تو بندر پر پہنچتے ہی پہنچتے تھ کو جا لگتے ہیں۔ کچھ کنارے لگ کر ساحل کا بھی منہ دیکھتے ہیں۔ مگر ان میں بھی اکثر مسافر جان سے بیزار کشاکش حیات سے مجبور۔ اترنے سے پہلے ہی اپنے آپ کو دریائے فنا کے بہنور میں دے مارتے ہیں۔ باقی جو صحیح و سالم اترے۔ ان میں پھر دو فریق بنتے چلے جاتے ہیں۔ ایک فریق تو اپنی بے سر و سامانی کے باعث یہاں کی سنسان فضا۔

بقائے دوام

اے خیالات کی بلند پروازیوں کے ماننے والو۔ اے رہم
 کے چھلارے کی پرچھائیں پر دوڑنے والو۔ ذرا دل کے کان
 لگا کر سنو آج تمہیں وہ عجیب و غریب قصے سنائیں گے۔ اور
 وہ وہ اُن دیکھے جلوے دکھائیں گے۔ کہ عقل انسانی ہوش
 و حواس کے پردوں کو توڑ کر فنا و بقا کا ساز چھیڑے گی۔ اور
 نام و نمود کے رسیلے سروں سے دل و دماغ میں پھر ایک
 دفعہ شہرت عام اور بقائے دوام کے لئے مقتولا خون دوڑے گا۔
 کہ اُس کی اُمید افزا قوتوں سے جوانی کی خون شدہ آرزوئیں
 بڑھاپے میں ضرور برائیں گی اور کل کی ناکامیایاں آج
 کامرانی سے بدل جائیں گی لو سنو۔

دل کہ ایک دن افکار حوادث سے پڑمردہ اور زمانے کی
 نیرنگیوں سے افسردہ تھا۔ غم غلط کرے کے لئے عجائب خانہ
 نیرنگ خیال میں جانکلا جہاں پہنچ کر آغاز آفرینش کی
 سیر کی۔ سچ اور جھوٹ کے معرکہ ہائے رزم کا مشاہدہ کیا۔
 گلشن بہار کی اُمید سے لطف اُٹھاتا۔ سیر زندگی سے دل بہلاتا
 شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں پہنچا۔ یہاں کی

ہے۔ پس جب تک یہ خیال نہ جارے گا اور یہ خیال نہ آرے گا کہ ہم خود سوچیں کہ ہم کو اپنے لئے کیا کرنا چاہئے۔ اُس رقت تک ہندوستان کے مسلمانوں کو نہ دولت ہوگی نہ حشمت۔ نہ عزت ہوگی نہ منزلت۔ اور نہ تہذیب ہوگی اور نہ شایستگی مگر دوسرا جملہ جو مذہب سے متعلق ہے وہ کسی قدر صحیح ہے اور کسی قدر غلط۔ یعنی غلط مذہب بلاشبہ تہذیب کا بڑا مانع ہے اور اگر سچے مذہب میں غلط خیال اور بیجا تعصبات اور مسائل اجتہادیہ اور عقائد قیاسیہ اس طرح پر مل جائیں کہ عملاً اور اعتقاداً اصلی احکام مذہبی میں اور اُن میں کچھ تفرقہ و تمیز نہ رہے۔ جیسے کہ مذہب اسلام کی موجودہ حالت ہے اور جو تقلید کی تاریکی میں آنکھوں سے بالکل چھپ گیا ہے۔ تو بلاشبہ وہ بھی انسان کی ترقی اور تہذیب کا مڈل مذہب غلط کے مانع قوی ہے۔ الا سچا مذہب جیسا کہ تہیت مذہب اسلام ہے وہ کبھی خارج ترقی انسان نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اُس مذہب کے احکام اور تہذیب و شایستگی کے کام دونوں متعدد ہوتے ہیں۔

باتوں کے زیادہ مستقل ہیں اور اُن میں کمی بیشی بہت کم ہوتی ہے۔

چارم — ”اس تحریک کا برا دشمن“ جو درحقیقت سولزیشن کا بھی سخت دشمن ہے یہ خیال ہے کہ جب تک زندگی کے اُمورات کی نگرانی ہر طرح پر سلطنت اور مذہب سے نہ ہو۔ تب تک انسان کے گروہ کی ترقی نہیں ہو سکتی۔ یعنی سلطنت رعایا کو یہ سکھلا دے کہ ان کو کیا کرنا چاہئے اور مذہب یہ سکھلا دے کہ کس بات پر یقین کرنا چاہئے۔“

پچھلی بات میں مسٹر بکل سے مجھے کو کسی قدر اختلاف ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ لوگوں کا یہ خیال کہ بادشاہ رقت ہم کو بتا دے کہ ہم کو کیا کیا کرنا چاہیئے۔ انسان کی ترقی اور تہذیب کا نہایت قوی مانع ہے اور جس قدر کہ ہندوستان میں۔ بلکہ تمام ایشیا میں اور ترکی اور ایچپت میں بھی ناشایستگی اور ناتہذیبی ہے۔ اُس کا برا سبب یہی خیال ہے۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کو اسی خیال نے غارت اور برباد کیا ہے اور یہی خیال ہے جو ہندوستان کی رعایا کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً گورنمنٹ سے ناراض رکھتا

قدرتی خوبی اور فطرتی عمدگی پر پہنچانا - اور اُن سب کو خوش اسلوبی سے برتنا - اور اس کا نتیجہ کیا ہے - روحانی خوشی اور جسمانی خوبی اور اصلی تمکین - اور حقیقی وقار اور خود اپنی عزت کی عزت - اور درحقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے -

اس تہذیب کے حاصل ہونے کے (بقول مسٹر ایچ - ٹی بکل صاحب) چار اصول ہیں -

اول - ”جو چیزیں ہم کو دکھائی دیتی ہیں اور جن کا سبب ہم کو معلوم نہیں ہوتا ان کے سببوں اور قاعدوں کو دریافت کرنا - اور اُن کے علوم کو پھیلانا - پس جس قدر کامیابی اس میں ہوگی اسی قدر انسانوں کی ترقی ہوگی“ -

دوم - ”اس تحقیقات سے پہلے تجسس کا خیال پیدا ہونا چاہئے - جس سے ابتدا میں تحقیقات کو مدد ملتی ہے اور بعد کو تحقیقات سے اُس کی اعانت ہوتی ہے -

سوم - ”جو باتیں اس طرح پر دریافت ہوتی ہیں وہ عقلی باتوں کے اثر کو زیادہ کرتی ہیں - اور اخلاق کی باتوں کو کسی قدر کم - مگر اخلاق کی باتیں بہ نسبت عقلی

قوموں میں یہ سب چیزیں دلی جوش کی موجیں
 ہیں۔ رہ کے اور تال - راگ راگنی کو نہیں جانتے - مگر
 دل کی اہر انکی کے - اور دل کی پھرک انکا تال ہے -
 انکا غول باندھکر کھڑا ہونا - طبعی حرکت کے ساتھ اچلنا -
 دلکی بیتابی سے جھکنا اور پھر جوش میں آکر سیدھا
 ہو جانا - گو نزاکت اور فن خنیاگری سے خالی ہو - مگر
 قدرتی جذبوں کی ضرور تصویر ہے - دلی جذبوں کا رکنا
 اور انکو عمدہ حالت میں رکھنا - تمام قوموں کے خیالات
 میں شامل ہے - پس جس طرح کہ ہم تہذیب کا قدرتی لگاؤ -
 تمام انسانوں میں پاتے ہیں اسی طرح اسکا تعلق عقلی اور
 مادی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں - جس چیز میں کہ
 ترقی یعنی بُرائی سے اچھائی کی طرف رجوع یا ادنیٰ
 درجہ سے اعلیٰ درجہ کی طرف تحریک ہو سکتی ہے اُسی سے
 تہذیب بھی متعلق ہے - پس سولزیشن یا تہذیب کیا ہے ؟
 انسان کے افعال ارادی اور جذبات نفسانی کو اعتدال پر
 رکھنا - وقت کو عزیز سمجھنا - واقعات کے اسباب کو دھونڈنا
 اور ان کو ایک سلسلہ میں لانا - اخلاق اور معاملات اور
 معاشرت اور طریق تمدن اور علوم و فنون کو بقدر امکان

عالی شان بنتے ہیں - اور نفیس چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں - نا تربیت یافتہ قوموں کے جھونپڑے اور انکے رہنے کے کھونپے درختوں پر باندھے ہوئے تانڈے - کھردی ہوئی کھوٹیں بھی تہذیب سے خالی نہیں - معاشرت کی چیزیں - تمدن کے قاعدے - عیش و عشرت کی مجلسیں - خاطر اور مدارات کے کام - اور اخلاق و محبت کی علامتیں - دونوں میں پائی جاتی ہیں - علمی خیالات سے نا تربیت یافتہ قومیں خالی نہیں - بلکہ بعض چیزیں انہیں زیادہ اصلی اور قدرتی طور سے دکھائی دیتی ہیں - مثلاً شاعری جو ایک نہایت عمدہ فن تربیت یافتہ قوموں میں ہے - نا تربیت یافتہ قوموں میں عجیب عمدگی و خوبی سے پایا جاتا ہے - یہاں خیالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے اور وہاں دلی جوشوں اور اندرونی جذبوں کا اظہار ہوتا ہے - موسیقی نے تربیت یافتہ قوموں میں نہایت ترقی پائی ہے - مگر نا تربیت قوموں میں بھی عجیب کیفیت دکھائی ہے - انکی ادا اور آواز کی پھرت اسکا گھٹاؤ اور اسکا بڑھاؤ - اسکا ٹھہراؤ اور اسکی اریچ - ہاتھوں کا بھاؤ اور پاؤں کی دھمک زیادہ تر مصنوعی قواعد کی پابند ہے مگر نا تربیت یافتہ

انگلوں کی تہذیب کو ایک تہذیب مگر مردب دل سے دیکتے ہیں ۔

تہذیب ۔ یایوں کہو کہ بری حالت سے اچھی حالت میں لانا ۔ دنیا کی تمام چیزوں سے اخلاقی ہو یا مادی ۔ یکساں تعلق رکھتا ہے اور تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے ۔ تکلیف سے بچنے اور آسائش حاصل کرنے کا سبکو یکساں خیال ہے ۔ ہزار اور اسکو ترقی دینا تمام دنیا کی قوموں میں موجود ہے ۔ ایک تربیت یافتہ قوم زر و جواہر ۔ یا قوت و الماس سے نہایت نفیس نفیس خوبصورت زیور بناتی ہے ۔ ناتربیت یافتہ قوم بھی کوریوں اور پوتھوں سے اپنی آرایش کا سامان ہم پہنچاتی ہے ۔ تربیت یافتہ قومیں اپنی آرایش میں سونے چاندی ۔ مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں ۔ ناتربیت یافتہ قومیں جانوروں کے خوبصورت اور رنگین پوروں کو ۔ تیلیوں سے چھلے ہوئے سنہری پوست اور زمرد کے سے رنگ کی باریک اور خوشنما گھانس میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں ۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی اپنے لباس کی درستی کا خیال ہے ۔ ناتربیت یافتہ قومیں بھی اسکی درستی پر مصروف ہیں ۔ شاہی مکانات ۔ نہایت عمدہ اور

کی مختلف حالتوں کا فیصلہ وہ اسباب کر سکتے ہیں جن کے سبب سے اچھا اور بُرا کا خیال دل میں بیتھتا ہے ۔

اچھے اور بُرے کی جگہ میں اور لفظ کا استعمال کرونگا ۔

یعنی پسند اور ناپسند ۔ انگریزی میں ایک لفظ ”ٹیسٹ“ ہے جو نہایت وسیع معنوں میں مستعمل ہوتا ہے ۔ ہماری زبان میں بھی اس قسم کے لفظ ہیں ۔ جیسے کہ مزہ یا مذاق ۔ مگر وہ استعمال میں ایسے خاص ہو گئے ہیں کہ ان سے وہ عام اور وسیع معنی خیال میں نہیں آتے ۔ اس واسطے میں اُس لفظ کا ترجمہ ”پسند“ کرتا ہوں ۔ پس پسند کا صحیح ہونا ۔ جو خیال کے صحیح ہونے کی فرع ہے بہت بڑا وسیلہ سولزیشن کی مختلف حالتوں کے تصفیہ کا ہے ۔

خیال کی درستی اور پسند کی صحت کثرتِ معلومات پر ۔ اور علمِ طبیعیات سے بخوبی ماہر ہونے پر منحصر ہے ۔

انسان کی معلومات کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے ۔ اور اسکے ساتھ ساتھ سولزیشن بھی بڑھتی ہے ۔ کیا عجب ہے کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آئے کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو کہ اس زمانہ کی تہذیب کو بھی ایک وہ لوگ ایسے ہی تھندے دل سے دیکھیں جیسے کہ ہم اپنے سے

معلومات اور اُنکے خیالات - انکی مسرت کی باتیں اور ان کی نفرت کی چیزیں - سب یکساں ہوتی ہیں - اور اسی لئے برائی اور اچھائی کے خیالات بھی سب یکساں پیدا ہوتے ہیں - اور برائی کو اچھائی سے تبدیل کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے - اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے - مگر جب کہ مختلف گروہیں مختلف مقامات میں بستی ہیں - تو ان کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف ہوتی ہیں - اور اس سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں - مگر ضرور کوئی ایسی چیز بھی ہوگی کہ جو سولزیشن کی ان مختلف حالتوں کا تصفیہ کر سکے -

ملکی حالتیں - جہانتک کہ وہ بود و باش سے تعلق رکھتی ہیں - نہ فکر اور خیال اور دماغ سے اُن کو تہذیب سے چندان تعلق نہیں - بلکہ صرف انسان کے خیال کو اس سے تعلق ہے جسکے سبب وہ اچھا اور برا بھرتا ہے - اور جس باعث سے خواہش تبادلہ تحریک میں آتی ہے اور تبادلہ واقع ہوتا ہے جو سولزیشن کہلاتا ہے - پس سولزیشن

وہ اچھا سمجھتا ہے۔ یہی چیز سولزیشن کی جڑ ہے جو انسانوں کے ہر گروہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔ اسی تبادلہ کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے۔ اور کچھ شبہ نہیں کہ یہ میلان یا یہ خواہش تبادلہ انسان میں قدرتی اور فطرتی ہے۔

سولزیشن یا تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت کے مائل ہونے کے در اصول ٹھہرے۔ اچھا اور برا۔ اور برے کو اچھا کرنا سولزیشن یا تہذیب ٹھہری۔ مگر اچھا اور برا قرار دینے کے مختلف اسبابِ خلقی اور خُلقی۔ ملکی اور تمدنی ایسے ہوتے ہیں جن کے سبب اچھا اور برا ٹھہرانے میں۔ یا یوں کہو کہ قوموں کی سولزیشن میں اختلاف پڑ جاتا ہے۔ ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے اور داخل تہذیب جانتی ہے۔ دوسری قوم اُسی بات کو بہت بُرا اور وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے۔ یہ اختلاف سولزیشن کا قوموں کے باہم ہوتا ہے۔ اشخاص میں نہیں ہوتا۔ یا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ جب کہ ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے۔ تو اکثر اُن کی ضرورتیں اور اُن کی حاجتیں۔ اُن کی غذائیں اور ان کی پوشاکیں۔ اُن کی

سولزیشن یا تہذیب

ہم دریافت کیا چاہتے ہیں کہ سولزیشن کیا چیز ہے اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے؟ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے؟ یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اسکو پیدا کیا ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی اصطلاح ہے جسکو لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے؟ یا یہ ایسی چیز ہے کہ اسکا مفہوم۔ اور جن جن چیزوں سے اسکا تعلق ہے۔ قانون قدرت میں پایا جاتا ہے۔ اس امر کے تصفیہ کے لئے انسان کے حالات پر ہمکو نظر کرنی چاہئے۔ اگر تہذیب انسان میں ایک فطرتی چیز ہے تو وحشیوں میں۔ شہریوں میں۔ سب میں اسکا نشان ملے گا۔ گو اُسکی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں۔ الا سبکی جز ایک ہی ہوگی۔ انسان میں یہ ایک فطرتی بات ہے کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور کسی کو نا پسند۔ یا یوں کہو کہ کسی چیز کو اچھا ٹھہراتا ہے اور کسی چیز کو برا۔ اور اُسکی طبیعت اس طرف مائل ہے کہ اُس بری چیز کی حالت کو ایسی حالت سے تبدیل کرے جسکو

ہے ایمان کے ترشہ اور اُمید کے ہادی اور موت کی سواری
 سے مگر ان سب میں جسکو سب سے زیادہ قوت ہے وہ
 ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے جسکا پیارا نام ”اُمید“ ہے۔
 لوگ کہتے ہیں کہ بے یقینوں کو موت کی کٹھن گھڑی
 میں کچھ اُمید نہیں ہوتی مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیری
 بادشاہت وہاں بھی ہے۔ قیامت پر یقین نہ کرے والا
 سمجھتا ہے کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے
 اور پھر کسی تکلیف کے ہونے کی توقع نہیں ہے۔ وہ اپنے
 اس بے تکلیف آنے والے زمانہ کی اُمید میں نہایت
 بُردباری سے اور رنجوں کے زمانہ کے آخر ہونے کی خوشی
 میں نہایت بشاشت سے یہ شعر پڑھتا ہوا جان دیتا ہے۔

بقدر ہر سکون راحت بود بنگر تفارت را
 دریدن رفتن استادن نشستن خفتن و مردن

پانی میں - مٹی مٹی میں ملنے کو ہوتی ہے تو تیرے ہی
سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے -

آسوت اُس زرد چہرے اور آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے
ہونٹوں اور بے خیال بند ہوتی ہوئی آنکھوں اور غفلت
کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یادگاری ہوتی ہے -
تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے تیری صدا کان میں آتی
ہے اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور
ایک نئی لازوال زندگی کی جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی
خوشی ہوگی اُمید ہوتی ہے -

یہ تکلیف کا رقت تیرے سبب سے ہمارے لئے موسم
بہار کی آمد آمد کا زمانہ ہو جاتا - اُس لازوال آنے والی
خوشی کی اُمید تمام دنیاری رنجوں اور جسمانی تکلیفوں
کو بھلا دیتی ہے - اور غم کی شام کو خوشی کی صبح سے
بدل دیتی ہے - گو کہ موت ہر دم جتناہی ہے کہ مرنا بہت
خوفناک چیز ہے -

اور ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دنیا جس
میں ہمکو ہمیشہ رہنا ہے - جہاں سورج کی کرن اور زمانہ کی
لہر بھی نہیں پہنچی - تیری راہ تین چیزوں سے طے ہوتی

فتوروں کا دَر دکھاتے ہیں - بھائی بند عزیز اقارب سمجھاتے
 ہیں اور پھر یہ شعر پڑھ کر چپ ہو رہتے ہیں -
 رہ بھلا کسی بات مانے ہیں - بھائی سید تو کچھ دیوانے ہیں
 ساتھی ساتھ دیتے ہیں مگر ہاں ہاں کر کے محنت اور
 دل سوزی سے دور رہ کر بہت سی ہمدردی کرتے ہیں -
 پر کوٹھی کٹھلے سے الگ کر کے دل ہر وقت بے قرار ہے -
 کسی کو ایذا سا نہیں پاتا - کسی پر دل نہیں ٹھہرتا - مگر
 اے بے قرار دلوں کی راحت اور شکستہ خاطرروں کی تقویت -
 تو ہی ہر دم ہمارے ساتھ ہے تو ہی ہمارے دل کی
 تسلی ہے تو ہی ہماری کٹھن منزلوں کی ساتھی ہے تیری ہی
 تقویت سے ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچینگے تیرے ہی
 سبب گوہر مراد کو پیارینگے اور ہمارے دل کی عزیز اور
 ہمارے پیارے مہدی کی پیاری "امید" تو ہمیشہ ہمارے
 دل کی تسلی رہے -

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید - جب کہ زندگی کا
 چراغ تمماتا ہے اور دنیوی حیات کا آفتاب لب بام
 ہوتا ہے - ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی رنگ فق
 ہو جاتا ہے منہ پر مردنی چھاتی ہے - ہوا ہوا میں - پانی

پہنچتی ہے اور وہ آنکھ اُٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے اور جب کہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنہیلینیں اُس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ بوسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے۔ اور جب کہ اپنے ساتھی کو خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے تو اے بہادروں کی قوت بازو۔ اور اے بہادری کی ماں۔ تیرے ہی سبب سے فتحمندی کا خیال اُنکے دلوں کو تقویت دیتا ہے۔ اُنکا کان نقارہ میں سے تیرے ہی نغمے کی آواز سنتا ہے۔

وہ قومی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے۔ دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے ہر وقت بھلائی کی تدبیریں دھوندتا ہے۔ اُنکی تلاش میں دور دراز کا سفر اختیار کرتا ہے یگانوں بیگانوں سے ملتا ہے۔ ہر ایک کی بول چال میں اپنا مطلب دھوندتا ہے۔ مشکل کے وقت ایک بڑی مایوسی سے مدد مانگتا ہے۔ جنکی بھلائی چاہتا ہے اُنہیں کو دشمن پاتا ہے۔ شہری وحشی بتاتے ہیں۔ درست آشنا دیوانہ کہتے ہیں۔ عالم فاضل کفر کے

دیکھ رہے گناہ قیدی اندھیرے کنوئیں میں سات
تہ خانوں میں بند ہے اُسکا سورج کا سا چمکنے والا چہرہ
زرد ہے۔ بے یار و دیار غیر قوم غیر مذہب کے لوگوں کے
ہاتھ میں قید ہے بدھے باپ کا غم اُسکی روح کو صدمہ
پہنچاتا ہے۔ عزیز بھائی کی جدائی اُسکے دل کو غمگیں
رکھتی ہے۔ قیدخانہ کی مصیبت اُسکی تنہائی اُسکا گھر
اندھیرا اور اسپر اپنی بے گناہی کا خیال اُسکو نہایت ہی
رنجیدہ رکھتا ہے۔ اُس رقت کوئی اُسکا ساتھی نہیں ہے۔
مگر اے ہمیشہ زندہ رہنے والی اُمید۔ تجھی میں اُسکی
خوشی ہے۔

رہ دلار سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے کوچ
پر کوچ کرتے کرتے تھک گیا ہے ہزاروں خطرے درپیش
ہیں مگر سب میں تقویت تجھی سے ہے۔ لڑائی کے
میدان میں جب کہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چپ
چاپ کھڑی ہوتی ہیں اور لڑائی کا میدان ایک سنسان کا
عالم ہوتا ہے دلوں میں عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی
جراثیم ہوتی ہے۔ اور جب کہ لڑائی کا رقت آتا ہے
اور لڑائی کے بگل کی آواز بہادر سپاہی کے کان میں

اپنی ماں کی آتش محبت کو بہترکانے کے قابل ہوا۔ پھر
مکتب سے اسکو سررکار پڑا۔ رات کو اپنی ماں کے سامنے
دن کا پڑھا ہوا سبق غمزہ دل سے سناتے لگا۔ اور جبکہ وہ
تاروں کی چھاؤں میں اُٹھ کر ہاتھ منہ دھو کر اپنے
ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا۔
اور اپنے بے گناہ دل بے گناہ زبان سے بے ریا خیال سے
خدا کا نام پکارنے لگا تو اُمید کی خوشیاں اور کس قدر
زیادہ ہو گئیں۔ اُسکے ماں باپ اُس معصوم سینہ سے سچی
ہمدردی دیکھ کر کتنے خوش ہوتے ہیں۔ آہ ہماری
پیارے اُمید توہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ
رہتی ہے۔

دیکھو وہ بدھا آنکھوں سے اندھا اپنے گھر میں بیٹھا
روتا ہے۔ اُسکا پیارا بیٹا بھیڑوں کے ریور میں سے غائب ہو گیا ہے۔
وہ اُسکو دھونڈتا ہے پر وہ نہیں ملتا۔ مایوس ہے پر اُمید
نہیں توتی۔ لہو بہرا دانتوں پھٹا کرتا دیکھتا ہے پر ملنے سے
نا اُمید نہیں، فاقوں سے خشک ہے۔ غم سے زار نزار ہے۔
روتے روتے آنکھیں سفید ہو گئی ہیں کوئی خوشی اُسکے
ساتھ نہیں ہے مگر صرف ایک اُمید ہے جس نے اُسکو رصل کی
اُمید میں زندہ اور اُس خیال میں خوش رکھا ہے۔

اُجالا ہوگی - تیری پیاری پیاری باتیں ہمارے غم کو دور
 کرینگی - تیری آواز ہمارے لئے خوش آئند راگنیاں ہونگی -
 سورہ میرے بچے سورہ - اے ہماری امیدوں کے پودے سورہ -
 بولو جب اس دنیا میں ہم تم سے جدا ہو جاوینگے تو تم
 کیا کرو گے - تم ہماری بے جان لاش کے پاس کھڑے ہو گے -
 تم پوچھو گے اور ہم کچھ نہ بولیں گے - تم روؤ گے اور ہم
 کچھ رحم نہ کرینگے - اے میرے پیارے رونے والے - تم
 ہمارے دھیر پر آکر ہماری روح کو خوش کرو گے - آہ ہم
 نہ ہونگے اور تم ہماری یادگاری میں آنسو بہاؤ گے - اپنی
 ماں کا محبت بھرا چہرہ اپنے باپ کی نورانی صورت یاد
 کرو گے - آہ ہم کویہی رنج ہے کہ اس وقت ہماری محبت
 یاد کر کے تم رنجیدہ ہو گے - سورہ میرے بچے سورہ -
 سورہ میرے بالے سورہ -

یہ اُمید کی خوشیاں ماں کو اُس وقت تھیں جب کہ
 بچہ غوں غاں بھی نہیں کر سکتا تھا - مگر جب وہ ذرا
 اور بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے اپنی ماں کے دل کو شاد
 کرنے لگا اور اماں اماں کہنا سیکھا اُسکی پیاری آواز ادھورے
 لفظوں میں اُسکی ماں کے کان میں پہنچنے لگے - آنسوؤں سے



ہوئے خیالات کو پھر زندہ کرتی ہیں۔ تمام فکریں دل سے
دور ہوتی ہیں۔ اور در در دراز زمانہ کی خیالی خوشیاں
سب آموجود ہوتی ہیں۔

دیکھ نادان بے بس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے اُسکی
مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے اور
اس گہوارہ کی توری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ ہاتھ کام میں
اور دل بچے میں ہے اور زبان سے اُسکویں لوری دیتی
ہے۔ سورہ میرے بچے سورہ۔ اے اپنے باپ کی مورت اور
میرے دل کی تہندک سورہ۔ اے میرے دلکی کونپل
سورہ۔ بڑھہ اور پل پل۔ تجھ پر کبھی خزاں نہ آنے
پائے۔ تیری تہنی میں کوئی خار کبھی نہ پھوٹے۔ کوئی
کٹھن گھڑی تجھ کو نہ آئے۔ کوئی مصیبت جو تیرے ماں
باپ نے بھگتی تو نہ دیکھے۔ سورہ میرے بچے سورہ۔ میری
آنکھوں کے نور اور میرے دل کے سرور میرے بچے سورہ۔
تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا۔ تیری خصلت
تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی۔ تیری شہرت۔ تیری
لیاقت۔ تیری محبت جو تو ہم سے کریگا آخر کار ہمارے
دل کو تسلی دینگی۔ تیری ہنسی ہمارے اندھیرے گھر کا

اُس نیک نبی کو جس نے سینکڑوں برس اپنی قوم
 کے ہاتھ سے مصیبت اُٹھائی اور مار پیت سہی - تیرا ہی
 خوبصورت چہرہ تسلی دینے والا تھا - وہ ناخدا جب کہ
 طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا اور بجز مایوسی کے
 اور کچھ نظر نہیں آتا تھا تو توہی اُس طوفان میں
 اُس کی کشتی کھینے والی اور اسکا بیدرا پار لگانے والی
 تھی - تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی
 کو عزت ہے - زیتون کی ہری ٹہنی کو جو وفادار کبوتر
 کی چونچ میں وصل کے پیغام کی طرح پہونچی جو کچھ
 برکت ہے تیری ہی بدولت ہے -

اے آسمانوں کی روشنی - اور اے ناامید دلوں کی
 تسلی اُمید - تیری ہی شاداب اور سرسبز باغ سے ہر ایک
 محنت کا پھل ملتا ہے - تیرے ہی پاس ہر درد کی دوا
 ہے - تجھی سے ہر ایک رنج میں آسودگی ہے - عقل کے
 درمیاں جنگلوں میں بہتکتے بہتکتے تھکا ہوا مسافر تیرے ہی
 گھنے باغ کے سرسبز درختوں کے سایہ کو دھونڈھتا ہے -
 رہاں کی ٹھنڈی ہوا خوش الحان جانوروں کے راگ بہتی
 نہروں کی لہریں اُسکے دل کو راحت دیتی ہیں - اُسکے مرے

از نورانی چہرہ والے یقین کی اکلوتی خوبصورت بیٹی - اُمید -
یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے - توہی ہماری مصیبت
کے رقتوں میں ہمکو تسلی دیتی ہے - توہی ہمارے آرزو
رقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے - تیری ہی بدولت نہایت
دور دراز خوشیاں ہمکو نہایت ہی پاس نظر آتی ہیں -
تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل مشکل گھاٹیاں ہم
طے کرتے ہیں - تیرے ہی سبب سے ہمارے خرابیدہ
خیال جاگتے ہیں - تیری ہی برکت سے خوشی - خوشی کے
لئے نام آوری - نام آوری کے لئے بہادری - بہادری کے لئے
فیاضی - فیاضی کے لئے محبت - محبت کے لئے نیکی - نیکی
کے لئے تیار ہے - انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں
تیری ہی تابع اور تیری ہی فرمانبردار ہیں -

وہ پہلا گنہگار انسان جب شیطان کے چنگل میں پھنسا
اور تمام نیکیوں نے اُس کو چھوڑا اور تمام بدیوں نے
اُس کو گھیرا تو صرف توہی اس کے ساتھ رہی - توہی
نے اُس ناامید کو ناامید ہونے نہیں دیا - توہی نے
اُس موت میں پھنسنے والے کو مرنے نہیں دیا - توہی نے
اُس کو اُس ذلت سے نکالا - اور پھر اُسکو اُسی اعلیٰ درجہ
پر پہنچایا جہاں کہ فرشتوں نے اُسکو سجدہ کیا تھا -

اُمید کی خوشی

اے آسمان پر بھورے بادلوں میں بجلی کی طرح
چمکنے والی دھنک - اے آسمان کے تارے تمہاری
خوش نما چمک - اے بلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں
کرنے والی دھندلی چوٹیوں - اے پہاڑ کے عالیشان درختوں - اے
ارنچے ارنچے ٹیلوں کے دلکش بیل بوٹو! تم بہ نسبت ہمارے
پاس کے درختوں اور سرسبز کھیتوں اور لہراتی ہوئی نہروں کے
کیوں زیادہ خوشنما معلوم ہوتے ہو - اسلئے کہ ہم سے بہت دور
ہو - اس دوری ہی نے تم کو یہ خوبصورتی بخشی ہے -
اس دوری ہی سے تمہارا نیلا رنگ ہماری آنکھ کو بہایا ہے -
تو ہماری زندگی میں بھی جو چیز بہت دور ہے وہی
ہم کو زیادہ خوش کرنے والی ہے -

وہ چیز کیا ہے - کیا عقل ہے جس کو سب، سب سے اعلیٰ
سمجھتے ہیں - کیا وہ ہم کو آئندہ کی خوشی کا یقین دلا
سکتی ہے؟ ہرگز نہیں - اُسکا میدان تو نہایت تنگ ہے -
بڑی دور دھوپ کرے تو نیچر تک اس کی رسائی ہے جو
سب کے سامنے ہے -

مگر جب کہ ہم دوسری قوموں سے از راہ تعصب نفرت رکھیں اور کوئی نیا طریقہ زندگی کا رہ کیساہی بے عیب ہو اختیار کرنا صرف بسبب اپنے تعصب یا رسم و رواج کی پابندی کے معیوب سمجھیں تو پھر ہم کو اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کی کیا توقع ہے ۔

مگر جب کہ ہمارے مسلمان ہیں اور ایک مذہب رکھتے ہیں جسکو ہم دل سے سچ جانتے ہیں اس لئے ہم کو مذہبی پابندی ضرور ہے اور وہ اسی قدر ہے کہ جو بات معاشرت اور تمدن اور زندگی بسر کرنے اور دنیاوی ترقی کی اختیار کرتے ہیں اُس کی نسبت اتنا دیکھ لیں کہ وہ مباحات شرعیہ میں سے ہے یا محرمات شرعیہ میں سے ۔ در صورت ثانی بلاشبہ ہم کو احتراز کرنا چاہئے اور در صورت اول بلا لحاظ پابندی رسوم کے اور بلا لحاظ اس بات کے کہ لوگ ہم کو برا کہتے ہیں یا بھلا اُسکو اختیار کرنا ضرور بلکہ واسطے ترقی قومی کے فرض ہے ۔

خدا ہمہ مسلمانان را بریں کار توفیق دہد ۔ آمین

پابندی میں پڑ گئے اور اس سبب سے وہ قوتیں جن سے انسان کو روز بروز ترقی ہوتی ہے اُن میں سے معدوم ہو گئیں۔ پس جب کہ ہم مسلمان ہندوستان کے رہنے والے جن کی رسومات بھی عمدہ اصول و قواعد پر مبنی نہیں ہیں بلکہ کوئی رسم اتفاقیہ اور کوئی رسم بلا خیال اور قوموں کے اختلاط سے آگئی ہے جس میں ہزاروں نقص اور برائیاں ہیں پھر ہم ان رسوموں کے پابند ہوں اور نہ ان کی بھلائی برائی پر غور کریں اور نہ خود کچھ اصلاح اور درستی کی فکر میں ہوں بلکہ اندھا دھندی سے اُنہی کی پیروی کرتے چلے جاویں۔ تو سمجھنا چاہئے کہ ہمارا حال کیا ہو گیا ہے اور آئندہ کیا ہونے والا ہے۔

ہماری نوبت چینوں کے حال سے بھی رسومات کی پابندی کے سبب بدتر ہو گئی ہے اور اب ہم میں خود اتنی طاقت نہیں رہی کہ ہم اپنی ترقی کر سکیں، اس لئے بجز اسکے کہ دوسری قوم ہماری ترقی اور ہمارے قوائے عقلی کی تحریک کا باعث ہو اور کچھ چارہ نہیں۔ بعد اسکے کہ ہمارے قوائے عقلیہ تحریک میں آجاریں اور پھر قوت ایجاد ہم میں شگفتہ ہو۔ تب ہم اس قابل ہونگے کہ خود اپنی ترقی کے لئے کچھ کر سکیں۔

قائم ہو گئیں۔ اور یہ کام اُن لوگوں کا تھا جو اس قوم میں نہایت دانا اور بڑے حکیم تھے۔

چین کے لوگ اس باب میں مشہور و معروف ہیں کہ جو عمدہ سے عمدہ دانش اور عقل کی باتیں اُن کو حاصل ہیں اُنکو ہر شخص کی طبیعت پر بخوبی منقش کرنے کے واسطے اور اس بات کے اُٹے کہ جن شخصوں کو وہ دانشمندی کی باتیں حاصل ہیں ان کو بڑے بڑے عہدے ملیں نہایت عمدہ طریقے اُن میں رائج ہیں۔ اور وہ طریقے حقیقت میں بہت ہی عمدہ ہیں بے شک جن لوگوں نے اپنا ایسا دستور قائم رکھا انہوں نے انسان کی ترقی کے اسرار کو پالیا اور اسلئے چاہئے تھا کہ وہ قوم تمام دنیا میں ہمیشہ افضل رہتی مگر برخلاف اسکے انکی حالت سکون پذیر ہو گئی ہے اور ہزاروں برس سے ساکن ہے اور اگر ان کی کبھی کچھ اور ترقی ہوگی تو بے شک غیر ملکوں کے لوگوں کی بدولت ہوگی۔ اس خرابی کا سبب یہی ہوا کہ اُس تمام قوم کی حالت یکساں اور مشابہ ہو گئی اور سب کے خیالات اور طریق معاشرت ایک سے ہو گئے اور سب کے سب یکساں قواعد اور مسائل کی

رنج و راحت یکساں ہوتے جاتے ہیں اور بلاشبہ مُلک اور قوم کے مُہذب ہونے کا اور ترقی پر پہنچنے کا یہی نتیجہ ہے اور ایسا عمدہ نتیجہ ہے کہ اُس سے عمدہ نہیں ہو سکتا۔

مگر بارِ صفِ اس کے ہم اس نتیجہ کو بشرطیکہ اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے باعثِ تنزل قرار دیتے ہیں تو ضرور ہم کو کہنا پڑے گا کہ کیوں یہ عمدہ نتیجہ باعثِ تنزل ہو گا۔ سبب اس کا یہ ہے جب سب لوگ ایک سی طبیعت اور عادت اور خیال کے ہو جاتے ہیں تو اُن کی طبیعتوں میں سے رہ قوتیں جو نئی باتوں کے ایجاد کرنے اور عمدہ خیالات کے پیدا کرنے اور قواعدِ حسنِ معاشرت کو ترقی دینے کی ہیں زائل اور کمزور ہو جاتی ہیں اور ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ ترقی تھہر جاتی ہے اور پھر ایسا زمانہ ہوتا ہے کہ تنزل شروع ہو جاتا ہے۔

اس معاملہ میں ہم کو ملک چین کے حالات پر غور کرنے سے عبرت ہوتی ہے۔ چینی بہت لائق آدمی ہیں بلکہ اگر بعض باتوں پر لحاظ کیا جاوے تو عقلمند بھی ہیں۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ اُن کی خوش قسمتی سے ابتدا ہی میں ان کی قوم میں بہت اچھی اچھی رسمیں

یہ مشابہت اور مسارات روز بروز ترقی پاتی جاتی ہے۔ اور تعلیم و تربیت کی مشابہت اور مسارات سے اس کو اور زیادہ وسعت ہوتی ہے۔ تعلیم کے اثر سے تمام لوگ عام خیالات کے اور غلبہ اور رائے کے پابند ہوتے جاتے ہیں اور جو عام ذخیرہ حقائق اور مسائل اور رایوں کا موجود ہے اُس پر سب کو رسائی ہوتی ہے۔ آمد و رفت کے ذریعوں کی ترقی سے مختلف مقاموں کے لوگ مجتمع اور شامل ہوتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں اور اس سبب سے بھی مشابہت مذکور ترقی پاتی ہے۔ کارخانوں اور تجارت کی ترقی سے آسائش اور آرام کے وسیلے اور فائدے زیادہ شائع ہوتے ہیں اور ہر قسم کی عالی ہمتی بلکہ بڑی سے بڑی اولوالعزمی کے کام ایسی حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ ہر شخص اُن کے کرنے کو موجود و مستعد ہوتا ہے۔ کسی خاص شخص یا گروہ پر منحصر نہیں رہا ہے، بلکہ اولوالعزمی تمام لوگوں کی خاصیت ہوتی جاتی ہے اور ان سب پر آزادی اور عام رائے کا غلبہ بڑھتا جاتا ہے اور یہ تمام امور ایسے ہیں جیسے انگلستان کے تمام لوگوں کی رائیں اور عادتیں اور طریق زندگی اور قواعد معاشرت اور امرات

ان کوششوں کا نتیجہ انگلستان میں روز بروز ظاہر ہوتا جاتا ہے جو حالات کہ اب خاص خاص لوگوں اور فرقوں کے پائے جاتے ہیں اور جن کے سبب ان کی خاص خاص عادتیں قائم ہوئی ہیں وہ اب روز بروز ایک دوسرے کے مشابہ ہوتی جاتی ہیں۔ انگلستان میں اس زمانہ سے پہلے مختلف درجوں کے لوگ اور مختلف ہمسایوں کے لوگ اور مختلف پیشہ والے گویا جدی جدی دنیا میں رہتے تھے یعنی سب کا طریقہ اور عادت جدا جدا تھی۔ اب وہ سب طریقے اور عادتیں ہر ایک کی ایسی مشابہ ہو گئی ہیں کہ گویا سب کے سب ایک ہی محلہ کے رہنے والے ہیں۔ انگلستان میں یہ نسبت سابق کے اب بہت زیادہ رواج ہو گیا ہے کہ لوگ ایک ہی قسم کی تصنیفات کو پڑھتے ہیں اور ایک ہی سی باتیں سنتے ہیں اور ایک ہی سی چیزیں دیکھتے ہیں اور ایک ہی سے مقاموں میں جاتے ہیں اور یکساں باتوں کی خواہش رکھتے ہیں اور یکساں ہی چیزوں کا خوف کرتے ہیں اور ایک ہی سے حقوق اور آزادی سب کو حاصل ہے، اور ان حقوق اور آزادیوں کے قائم رکھنے کے ذریعے بھی یکساں ہیں اور

لوگ اُسپر اتفاق کریں اُسی وقت تبدیل نہ ہو سکے اور اسی تبدیلی کے ساتھ انکی ترقی بھی ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ نئی نئی کلیں ہمیشہ ایجاد ہوتی رہتی ہیں اور تاریکیکہ اُن کی جگہ بہتر کلیں ایجاد نہ ہو جاویں وہ بدستور رہتی ہیں ملکی معاملات اور تعلیم میں بلکہ اخلاق میں بلکہ مذہب میں ہمیشہ ترقی کے خواہاں ہیں، پس یہ تصور کرنا کہ یورپ بھی مثل ہمارے مگر دوسری قسم کی رسموں میں مبتلا ہے۔ محض نادانی اور ناواقفیت کا سبب ہے۔

البتہ یورپ میں اور بالتخصیص انگریزوں میں جو بات نہایت عمدہ اور قابل تعریف اور لائق خواہش کے ہے اور درحقیقت بغیر اس کے کوئی قوم مہذب اور تربیت یافتہ نہیں ہو سکتی رہی بات اُس کی تنزل کا باعث ہوگی۔ بشرطیکہ اُس کی اصلاح نہ ہوتی رہیگی۔ اور یہ ہے کہ تمام انگریز جو حُب وطن میں نامی ہیں اس بات پر نہایت کوشش اور جانفشانی کر رہے ہیں کہ کل قوم کے لوگ یکساں ہو جاویں اور سب اپنے خیالات اور طریقے یکساں مسائل اور قواعد کے تحت حکومت کر دیں اور

یہ اعتراض سچ ہے اور درحقیقت یورپ میں رسموں کی پابندی کا نہایت نقصان ہے اور اگر اُس کی اصلاح نہ ہوتی رہیگی جیسے کہ اب تک ہوتی رہی ہے تو اُن کو بھی بد نصیبی کا دن پیش آوے گا مگر یورپ میں اور مشرقی ملکوں کی پابندی رسومات میں ایک بڑا فرق ہے۔ یورپ میں رسومات کی پابندی ایک عجیب اور نئی بات ہونے کو تو مانع ہے مگر رسومات کی تبدیلی کا کوئی مانع نہیں۔ اگر کوئی شخص عمدہ رسم نکالے اور سب لوگ پسند کریں فی الفور پرانی رسم چھوڑ دی جائیگی اور نئی رسم اختیار کر لی جائیگی اور اس سبب سے اُن لوگوں کے قوائے عقلی اور حالت تمیز اور قوتِ ایجاد ضائع نہیں ہوتی۔

تم دیکھو کہ یہ پوشاک جو اب انگریزوں کی ہے اُنکے باپ دادا کی نہیں ہے بالکل اپنی پوشاک بدل دی ہے۔ ہر درجہ کے لوگوں کا جو مختلف لباس تھا اُس رسم کو چھوڑ دیا گیا ہے اور ضروری سمجھا گیا ہے کہ ہر شخص ایک سا مثل اوزوں کی لباس پہنے۔ اس وقت کوئی رسم یورپ میں ایسے درجہ پر نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی رسم اُسکے برخلاف مگر اس سے عمدہ ایجاد کرے اور

سبب یہی تھا کہ اُس زمانہ میں اُن قوموں میں رسم کی پابندی قطعی نہ تھی اور جو کسی قدر تھی تو اُس کے ساتھ ہی آزادی اور ترقی کا جوش ان میں قائم تھا۔

تواریخ سے ثابت ہے کہ ایک قوم کسی قدر عرصہ تک ترقی کی حالت پر رہتی ہے اور اس کے بعد ترقی مسدود ہو جاتی ہے مگر یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ ترقی کب مسدود ہوتی ہے۔ یہ اُسی وقت مسدود ہوتی ہے جب کہ اُس قوم میں سے وہ قوت اُٹھ جاتی ہے جس کے سبب سے نئی نئی باتیں پیدا ہوتی ہیں اور ٹھیک ٹھیک مسلمانوں کا اس زمانہ میں یہی حال ہے بلکہ میں نے غلطی کی کیونکہ ترقی مسدود ہونے کا زمانہ بھی گزر گیا اور تذل اور ذلت و خواری کا زمانہ بھی انتہا درجہ کو پہنچ گیا ہے

ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ بات کہے کہ یورپ کی قوموں میں بھی جو اس زمانہ میں ہر قسم کی ترقی کی حالت میں شمار ہوتی ہیں بہت سی رسمیں ہیں اور ان رسموں کی نہایت درجہ پر پابندی ہے تو وہ قومیں کیوں ترقی پر ہیں؟

پس اب دیکھو کہ مشرقی یا ایشیائی قوموں کا جن میں
مسلمان بھی داخل ہیں کیسا ابتر اور خراب اور
ذلیل حال ہے ۔

ان مشرقی یا ایشیائی قوموں میں بھی کسی زمانہ
میں قوت عقل اور جودت طبع اور مادہ ایجاد ضرور
موجود ہوگا جس کی بدولت وہ باقیں ایجاد ہوئیں جو
اب رسمیں ہیں اس لئے کہ اُن کے بزرگ ماں کے پیت سے
تربیت یافتہ اور حسن معاشرت کے فنوں سے واقف پیدا
نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ سب باتیں اُنہوں نے اپنی محنت
اور علم اور عقل اور جودت طبع سے ایجاد کی تھیں اور
انہی وجوہات سے دنیا کی نہایت بڑی اور قوی اور
مشہور قوموں سے ہو گئے تھے مگر اب اُن کا حال دیکھو کہ
کیا ہے اسی رسومات کی پابندی سے ان کا مال یہ ہوا ہے
کہ اب وہ ایسی قوموں کے محکوم ہیں اور ایسے لوگوں کی
آنکھوں میں ذلیل ہیں جن کے آبا و اجداد اُس وقت جنگلوں میں
آوارہ پڑے پھرتے تھے ۔ جس وقت ان قوموں کے آبا و اجداد
عالی شان محلوں میں رہتے تھے اور بڑے بڑے عبادت خانے
اور مکانات شاہی اور شہنشاہی محل بنواتے تھے اُس کا

فرق ہے۔ رسومات کی پابندی میں اُس کی پہلائی و برائی و مفید و غیر مفید و مناسب حال و مطابق طبع ہونے یا نہ ہونے کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا اور بغیر سوچے سمجھے اس کی پابندی کی جاتی ہے اور دوسری حالت میں برجہ پسندیدہ ہونے کے اور اس لئے دوسری حالت میں جو قوتیں ترقی کی انسان میں ہیں وہ معدوم و مفقود نہیں ہوتیں الا پہلی حالت میں معدوم و نابود ہو جاتی ہیں۔

رسم کی پابندی ہر جگہ انسان کی ترقی کی عائق و مزاحم ہے۔ چنانچہ وہ پابندی ایسی قوت طبعی کے جسکے ذریعہ سے بہ نسبت معمولی باتوں کے کوئی بہتر بات کرنے کا قصد کیا جارے برابر مخالف رہتی ہے اور انسان کی قنزل حالت کا اصلی باعث ہوتی ہے۔

اب اس رائے کو دنیا کی موجودہ قوموں کے حال سے مقابلہ کر۔ تمام مشرقی یا ایشیائی ملکوں کا حال دیکھو کہ اُن ملکوں میں تمام باتوں کے تصفیہ کا مدار رسم و رواج پر ہے۔ اُن ملکوں میں مذہب اور استحقاق اور انصاف کے لفظوں سے رسموں کی پابندی مراد ہوتی ہے۔

رسومات جو مقرر ہوئی ہیں غالباً اُس زمانہ میں جب کہ وہ مقرر ہوئیں مفید تصور کی گئی ہوں مگر اس بات پر بھروسہ کرنا کہ درحقیقت وہ ایسی ہی ہیں محض غلطی ہے۔ ممکن ہے کہ جن لوگوں نے ان کو مقرر کیا اُنکی رائے میں غلطی ہو اُن کا تجربہ صحیح نہ ہو یا اُن کا تجربہ نہایت محدود اور صرف چند اشخاص سے متعلق ہو یا اُس تجربہ کا حال صحیح صحیح بیان نہ ہوا ہو۔ یا وہ رسم اس وقت اور اس زمانہ میں مفید ہو۔ الاً حال کے زمانہ میں مفید نہ رہی ہو بلکہ مضر ہو یا وہ رسم جن حالات پر قائم کی گئی تھی کسی شخص کی وہ حالت نہ ہو غرض کہ رسموں کی پابندی میں مبتلا رہنا ہر طرح پر نقصان کا باعث ہے اگر کوئی نقصان نہ ہو تو یہ نقصان تو ضرور ہے کہ آدمی کی عقل اور دانش جودتِ طبع اور قوتِ ایجاد باطل ہو جاتی ہے۔

یہ بات بے شک ہے کہ کسی عمدہ بات کی ایجاد کی لیاقت ہر ایک شخص کو نہیں ہوتی بلکہ چند دانا شخصوں کو ہوتی ہے جن کی پیروی اور سب لوگ کرتے ہیں لیکن رسم کی پابندی اور اس قسم کی پیروی میں بہت بڑا

کسی بات کی خواہش کرنے کا موقع یہاں اتفاق نہیں ہوتا اور اس لئے طبیعت خرد متحمل اور مطیع رسموں کی پابندی کی ہو جاتی ہے یہاں تک کہ جو باتیں دل کی خوشی کی کرنی ہوتی ہیں ان میں بھی اوروں کے مطابق کام کرنے کا خیال اول دل میں آتا ہے ۔ غرض کہ ان کی پسند وہی ہوتی ہے جو بہت سے لوگوں کی ہے وہ صرف ایسی باتوں کے پسند کرنے پر راغب ہوتے ہیں جو عام پسند ہوں اور مذاق اور اصلی سلیقہ جو رسم و رواج کے مطابق نہ ہو اُس سے ایسی ہی گریز کی جاتی ہے جیسے کہ جرموں سے یہاں تک اپنی خاص طبیعت کی پیروی نہ کرتے نہ کرتے اُن میں اپنی طبیعت ہی باقی نہیں رہتی کہ جس کی پیروی کریں اور ان کی ذاتی قوتیں بالکل پژمردہ اور بیکار رہنے کے سبب بالکل ضائع ہو جاتی ہیں اور وہ شخص اپنی دلی خواہش کرنے اور ذاتی خوشی اٹھانے کے قابل نہیں رہتے اور عموماً ایسی طبع زیادہ رئیس یا خیالات نہیں رکھتے جو خاص اُن کی اصلی خوشی سے مخصوص ہوں اب غور کرنا چاہئے کہ انسان کی ایسی حالت پسندیدہ ہو سکتی ہے یا نہیں ۔

پوچھتا کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے اور ہمارے مناسب یا ہماری پسند اور ہماری پسند کے لائق کیا بات ہے یا جو عمدہ صفتیں مجھ میں ہیں ان کا ظہور نہایت عمدگی سے کس طرح ممکن ہے اور کونسی بات انکی ترقی اور شگفتگی کی معادن ہے بلکہ وہ اپنے دل سے یہ پوچھتے ہیں کہ میری حالت اور رتبہ کے کونسی چیز مناسب ہے میرے رتبہ اور مقدر کے آدمی کس رسم و رواج کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی اس سے بھی زیادہ بیوقوف ہوا تو وہ اپنے دل سے اس سے بھی زیادہ بدتر سوال کرتا ہے اور یوں پوچھتا ہے کہ جو لوگ مجھ سے برتر ہیں اور رتبہ اور مقدر میں زیادہ ہیں وہ کن رسموں کو بجا لاتے ہیں تاکہ یہ شخص بھی ویسا ہی کر کے ان ہی کی سی شان میں شامل ہو۔

اس بات سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جو لوگ اس طرح پر رسمات کو بجالاتے ہیں وہ اپنی خواہش اور مرضی سے ان رسمات کو اور چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں اور ترجیح دے کر پسند کرتے ہیں۔ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو بجز ایسی بات کے جو رسمی ہوتی ہے اور

کرنے سے آدمی خراب کاموں اور بری باتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، مگر یہ بات صحیح نہیں ہے اس لئے کہ انسان کی ذات میں جیسے کہ خراب کام کرنے کی قوتیں اور جذبے ہیں ویسے ہی ان کے روکنے کی بھی قوتیں اور جذبے ہیں۔ مثلاً ایمان یا نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے۔ پس خراب کام ہونے کا یہ باعث نہیں ہے کہ اُس نے رسومات کی پابندی نہیں کی بلکہ یہ باعث ہے کہ اُس نے ایک قسم کی قوتوں اور جذبوں کو شگفتہ اور شاداب اور قوی کیا ہے۔ اور دوسری قسم کی قوتوں اور جذبوں کو پژمردہ اور ضعیف۔ اگر رسومات کی پابندی نہ رکھنے کے ساتھ انسان کا ایمان ضعیف نہ ہو یا رہ دلی نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے پژمردہ نہ ہو تو بجز عمدہ اور پسندیدہ باتوں کے اور کسی بات کا ارتکاب نہ ہو۔

ہمارے زمانہ میں ہر شخص اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ تک رسم و رواج کا ایسا پابند ہے جیسے کوئی شخص ایک بڑے زبردست حاکم کے نیچے اپنی زندگی بسر کرتا ہو، کوئی شخص یا کوئی خاندان اپنے دل سے یہ بات نہیں

لئے اس کو قوت تحقیق درکار ہوتی ہے اور انجام کار پر غور کرنے کے لئے قوت تجویز اور اس کا تصفیہ کرنے کو قوت استقراء اور بہلا برا ٹھرانے کو قوت امتیاز اور سب باتوں کے تصفیہ کے بعد اس پر قائم رہنے کے لئے قوت استقلال اور یہی سب کام ہیں جو انسان کے کرنے کے لائق ہیں آدمی مثل ایک کل کے نہیں ہے کہ جو اس کے واسطے مقرر کر دیا ہے اسی کو انجام دیا کرے، بلکہ وہ ایک ایسا درخت ہے جو اُن اندرونی قوتوں سے جو خدا نے اس میں رکھی ہیں اور جن کے سبب وہ زندہ مخلوق کہلاتا ہے ہر چہار طرف پھیلے اور بڑھے۔ پھولے اور پھلے۔ جو امر کہ پسندیدہ اور تسلیم کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنے فہم اور اپنی عقل سے کام لیں اور رسم و رواج کی پابندی بھی ایک معقول طور پر رکھیں یعنی جو عمدہ و مفید ہیں ان کو اختیار کریں جو قابل اصلاح ہوں اُن میں ترمیم کریں اور جو بری خراب ہوں ان کی پابندی چھوڑ دیں نہ یہ کہ اندھوں کی طرح یا ایک کل کی مانند ہمیشہ اسی سے لپٹے رہیں۔

یہ بات خیال کی جاتی ہے کہ رسومات کی پابندی نہ

تعالیٰ نے ہر آدمی کو جدا جدا عنایت کی ہیں۔ ان قوتوں کا برتاؤ جو کسی چیز کی بھلائی برائی دریافت کرنے اور کسی بات پر رائے دینے اور در باتوں میں امتیاز کرنے اور عقل و فہم کو تیز رکھنے بلکہ اخلاقی باتوں کی بھلائی اور برائی تجویز کرنے میں مستعمل ہوتی ہیں صرف ایسی ہی صورت میں ممکن ہے جب کہ ہم کو ہر بات کے پسند یا ناپسند کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ جو شخص کوئی بات رسم کی پابندی سے اختیار کرتا ہے وہ شخص اس بات کو پسند یا ناپسند نہیں کرتا اور نہ ایسے شخص کو اس بات کی تمیز یا خواہش میں کچھ تجربہ حاصل ہوتا ہے، اخلاقی اور عقلی قوتوں کی ترقی اس صورت میں حاصل ہوتی ہے جب کہ وہ استعمال میں لائی جائیں ان قوتوں کو اردن کی تقلید کرنے سے کسی بات کی مشق حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایسے شخص کے لئے بجز ایسی قوت تقلید کے جو بندہ میں ہوتی ہے اور کسی قوت کی حاجت نہیں۔

البتہ جو شخص اپنا طریقہ خود پسند کرتا ہے وہ اپنی تمام قوتوں سے کام لیتا ہے زمانہ حال پر نظر کرنے کے

درایتوں پر یا پرانی رسم و رواج پر مبنی ہے تو رہاں انسانوں کی خوشحالی کا ایک بڑا جزو موجود نہیں ہے اور چونکہ خوشحالی ہر فرد بشر کی اور نیز کل لوگوں کی ترقی کا بہت بڑا جزو ہے تو اس ملک میں جہاں رسموں کی پابندی ہے وہ جزو بھی ناپید ہوتا ہے۔

کسی شخص کی یہ رائے نہ ہوگی کہ آدمیوں کو بجز ایک دوسرے کی تقلید کے اور کچھ مطلق نہ کرنا چاہئے۔ اور نہ کوئی شخص یہ کہے گا کہ آدمیوں کو اپنی اوقات بصری کے طریقے اور اپنے کاروبار کی کارروائی میں اپنی خوشی اور اپنی رائے کے مطابق کوئی بھی بات نہ کرنی چاہئے۔ سیدھا طریقہ یہ ہے کہ آدمی کو اس کی جوانی میں اس طرح سے تعلیم ہونی چاہئے کہ اور لوگوں کے تجربوں سے جو نتیجے تحقیق ہو چکے ہیں ان کے فوائد سے مستفید ہو اور پھر جب اس کی عقل پختگی پر پہنچے تو خود ان کی بھلائی اور برائی کو جانچے۔

بے سونچے اور بے سمجھے رسومات کی پابندی کرنے سے گورہ رسمیں اچھی ہی کیوں نہ ہوں آدمی کی ان صفتوں کی ترقی اور شگفتگی نہیں ہوتی جو خداے

انتخاب از مضامین سر سید احمد رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات

ہم اپنے اس آرٹیکل کو بعض بڑے بڑے حکیموں کی
تحریروں سے اخذ کر کے لکھتے ہیں۔ کیا عمدہ قول ایک بڑے
دانا کا ہے کہ ”انسان کی زندگی کا منشاء یہ ہے کہ اس کے
تمام قری اور جذبات نہایت روشن اور شگفتہ ہوں اور
اُن میں باہم نامناسبت اور تناقص واقع نہ ہو بلکہ سب کا مل کر
ایک کامل اور نہایت متنا سب مجموعہ ہو“۔ مگر جس قوم
میں کہ پرانی رسم و رواج کی پابندی ہوتی ہے یعنی اُن
رسموں پر نہ چلنے والا مطعون اور حقیر سمجھا جاتا ہے۔ رہاں
زندگی کا منشاء معلوم ہو جاتا ہے۔

ایک اور بڑے دانا شخص کی رائے کا یہ نتیجہ ہے
کہ آزادی اور اپنی خوشی پر چلنا جہاں تک کہ دوسروں
کو ضرر نہ پہونچے ہر انسان کی خوشی اور اس کا حق
ہے۔ پس جہاں کہیں معاشرت کا قاعدہ جس پر کوئی چلتا
ہے خاص اس کی خصلت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اگلی

جسم پر وہی پرانا لباس ہے سر پر چوگوشیہ ٹوپي ' جسم پر نیچي چولي کا انگرکھا ' اس کے اوپر مخمل یا جامہ وار کی خفتان ' پاؤں میں گلبدن یا غلطے کا ایک بر کا پا جامہ ' جو لوگ لکھنؤ والے ہیں انہوں نے دہلي کے لباس کے ساتھ ڈاڑھی کو بھی خیرباد کہدیا ہے ' چہرے کی ساخت سے اُن کو دہلي کا شہزادہ کہدو تو کہدو مگر لباس اور وضع قطع سے تو یہ ٹھیک لکھنؤ والے معلوم ہوتے ہیں ۔

کپڑے کے کناروں کو سر کے ناپ کے برابر سی لیا ۔ نیچے پتلی سی گوٹ دیدی اور اوپر کے حصے میں چنٹ دے کر چھوٹا سا گول گٹھ لگا دیا ۔ دہلي کی دوپلڑي ٹوپي اور لکھنؤ کی ٹوپي میں صرف یہ فرق ہے ۔ کہ یہاں یہ ٹوپي اتنی بڑي بناتے تھے کہ سر پر منڈا جائے ' برخلاف اس کے لکھنؤ کی ٹوپي صرف بالوں پر دھري رہتي ہے ۔ ان ٹوپيوں کے علاوہ بعض بعض لوگ پنج گوشیہ ٹوپي بھی پہنتے ہیں ۔ اس ٹوپي میں پانچ گوشے ہوتے ہیں ۔ لیکن اس کی کاٹ چوگوشیہ ٹوپي سے ذرا مختلف ہے ۔ گوشوں کے اوپر کے حصے نوک دار ہوتے ہیں ' بس سمجھ لو کہ جیسے فصیل کے کنارے ۔ نیچے دمے کی بجائے پتلی سی گوٹ ہوتی ہے ۔ یہ ٹوپي قالب چڑھا کر پہني جاتي ہے ۔ قالب چڑھ کر بس ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ہمایوں کے مقبرے کا گنبد ۔ عام لوگوں میں بڑے گول چندوے کی ٹوپي کا بھی بہت استعمال تھا بعض تو بالکل سادي ہوتی ہیں اور بعض سوزني کے کام یا فیتے کے کام کی ہوتی ہے ۔ اس ٹوپي کو بھی قالب چڑھا کر پہنتے ہیں ۔

کچھ ایسے ہیں کہ بنارس آتے جاتے رہتے ہیں۔ جو وہاں جا کر آتا ہے لباس میں نئی تراش خراش کرتا ہے۔ اس طرح اُس کا لباس آدھا تیترا آدھا بٹیر ہو کر نہ لکھنؤ کا رہتا ہے نہ دہلی کا۔ اب جو لوگ یہاں بیٹھے ہیں اُن ہی کو دیکھ لیجئے جو شہزادے لکھنؤ سے آئے ہیں اُن کے سر پر لکھنؤ کی دو پلڑی ٹوپی ہے، اونچی چولی کا انگرکھا ہے، نیچے باریک شربتی ململ کا کرتہ اور تنگ پاجامہ ہے، جنہوں نے قلعہ کبھی نہیں چھوڑا اُن کے

کوٹے کمرک (کمرخ) کے نمونے کے ہو جائیں۔ بعض لوگوں نے اس میں ذرا جدت بھی کی ہے، وہ یہ کہ دمے کو اونچا کر کے پاکھوں کی لمبان کو چوڑان سے کسی قدر بڑھا دیا ہے اور ان کے مل جانے کے بعد جو پہل پیدا ہوتے ہیں ان کو پھر کاٹ کر کلیاں ڈال دی ہیں۔ اس طرح بجائے چار پہل کے ٹوپی کے آٹھ پہل ہو گئے ہیں خوبصورتی کے لئے دمے کے کناروں پر پتلی لبس اور گوشوں کے کناروں پر باریک قیطون لگاتے ہیں۔ بادشاہ سلامت کی ٹوپی ہوتی تو اسی نمونے کی ہے مگر سلے ستارے کے کام سے لپی ہوئی اور جابجا موتی اور نگینے لگے ہوئے۔ اس قسم کی ٹوپی کئی طرح پہنی جاتی تھی۔ قلعہ والے تو پاکھوں کو کھڑا رکھتے ہیں، باقی لوگ ان کو کسی قدر دبا لیتے ہیں۔ جو ٹوپی آٹھ پہل کی ہوتی ہے اس کے پاکھوں کو اتنا دباتے ہیں کہ گوشے دمے کے باہر پھیل کر کنول کی شکل بن جاتے ہیں۔ اس قسم کی ٹوپی ہمیشہ آڑی پہنی جاتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اس کا ایک کونہ بائیں بھوں کو دباؤ۔ اس ٹوپی کے علاوہ ارخ چین کی ٹوپی کا بھی بہت رواج ہے۔ اس کا بنانا کچھ مشکل کام نہیں۔ ایک مستطیل (آئندہ صفحہ پر)

ہڈیاں ، گہرا سانولا رنگ ، داڑھی کلوں پر ہلکی ٹھوڑی پر زیادہ ۔ غرض جیسی مشابہت ان لوگوں میں ہے ۔ شاید ہی کسی خاندان والوں میں ہوگی ۔ امیر تیمور سے لگا کر اس وقت تک ان کی شکل میں کوئی فرق نہیں آیا ہے پہلے تو قلعہ بھر کا ایک ہی لباس^(۱) تھا ۔ مگر اب کچھ دورنگی ہو گئی ہے ۔ وجہ یہ ہوئی کہ جب سے سلیمان شکوہ کا اودھم کے دربار میں رسوخ ہوا خاندان کے کچھ لوگ تو وہیں جا رہے ہیں اور

(۱) اس مضمون میں جا بجا دہلی والوں کے لباس کا ذکر آیا ہے ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذرا وضاحت سے اس لباس کو بقادوں تاکہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے اس محفل کا نقشہ اور اچھی طرح پھر جائے ۔ میرزا نوشہ کا تو ذکر جانے ہی دو وہ تو بڑے اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں ، ان کی ٹوپی دنیا بھر سے جدا تھی ، قاناری کھال (خواہ وہ سمور ہو یا بڑے) اس طرح لیا جاتا تھا کہ نیچے کا گھیرے اوپر کے چندوے سے ذرا بڑا ہے ۔ اس کے بعد چار کنگرے قائم کر کے کھال کو ٹوپی کی آدھی لمبان تک اس طرح کاٹ لیا کہ ٹوپی گڑبڑ کی شکل بن گئی ۔ بیچ میں چندوے کی جگہ مضمحل یا گھرے رنگ کی بانٹ کنگروں کے کناروں سے ملا کر سی لی ، اندر استر دیدیا ۔ چلو میرزا نوشہ کی ٹوپی ہو گئی ۔ شہر میں کلاہ تتری کا بہت استعمال ہے جس کو عام اصطلاح میں چوگوشیدہ ٹوپی کہتے ہیں ۔ یہ بھی کئی وضع کی ہوتی ہیں اور کئی طرح پہنی جاتی ہیں جو ٹوپی شرفا استعمال کرتے ہیں اس کا دمہ (گوٹ) ذرا نیچا ہوتا ہے دمے کے اوپر چار پاکی کی وضع بالکل شاہجہانی معراب کی سی ہوتی ہے چاروں کو اس طرح ملا کر سینے میں کہ چاروں (آئندہ صفحہ پر)

ہمیشہ منہ آتے تھے۔ اسی لئے میرزا نوشہ مولانا صہبائی کے
 منہ سے ”آپ کے دوست“ کا لفظ سن کر مسکرائے اور کہا
 ”بہی میں تو ان کے منہ کیوں لگنے لگا مگر آج دیکھا جالیگا
 ہر فرعونے را موسیٰ“ سنتا ہوں کہ ہمارے میر صاحب مولوی
 ہدھد کی شان میں آج کچھ فرمانے والے ہیں۔ ان کے سامنے اگر
 یہ ”شہباز سخن“ ٹک گئے تو میں سمجھوں گا کہ بڑا کام کیا“
 غرض یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں۔ کہ استاد ذوق بھی اندر آگئے
 تمام قلعہ ان کے ساتھ آیا تھا۔ صاحب سلامت کر کے سب اپنی
 اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ قلعہ والوں اور ان لوگوں میں جن کا
 تعلق قلعہ سے ہے سلام کرنے کا کچھ عجیب طریقہ ہے۔ سیدے
 کھڑے ہو کر دایاں ہاتھ اس طرح کان تک لیجاتے ہیں جس طرح
 گولی نماز کی نیت باندھتا ہے اور پھر چہرہ دیتے ہیں، چلو
 سلام ہو کیا۔ باقی سب لوگوں سے معمولی طرح سلام کرتے ہیں۔
 قلعہ والوں کی صورت کچھ ایسی ہے کہ ایک ہی نظر میں
 پہچان لئے جاتے ہیں۔ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے سب کی
 وضع قطع ایک ہی سی ہے۔ وہی لمبی گردن، وہی پتلی
 اونچی ناک، لمبا کتابی چہرہ، بڑی بڑی کبوتری آنکھیں،
 بڑا دھانہ، اونچا چوکا، آنکھوں کے نیچے کی ابھری ہوئی

وہ استاد کے نعان کے ہاتھی حافظ ویران صاحب آگئے اور وہ آپ کے دوست دھند بھی ساتھ ہیں ' دیکھئے آج کس کے چونچ مارتے ہیں " میاں دھند کا نام عبد الرحمن ہے ۔ پورب کے رہنے والے ہیں ' دلی میں آکر حکیم آغا خان عیش کے ہاں ٹھہر گئے ہیں ۔ ان کے بچوں کو پڑھاتے ہیں حکیم صاحب ہی کے مشورے سے دھند تخلص اختیار کیا ۔ ان ہی کی تجویز سے چکی ڈالھی رکھی ' سرمنڈا کر نکو عمامہ باندھا اور اس طرح کھٹ بڑھلی ہو گئے ۔ ان ہی کے ذریعے سے دربار میں پہونچے اور " طائر الاراکین شہیر الملک ' دھند الشعرا منقار جنگ بہادر ' خطابات پالے ۔ شروع شروع میں تو انکے ظریفانہ کلام سے مشاعرہ چمک جاتا تھا ' مگر بعد میں انہوں نے استادان فن پر حملے شروع کر دیے کہتے تو یہ ہیں کہ حکیم صاحب کے اشارہ سے ایسا کیا ' لیکن کچھ بھی ہو ' آخر آخر سب کو ان سے کچھ نفرت سی ہو گئی اور بھالے دوسروں کا مذاق اڑانے کے خود ان کا مذاق اڑ جاتا تھا ۔ حکیم صاحب علانیہ تو ان کی مدد کر نہیں سکتے تھے خود ان میں اتنی قابلیت نہ تھی جو دلی والوں کی بہبتیوں کو سنبھال سکتے اس لئے تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈے ہو کر رہ جاتے ۔ میرزا نوشہ اور حکیم مومن خان پر

زیادہ حوصلہ دے " میں نے عرض کی " مولوی صاحب بھلا
میں کیا اور میری بساط کیا یہ سب کیا دھرا نواب زین العابدین
خان کا ہے " فرمانے لگے " بھی یہ بھی اچھی ہوئی ' وہ کہیں کہ
سارا انتظام کریم الدین خان کا ہے ' تم کہو کہ نواب صاحب کا ہے ۔
چلو " من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو " ابھی یہ باتیں ہو ہی
رہی تھیں کہ میرزا نوشہ پالکی میں سے اترے نیر ' علائی
سالک اور حزمین اُن کے ہمراہ تھے ۔ میرزا غالب ' مومن خان کی
طرف بڑھے ' مصافحہ کیا اور کہا " بھی حکیم صاحب آج معتمد
قاصر خان ' معزوں ' کا عظیم آباد سے خط آیا تھا تم کو بہت بہت
سلام لکھا ہے ' معلوم نہیں کہ کیوں ایک ایسی پٹنہ چلے گئے ۔ خواجہ
میر درد کے پوتے ہو کر اُنکا دہلی کو چھوڑنا ہم کو تو پسند نہیں آیا
اب یاروں کو روتے ہیں ۔ دیکھنا کیا درد بھرا شعر لکھا ہے ۔

نہ تو نامہ ہے پیغام زبانی آیا

اے معزوں مجھے یاران وطن بھول گئے

ارے بھی رات تو خاصی اگئی ہے ' ابھی تک میاں ابراہیم

نہیں آئے ۔ آخر یہ مشاعرہ شروع کب ہوگا ۔ " حکیم صاحب کچھ

جواب دینے ہی والے تھے کہ دروازے کے پاس " السلام علیکم " کی

آواز آئی ۔ مولانا صہبائی نے کہا ۔ " اے لیجے میرزا صاحب

شعر کی تعریف کرنا گویا اس کو دوام کی سند دینا ہے۔ کوئی ۶۰ سال کا سن ہے۔ رہنے والے تو نانوتے کے ہیں مگر مدتوں سے دہلی میں آ رہے ہیں۔ دن رات پڑھنے پڑھانے سے کام ہے۔ مشاعروں میں کم جاتے ہیں، یہاں شاید مولانا صہبائی ان کو اپنے ساتھ گھسیٹ لائے ہیں۔ تھوڑے ہی دن ہوئے بیچارے پابندیِ شرع اور تقویٰ کی وجہ سے چکر میں آ گئے تھے۔ ہوا یہ کہ رزیدنت بہادر مدرسے کے معائنہ کو آئے۔ ان کے علم اور رتبے کے خیال سے ہاتھ ملایا جب تک صاحب بہادر وہاں رہے انہوں نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دور رکھتا ہے۔ صاحب کے جاتے ہی بہت احتیاط سے ہاتھ کٹی بار دھویا۔ کسی نے جا کر صاحب سے یہ بات لگادی۔ ان کو بہت غصہ آیا کہ ہم نے تو ہاتھ ملا کر ان کی عزت افزائی کی۔ انہوں نے اس طرح ہماری توہین کی۔ غرض بڑی مشکل سے یہ معاملہ رفع دفع ہوا۔

مولوی صاحب میرے بھی استاد تھے۔ میں بھی آگے بڑھا۔ آداب کیا فرمانے لگے میاں کریم الدین میں تم کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ تم نے تو دہلی والوں کو مات کر دیا سُبْحَانَ اللہ، سُبْحَانَ اللہ! کیا انتظام ہے، دیکھ کر دل خوش ہو گیا، خدا تمہیں اس سے

آغا خان 'عیش' سے اصلاح لینے لگتے ہیں کبھی استاد ذوق کے پاس اصلاح کے لئے غزل لے آتے ہیں۔ ذہن بلا کا پایا ہے 'لاکھوں شعر زباں کی نوک پر ہیں' شعر سنا اور یاد ہوا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی کی غزل سنی اور یاد کر لی اور مشاعرے میں خود اپنے نام سے وہ غزل پڑھ ڈالی اور وہ بیچارہ منہ دیکھتا رہ گیا۔ نواب صاحب آگے بڑھے 'پوچھا' 'منشی جی یہ کیا رنگ ہے' کہنے لگے 'اصلی رنگ' مشاعرہ کب شروع ہوتا ہے 'نواب صاحب نے کہا' 'ابھی شروع ہوتا ہے آپ بیٹھئے تو سہی' خیر ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ میاں عارف نے ان پر ایک دوشالا لاکر ڈال دیا۔ انہوں نے اٹھا کر پھینک دیا۔ غرض جس طرح ننگے آلے تھے اسی طرح بلا تکلف بیٹھ رہے اس کے بعد تو لوگوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا۔ جو آتا اس کا استقبال نواب صاحب کرتے اور لا کر بٹھاتے حکیم مومن خان آلے انکے ساتھ آزاد 'شیفتہ' صہبائی اور مولوی مملوک العلی تھے۔ مولوی صاحب مدرسہ دہلی میں مدرس اول ہیں۔ عجیب باکمال آدمی ہیں۔ مدرسے میں ان کی ذات بابرکات سے وہ فیض ہوا ہے کہ شاید ہی کسی زمانے میں کسی استاد سے ہوا ہو۔ بہت پابندِ شرع ہیں 'اس لئے خود نہیں کہتے مگر سمجھتے ایسا ہیں کہ ان کا کسی

”صبح بھی بوسہ تو دیتا مجھے اے ماہ نہیں“

انہوں نے فوراً عرض کی ۔

”نامناسب ہے میاں وقت سحر گاہ نہیں“

کسی نے ”وقت سحر گاہ“ کی ترکیب پر اعتراض کیا ۔ انہوں نے

جھٹ سے صائب کا یہ شعر پڑھا :—

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردد

خواب در وقت سحر گاہ گراں می گردد

اور معترض اپنا سامنہ لیکر رہ گئے ۔

بڑے دبلے پتلے آدمی تھے ، رنگ بہت کالا تھا شاہ نصیر نے

اسی رنگ کا خاکہ اس طرح آزایا ہے :—

اے خال رخ یار تجھے تھپکی بناتا

پر چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھکر

نواب صاحب نے اُن سب کو بھی ساتھ لیا اور اپنی اپنی جگہ پر

لاکر بٹھا دیا ابھی ان کو بٹھانے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ منشی

محمد علی تشنہ ، چم ننگے ، نشہ میں چور ، جھومتے جھامتے

اندر آئے ۔ نو جوان آدمی مگر عجیب حال ہے ۔ کبھی برہنہ پڑے

پہرتے ہیں ، کبھی کپڑے پہن خاصے بھلے آدمی بنجاتے ہیں ۔

کسی کے شاگرد نہیں اور پھر سب کے شاگرد ہیں ۔ کبھی حکیم

لے لی " یہ باتیں کرتے کرتے نواب صاحب نے میاں 'رسا' کو
 لیجا کر ایک جگہ بیٹھا دیا۔ ابھی ان سے فارغ نہ ہوئے تھے
 کہ شہزادوں کا ایک گروہ حافظ عبد الرحمن 'احسان' کو
 جہرمت میں لئے آپہنچا۔ بہلا دلی شہر میں کون ہے جو
 "حافظ جیو" کو نہ جانتا ہو، جگت استاد ہیں، پہلے تو قلعے کا
 قلعہ انکا شاگرد تھا مگر استاد ذوق کے قلعے میں قدم رکھتے ہی
 انکا زور ذرا ٹوٹا۔ یہ بھی زمانے کی آنکھیں دیکھ ہوئے تھے اور
 شاہ نصیر سے ٹکر لڑا چکے تھے، اس بڑھاپے میں بھی خم ٹھونک کر
 سامنے آگئے اور مرتے دم تک مقابلے سے نہ ہٹنا تھا نہ ہٹے۔
 کوئی ۹۰ برس کی عمر تھی، کمر دھری ہونے سے قد کمان بن گیا
 تھا۔ اپنے زمانے کے "بلعم باعور" تھے لیکن غزل اس کرا کے سے
 پڑھتے تھے کہ تمام مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ ان کی استاد ہی کا
 سگہ زمانے سے تمام دلی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے میرزا تیلی کے
 استاد ہوئے، رفتہ رفتہ شاہ عالم بادشاہ غازی نور اللہ مرقدہ، تک
 رسائی ہو گئی۔ ان کو "حافظ جیو" کہتے تھے، اس لئے اسی
 نام سے تمام قلعے میں مشہور تھے۔ مصرعے پر مصرعہ لگانے میں
 کمال تھا اور سند ایسے تراخ سے دیتے تھے کہ معترض منہم دیکھتے
 رہ جاتے تھے ایک روز بادشاہ سلامت نے مصرعہ کہا۔

نواب زین العابدین خان صاحب نے بڑھکر لب فرش انکولیا اور پوچھا ”ہیں صاحب عالم! میاں ’حیا‘ آپ کے ساتھ نہیں آئے“ میرزا رحیم الدین ’حیا‘ ان کے بڑے بیٹے ہیں، لیکن تھوڑے دنوں سے باپ بیٹے میں کچھ صفائی نہیں رہی ہے نواب صاحب اتنا کہنے لگے۔ نواب! وہ بھلا میرے ساتھ کیوں آتے۔ جب سے بنارس ہوکر آئے ہیں ان کا رنگ ہی بدل گیا۔ میں بیچارہ تو کس گنتی میں ہوں، وہ کسی کو بھی اب خاطر میں نہیں لاتے۔ پالا پوسا، بڑا کیا، پڑھایا لکھایا، شاعر بنایا، بٹیریں لڑانا سکھایا اور تخت^(۱) کی قسم وہ وہ نسخے بٹیروں کے بتائے ہیں کہ قلعہ تو قلعہ ہندوستان بھر میں کسی کے فرشتہ خان کو بھی معلوم نہ ہونگے اور اب وہی صاحبزادے صاحب ہیں کہ استاد ماننا تو درکنار مجھکو باپ بھی کہتے شرماتے ہیں۔ ہاں بھی کیوں نہ ہو۔ تیرہویں صدی ہے ان کو بنارس بھیجکر میں نو مصیبت میں آگیا۔ ایک ”نقصان مایہ دوسرے شماتہ ہمسایہ“ بیٹا ہاتھ سے گیا تو گیا، دن رات کی دانتا کلکل اور مول

(۱) روز روز کی خانہ جنگیوں نے ہر شہزادے کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ شاید کل میں ہی بادشاہ ہو جاؤں، اس لئے قلعہ کے سب لوگ خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے ہمیشہ تخت کی تاج کی اور اسی طرح کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔

گھر گئے لیکن یہ تھرے اپنی وضع کے پابند ، جب تک سب نہ جا چکے اپنی جگہ سے نہ اُٹے ۔ ہاں گھڑی گھڑی جھک جھک کر آسمان دیکھ لیتے تھے ۔ اتنے میں موسلا دھار مینہ برسنا شروع ہوا ۔ ایسا برسا کہ جل تھل بھر گئے کہیں دو کھنٹے کے بعد خدا خدا کر کے ذرا مینہ تھما تو یہ بھی اُٹے مگر ایسا اندھیرا گھپ تھا کہ ہاتھ نہیں سوجھتا تھا ۔ مالک مکان نے ایک نوکر قندیل دیکر ساتھ کر دیا ۔ گلیوں میں ٹخنوں ٹخنوں پانی تھا ۔ ان بیچارے کے پاؤں میں زردوزی کا قیمتی جوتا تھا کیچڑ میں پاؤں رکھیں تو کیسے رکھیں ۔ آخر چپکے سے نوکر سے کہا تو اپنا جوتا مجھے دیدے ۔ اس کا جوتا کیا تھا ۔ لتھیرے تھے ، وہی گھسیٹتے ہوئے چلے اپنا جوتا بغل میں دبا لیا ۔ قلعہ پہنچ کر ایک نیا جوتا نوکر کو دیا اور کہا ”میاں تو نے آج میرے ساتھ ایسا احسان کیا ہے کہ تمام عمر نہ بھولوں گا ۔ جب کبھی تجھے کوئی ضرورت ہو تو میرے پاس آجایا کیجیو“ اگے چل کر اس بد معاش نے ان کو بہت دق کیا ۔ اول تو اس راز کا دھندورا پیٹ دیا ، دوسرے ہر تیسرے چوتھے ان سے ایک دو روپے مار لاتا ۔ مگر انہوں نے کبھی ”نا“ نہیں کی ۔ جب جاتا کچھ نہ کچھ سلوک ضرور کرتے ۔

دو شمعدان ' اندر کا فوری بتیاں اوپر ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے
کنول - شمعدانوں کے نیچے چاندی کے چھوٹے لگن ' لگنوں میں
عرق کیوڑہ ' غرض کیا کہوں ایک عجیب تماشا تھا - میں تو
الف لیلیٰ کا ابو الحسن ہو گیا - جدھر نظر جاتی ادھر ہی کی
ہو رہتی - میں اس تماشے میں محو تھا کہ لوگوں کی آمد کا
سلسلہ شروع ہوا -

سب سے پہلے میرزا کریم الدین ' رسا ' آئے - یہ سلاطین زادے
ہیں - کوئی ستر برس کے پیٹے میں ہیں - استعداد علمی تو کم ہے
مگر شاعری میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتے - بہت رحم دل -
خوش خلق اور سادہ مزاج ہیں - دغل فصل نام کو نہیں ہے
ملاح کہا کرتے ہیں کہ کشتی میں چڑھے سب سے پہلے اور اترے
سب سے پیچھے - انہوں نے اس مقولہ کو مشاعرے سے متعلق
کر دیا ہے - مشاعرے میں سب سے پہلے آتے ہیں اور جب تک
ایک ایک کر کے سب نہیں چلے جاتے یہ اٹھنے کا نام نہیں لیتے
ایک روز کا واقعہ ہے کہ مشاعرہ ہو رہا تھا - بڑے زور سے
ابر آیا - سب نے جلدی جلدی مشاعرہ ختم کیا - لوگ اپنے اپنے

(۱) بزرگوں کی زبانی دیوان عام کے مشاعروں کا جو حال میں نے
سنا ہے بجنسہ پر اس مشاعرے کا نقشہ قائم کیا -

جہاں کھونٹیاں نہیں تھیں وہاں کیلیں گاڑ کر پھولوں کے ہار لٹکا دیئے تھے۔ اس سرے سے لگا کر اس سرے تک سفید چھت گیری کے بیچوں بیچ موتیا کے ہار لٹکا کر لڑیوں کو چاروں طرف اس طرح کھینچ دیا گیا تھا کہ پھولوں کی چھتری بن گئی تھی۔ ایک صحنچی میں پانی کا انتظام تھا۔ کورے کورے گہڑے رکھے تھے اور شورے میں جست کی صراحیاں لگی ہوئی تھیں، دوسری صحنچی میں پان بن رہے تھے۔ باورچی خانے میں حقوں کا تمام سامان سلیقے سے جما ہوا تھا۔ جا بجا نوکر صاف ستھرے لباس پہنے دست بستہ مؤدب کھڑے تھے۔ تمام مکان مشک، عذیر اور اگر کی خوشبو سے پڑا مہک رہا تھا۔ قالینوں کے سامنے تھوڑے فاصلے پر حقوں کی قطار تھی حقے ایسے صاف ستھرے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ابھی دکان پر سے خرید ہو کر آئے ہیں حقوں کے بیچ میں جو کچھ جگہ چھوٹ گئی تھی وہاں چھوٹی چھوٹی تپالیاں رکھ کر ان پر خاصدان رکھ دیئے تھے۔ خاصدانوں میں لال قندیل کی صافیوں میں لپٹے ہوئے پان۔ گوریوں کو صافی میں اس طرح جمایا تھا کہ بیچ میں ایک ایک تھم پھولوں کی اگٹی تھی۔ خاصدانوں کے برابر چھوٹی چھوٹی کشتیاں ان میں الاچیاں، چکنی دلیاں اور بن دھنیا۔ مسند کے سامنے چاندی کے

جس کی وجہ سے در و دیوار بڑے جگ جگ مگ کر رہے تھے۔
 صحن کو بھروا کر تختوں کے چوکے اس طرح بچھالے تھے کہ چبوترہ
 اور صحن برابر ہو گئے تھے۔ تختوں پر دربی، چاندنی کا فرش،
 اس پر قالینوں کا حاشیہ پیچھے گاؤ تکیوں کی قطار، جھاڑوں،
 فانوسوں، ہانڈیوں، دیوارگیروں، قمقموں، چینی قندیلوں
 اور گلاسوں کی وہ بہتات تھی کہ تمام مکان بقعۂ نور بن گیا تھا
 جو چیز تھی خوبصورت اور جو شے تھی قرینے سے۔ سامنے کی
 صف کے بیچوں بیچ چھوٹا سا سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ،
 گنگا جمنی چوبوں پر سبز ہی ریشمی طنابوں سے استادہ تھا۔
 اس کے نیچے سبز مخمل کی کارچوبی مسند پیچھے سبز کارچوبی
 گاؤ تکیہ، چاروں چوبوں پر چھوٹے چھوٹے اٹھ چاندی کے فانوس
 نصب تھے، فانوس کے کنول بھی سبز۔ چوبوں کے سنہری کلسوں سے
 لگا کر نیچے تک موٹے موٹے موتیا کے گجرے سہرے کی طرح
 لٹکے ہوئے۔ بیچ کی لڑیوں کو سمیت کر کلابتونیا دوریوں سے
 جس کے کونوں پر مقیش کے گہپے تھے اس طرح چوبوں پر کس دیا
 گیا تھا کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے دروازے بن گئے
 تھے۔ دیواروں میں جہاں کھونٹیاں تھیں وہاں کھونٹیاں پر اور

گئے ہیں تو اب تک واپس نہیں آئے۔ گھر سے جو نکلا تو بازار میں
 بڑی چہل پہل دیکھی۔ ہر شخص کی زبان پر مشاعرے کا
 ذکر تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ میاں کریم الدین خان کون ہیں
 کوئی کہتا کہ بھی کوئی ہوں مگر انتظام ایسا کیا ہے کہ دیکھ کر
 جی خوش ہوتا ہے۔ میں یہ باتیں سنتا اور دل میں خوش
 ہوتا ہوا قاضی کے حوض پر آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے
 دونوں جانب ٹٹیاں لگا کر اور ان میں روشنی کے گلاس جما کر
 رات کو دن کر دیا ہے۔ سڑک پر خوب چھڑکاؤ ہے۔ کٹورا بچ رہا ہے۔
 مبارک النساء بیگم کی حویلی کے بڑے پھاٹک کو گلاسوں قمقموں
 اور قندیلوں سے سجاکر گلزار آتشیں کر دیا ہے۔ صدر دروازے سے
 اندر کی دھلیز تک روشنی کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں میں
 چکا چوند آتی ہے۔ مکان کے اندر جو قدم رکھا تو ہوش جاتے رہے
 یا اللہ یہ میرا ہی مکان ہے یا کسی شاہی محل میں آگیا ہوں۔
 گہری گہری آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتا اور کہتا
 واہ میاں عارف! واہ تم نے تو کمال کر دیا۔ کہاں وہ بیچارے
 کریم کا مکان اور کہاں یہ بادشاہی ٹھاٹھ واقعی تمہارا کہنا
 صحیح تھا کہ اگر دو ہزار میں بھی کام نکل جائے تو یہ سمجھو کہ کچھ
 نہیں اُٹھا۔ چونے میں ابرک ملا کر مکان میں قلعی کی گلی تھی

تو میں بھی خدمت میں حاضر رہ کر مدد کروں ، فرمایا ” نہیں بھی “
 نہیں ۔ جہاں دو آدمیوں نے مل کر کسی کام میں ہاتھ ڈالا اور
 وہ خراب ہوا ۔ تم اس انتظام کو بس مجھ پر چھوڑ دو میں جانوں
 اور میرا کام جانے ۔ بلکہ تم تو ادھر آنا بھی نہیں ۔ تم نے آکر
 اگر میں میخ نکالی تو مجھ پر دوہری تھری محنت پڑ جائیگی “ ۔

۳ ترتیب

بشعر و سخن مجلس آراستند

نشستند و گفتند و برخاستند

میں تاریخ ابوالفداء کے ترجمے میں ایسا گتھ کیا کہ
 ۷-۸ روز تک گھر سے باہر ہی نہ نکلا ۔ نواب زین العابدین
 خان کے شوق کی یہ حالت تھی کہ باوجود کمزوری و نقاہت کے
 روز صبح ہی سے جو باہر نکلتے تو کہیں رات کے آٹھ نو بجے جا کر
 انکی صورت گھر میں دکھائی دیتی ۔ اس لئے ان سے ملنا نہیں ہوا
 کہ کچھ حال پوچھتا ۔ بہر حال یہ آٹھ دن انکھ بند کرتے کزر گئے
 اور مشاعرے کی تاریخ اُھی گئی ۔ ۱۴ رجب کو شام کے ساڑھے
 سات بجے کے قریب میں بھی مشاعرے میں جانے کو تیار ہوا ۔
 نواب صاحب کو جو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صبح سے جو

زین العابدین خان عارف کا واقعہ بیان کیا۔ کہنے لگے ”ہاں“
 یوں کہو ”یہ بات ہے۔ ورنہ مجھے تو یہ سنکر حیرت ہوتی تھی
 کہ حکیم صاحب اور مشاعرے میں جالیں۔ اچھا بھی عارف سے
 کہہ دینا کہ میں اور شیفتہ دونوں آئیں گے“ یہاں سے چھٹی
 ہوئی تو میں یہ سمجھا گویا گڈا نہ لیا۔ خوشی خوشی آکر
 نواب زین العابدین خان سے واقعہ بیان کیا۔ وہ بھی مطمئن
 ہو گئے۔ میں نے حکیم مومن خان کا جب حال بیان کیا تو ان کے
 آنسو نکل آئے۔ کہنے لگے ”میاں کریم الدین! تم کو یہ بھی
 معلوم ہے کہ میری حکیم صاحب سے صفائی نہیں ہے“۔ میں نے
 کہا ”نواب صاحب! آپ کیا فرماتے ہیں ان پر تو آپ کی
 بیماری سننے کا ایسا اثر ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ شاید ان کا
 سگا بھائی ہوتا تو اتنا ہی اثر ہوتا۔ مفتی صاحب سے معلوم
 ہوا کہ انہوں نے مشاعروں میں نہ جانے کا عہد کر لیا تھا صرف
 آپ کی وجہ سے انہوں نے یہ عہد توڑا ہے“۔ نواب صاحب نے
 کہا ”بھئی“ تم کو ان لوگوں کی صحبتوں کا حال کیا معلوم؟
 یہ لوگ وہ ہیں کہ اپنے دشمن کو بھی مصیبت میں نہیں دیکھ
 سکتے۔ خیر اس کو جانے دو اب یہ بتاؤ کہ تمہارا مکان خالی
 ہو گیا یا نہیں“ میں نے کہا جی ہاں بالکل خالی ہے۔ حکم ہو

سال کی تھی۔ گداز جسم، سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئی، بھری ہوئی ڈاڑھی، بہت سیدھی سادی وضع کے آدمی ہیں ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں۔ لباس سفید ایک بر کا پاجامہ، سفید کرتا اور سفید ہی صاف تھا۔ جامہ زیبی میں حکیم مومن خان کے بعد دہلی میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ ہی کا نمبر تھا۔ ان کا رنگ گہرا سانولا تھا لیکن ناک نقشہ غضب کا پایا تھا اس پر نیچی سیاہ گول ڈاڑھی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جسم کسی قدر بھاری اور قد متوسط تھا۔ لباس میں بھی زیادہ تکلف نہیں کرتے تھے۔ تنگ مہری کا سفید پاجامہ، سفید کرتہ، نیچی چولی کا سفید انگرکھا اور قبلہ نما پچگوشتہ ٹوپی پہنتے تھے۔ تقریباً ۳۹، ۴۰ سال کی عمر تھی۔

میں آداب کر کے تخت کے ایک کونے پر دوزانو بیٹھ گیا۔ مفتی صاحب نے آنے کا سبب پوچھا۔ میں نے حکیم مومن خان صاحب کا پیغام پہنچا دیا۔ مفتی صاحب نے بڑے تعجب سے پوچھا ”ہیں! خان صاحب نے تو مشاعرے میں نہ کا عہد کر لیا ہے۔ بھی شیفتہ! یہ کیا معاملہ ہے؟ یا تو خود نہیں جاتے تھے یا دوسروں کو بھی ساتھ گھسیت رہے ہیں“ میں نے نواب

گئی ہو۔ خیر یہ تو اچھا ہوا جھگڑے کا جھونڈا ہی نہیں رہا
مگر بھی بات یہ ہے کہ جب تک مقابلہ کی صورت نہ ہو نہ شعر
کہنے میں جی لگتا ہے اور نہ پڑھنے میں لطف آتا ہے ” یہ کہہ کر
وہ کپڑے دیکھنے میں مشغول ہو گئے اور میں سلام کر کے رخصت ہوا۔
چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی
صدر الدین صاحب کا مکان تھا اُس کے نزدیک مڈیا محل میں نواب
مصطفیٰ خان صاحب شیفتہ رہتے ہیں۔ مفتی صاحب کے ہاں جا کر
معلوم ہوا کہ شیفتہ بھی مفتی صاحب ہی کے پاس بیٹھے ہیں
میں نے کہا چلو، اس سے بہتر موقع ملنا مشکل ہے، دونوں سے
ایک ہی جگہ ملنا ہو گیا۔ یہ سوچ کر اندر گیا۔ مکان کوٹھی کے
نحوئے کا ہے، انگریزی اور ہندوستانی دونوں وضع کو ملا کر
بنایا گیا ہے۔ صحن بہت بڑا نہیں ہے۔ اس میں مختصر سی
نہر ہے سامنے دالان در دالان اور پہلو میں انگریزی وضع کے
کمرے ہیں باہر کے دالان میں کواڑ لگا کر اس کو بھی کمرے کی
شکل کا کر دیا ہے۔ دالانوں کے سامنے اونچا چبوترہ ہے۔ چبوترے کے
اوپر تخت بچھے ہوئے تھے، اس پر چاندنی کافرش اور دو طرف
کاؤتکے لگے ہوئے تھے۔ تختوں پر مفتی صاحب اور نواب صاحب
بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مفتی صاحب کی عمر کوئی ۵۶، ۵۷

خاں صاحب بڑے غور سے میری بات سنتے رہے۔ میں خاموش ہوا
 تو مولوی امام بخش صاحب کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے
 ”افسوس ہے“ کیا خوش فکر اور ذہین شخص ہے۔ یہ عمر اور
 یہ مایوسی، سچ ہے ہمیشہ رہے نام اللہ کا“ میری طرف دیکھ کر
 کہا ”اچھا بھی تم جاؤ“ میری طرف سے عارف سے کہدینا کہ میاں
 میں ضرور آؤں گا“ جب میں نے دیکھا کہ یہ جادو چل گیا تو
 اور پاؤں پھیلائے اور کہا ”نواب صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ
 مولوی صہبائی صاحب، مفتی صدرالدین صاحب اور نواب
 مصطفیٰ خاں صاحب شیفٹہ کو بھی اپنے ہمراہ لائینگا تو عنایت
 ہوگی“ حکیم صاحب کہنے لگے۔ میاں صہبائی سے تو میں
 ابھی کہے دیتا ہوں، اب رہے آزدہ اور شیفٹہ تو واپس
 جاتے جاتے ان سے بھی کہتے جاؤ۔ یہ کہدینا کہ میں نے تم کو
 بھیجا ہے، ہاں تاریخ کیا مقرر کی ہے، مشاعرہ کہاں ہوگا اور
 ’طرح‘ کیا ہے۔“ میں نے تاریخ بتا کر مکان کا پتہ دیا۔
 ’طرح‘ کے متعلق حضرت جہاں پناہ کے حضور میں جو گفتگو
 ہوئی تھی وہ بیان کی۔ کہنے لگے ”ہمارے بادشاہ سلامت بھی
 عجیب چیز ہیں۔ جو سوچھتی ہے۔ نئی سوچھتی ہے۔ شاید
 ایسا مشاعرہ کہیں بھی نہ ہوا ہوگا جس میں ’طرح‘ نہ دی

انکو عشق تھا کوئی کپڑا پسند آتا تو پھر قیمت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ جو مانگتا دیتے۔ اس سوداگر نے اگر ایک گٹھری مزدور کے سر پر سے اتاری۔ اس میں سے پت سے ایک چھپکلی لیچے گری اور دوڑ کر سامنے کی دیوار پر جو جمی بیٹھی تھی وہ لپک کر اس سے اُملی اور دونوں مل کر ایک طرف چلی گئیں۔ ہم لوگ بیٹھے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ جب دونوں چھپکلیاں چلی گئیں تو حکیم صاحب نے کہا ”کہو میاں رقم تم نے دیکھا“ انہوں نے کہا ”جی ہاں ایک خانے کے حساب لگانے میں مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے جو اپنی رائے پر اصرار کیا تھا اسکی معافی چاہتا ہوں“ کہنے لگے ”بھئی انسان ہی سے تو غلطی ہوتی ہے۔ ہاں تو بھئی صہبائی مشاعرے کے متعلق ہمارا تو صاف جواب ہے۔“ میں نے جب دیکھا کہ خان صاحب ہاتھوں سے نکلے ہی جا رہے ہیں تو مجھے نواب زین العابدین خان عارف کا خیال آیا۔ کہا ”وہ بہت بیمار ہو گئے ہیں اور ان کو اب زندگی کی امید نہیں رہی۔ انکی آخری خواہش ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لوں جس میں دہلی کے تمام کاملین فن جمع ہوں۔ وہ خود حاضر ہوتے مگر حکیم احسن اللہ خان صاحب نے ان کو کہیں آنے جانے سے منع کر دیا ہے“ یہ آخری فقرہ میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا۔

نہیں آتے ، اپنے نا اہل پٹھوں کو مقابلے میں لاتے ہیں اس روز
جو اس جانور نے یہ شعر پڑھ کر کہا کہ یہ غالب کے رنگ میں
مرکز معور گردوں بہ لب آب نہیں
ناخن قوس قزح ، شبہ مضراب نہیں

لکھا ہے تو میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھ کو کس قدر ناگوار گزرا ۔
غالب کے رنگ میں شعر کہنا تو کجا وہ یا ان کے استاد پہلے
میرزا نوشہ کے شعروں کو سمجھ تو لیں ۔ اب رہے میر صاحب^(۱) تو
ان کی بات دوسری ہے وہ بھی واہیات بکتے ہیں مگر کسی پر
حملہ نہیں کرتے ، بلکہ ان کی وجہ سے مشاعرے میں چہل پہل
ہو جاتی ہے ۔ بھی میں نے تو اسی وجہ سے مشاعروں میں
جانا ہی ترک کر دیا ہے ۔ میں نے عرض کی کہ ”اس مشاعرے میں
استاد ذوق اور میرزا نوشہ نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے ۔ حضرت
ظل سبحانی کی غزل بھی اٹیگی“ فرمایا ”ہر شخص مختار ہے ۔
خود آئے یا غزل بھیجے“ میں تو نہ آؤنگا نہ غزل بھیجوں گا“
یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک بنارس کا سوداگر کپڑوں کے
دو گتے لیکر آیا ۔ شہر میں جب کوئی کپڑوں کا سوداگر آتا
حکیم صاحب کے پاس اس کا آنا لازمی تھا ۔ ریشمی کپڑوں سے

شکیل آدمی تھے۔ استاد کا ایسا ادب کرتے تھے جیسے کوئی بیٹا باپ کا کرتا ہے۔ حکیم صاحب کی باتیں سن کر ”بہت خوب“ مناسب ”کہتے رہے۔ ان سے گفتگو کر کے حکیم صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے ”ارے بھئی صہبائی! تم تو کئی دن سے نہیں آئے۔ کہو خیریت تو ہے اور آپ کے ساتھ یہ کون صاحب ہیں“ مولوی صہبائی نے کہا ”یہ پیلے کالج میں شاگرد تھے“ اب مطبع کھول لیا ہے“ وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں“ آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں“ حکیم صاحب نے ہنس کر کہا ”بس صاحب مجھے تو معاف ہی کیجئے اب دہلی کے مشاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے ایک صاحب ہیں وہ اپنی امت کو لیکر چڑھ آتے ہیں“ شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں“ مفت میں واہ واہ! سبحان اللہ سبحان اللہ! غل مچا کر طبیعت کو منغص کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ۔

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را

تحسین نا شناس و سکوت سخن شناس

دوسرے صاحب ہیں وہ ہدھد کو ساتھ لئے پھرتے ہیں اور

خواہ مخواہ استادوں پر حملہ کرتے ہیں۔ خود تو میدان میں

دو ہوں آخر یہ روز روز کی فرمائشیں کوئی کہاں تک پوری کرے " صاحب عالم نے کہا " اُستاد کیا کروں رزیدنت کے پاس ولایت سے حل کے لئے شطرنج کے نقشے آیا کرتے ہیں ، کچھ تو میں خود حل کر کے ان کے پاس بھیج دیتا ہوں ، جو سمجھ میں نہیں آتے وہ آپ کے پاس لے آتا ہوں " - حکیم صاحب نے نظر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا - ہمارا سلام لے کر کہا - " بیٹھئے " بیٹھئے " ہم بیٹھ گئے اور وہ پھر صاحب عالم کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے " میاں حیا ! جو نقشہ تم لالے ہو وہ تو میرے خیال میں کچھ پیچیدہ نہیں ہے - تم کہتے ہو سرخ مہروں کو مات ہوگی ، میں کہتا ہوں نہیں سبز کو ہوگی - تم بساٹ بچھاؤ ، میں ابھی سمجھالے دیتا ہوں - اچھا پلے ذرا مولوی صہبائی سے بات کرلوں اور میاں سکھانند ! تم بیٹھے انتظار کرتے رہو - میں حکم لگا چکا ہوں کہ جب تک پورب کے طرف سے اس چھپکلی کا جوڑا نہ آجائے یہ سامنے کی دیوار سے نہ جائے گی - اس کا جوڑا آئے پھر آئے " - سکھانند حکیم تم ، رقم ، تخلص کرتے تم ، دھرم پورے میں رہتے تم ، کوئی ۴۰ سال کی عمر تھی - ریختے میں شاہ نصیر کے اور رمل میں خان صاحب کے شاگرد تم - بڑے خوش پوشاک ، خوش اخلاق ، ظریف الطبع ، حلیم ، خوبصورت اور

موڑ کر زلفیں بٹا لیا تھا۔ بدن پر شربتی ململ کا نیچھی
 چولی کا انگرکھا تھا لیکن اس کے نیچے کوتہ نہ تھا اور جسم کا
 کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں
 سیاہ رنگ کا فیتہ، اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ۔ کاکریزی
 رنگ کے دوپٹے کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور
 اس کے دونوں کونے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا
 خارپشت، پاؤں میں سرخ گببونی کا پاجامہ مہریوں پر سے
 تلک اوپر جاکر کسی قدر ڈھیلا۔ کبھی کبھی ایک بر کا
 پاجامہ بھی پہنتے تھے۔ مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور
 قیمتی ہوتا تھا، چوڑا سرخ نیفہ۔ انگرکھے کی آستینیں آگے سے
 کٹی ہوئیں، کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی پلت کر چڑھا
 لیتے تھے۔ سر پر گلشن کی بڑی دوپٹری ٹوپی، اس کے کنارے پر
 باریک لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح
 منڈھ کر اگٹی تھی۔ اندر سے مانگ اور ماتے کا کچھ حصہ اور
 بال صاف جھلکتے تھے۔ غرض یہ کہ نہایت خوش پوشاک اور
 جامہ زیب آدمی تھے۔ جب ہم دونوں پہنچے تو صاحب عالم
 میرزا رحیم الدین 'حیا' سے کہہ رہے تھے کہ "صاحب عالم! تمہارے
 شطرنج کے نقشوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ایک ہوں،

بڑا دروازہ ہے ' اندر بہت وسیع صحن اور اُس کے چاروں طرف عمارت ہے ۔ دو طرف دو صحنچیاں ہیں اور سامنے بڑے بڑے دالان در دالان ۔ پہلے دالان کے اوپر کمرہ ہے ۔ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرہ کا صحن کر دیا ہے ۔ لیکن منڈیر بہت چھوٹی رکھی ہے ۔ دالانوں میں چاندنی کا فرش ہے ۔ اندر کے دالان میں بیچوں بیچ قالین بچھا ہوا ' قالین پر گاؤتکٹے سے لگے حکیم صاحب بیٹھے ہیں ۔ سامنے حکیم سکھانند المتخلص بہ ' "رقم" اور میرزا رحیم الدین ' حیا ' مؤدب دوزانو بیٹھے ہیں ۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار ہو رہا ہے کہ کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور بلا ضرورت بولنے کا یارا نہیں ۔ حکیم مومن خان کی عمر تقریباً ۴۰ سال کی تھی ۔ کشیدہ قامت ' سرخ و سفید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی بڑی بڑی روشن آنکھیں ' لمبی لمبی پلکیں ' کہنچی ہوئی بہوئیں ' لمبی ستواں ناک ' پتلے پتلے ہونٹ اُن پر پان کا لاکھا جما ہوا ' مسی الودہ دانت ' ہلکی ہلکی موچھیں ' خشخاشی ڈاڑھی ' بہرے بہرے دانت ' پتلی کمر ' چوڑا سینہ اور لمبی انگلیاں ۔ سر پر گھونگرو والے لمبے لمبے بال کالوں کی شکل میں کچھم تو پشت پر اور کچھم کندھوں پر پڑے ہوئے ۔ کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو

پایا۔ کپڑے اتارے اندر سے کھانا آیا۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر سو رہا۔ چار بجے کے قریب اُٹھ کر حکیم مومن خان کے ہاں جانیکی تیاری کی۔ حکیم صاحب کا مکان چیلوں کے کوچہ میں ہے۔ راستے میں مولوی امام بخش صاحب صہبائی مل گئے۔ یہ کالج میں میرے استاد رہے ہیں۔ کھلا ہوا گندم گوں رنگ ہے، منہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ ہیں۔ سر پر پتے ہیں، بڑے دبلے پتلے آدمی ہیں کوئی ۴۰ سال کی عمر ہوگی۔ ایک بر کا سفید پاجامہ، سفید انگرکھا، کشمیری کام کا جبہ پہنتے اور سر پر چھوٹا سفید صافہ باندھتے ہیں۔ یہ بھی چیلوں کے کوچے ہی میں رہتے ہیں۔ مجھ سے پوچھنے لگے ”کہاں جاتے ہو“ میں نے کہا ”حکیم مومن خان کے پاس“ پوچھا کیا کام ہے میں نے حال بیان کیا کہنے لگے ”چلو میں بھی وہیں جا رہا ہوں“ حکیم آغا خان کے چہنئے کے سامنے خان صاحب کا مکان تھا۔

(۱) میں نے خود یہ مکان ۲۲۰۲۰ برس ہوئے دیکھا تھا۔ ٹوٹ کر کھنڈر ہو گیا تھا۔ تین طرف کی عمارت تھی گئی تھی۔ سامنے کا حصہ قائم تھا۔ معلوم نہیں کہ اوپر کی منڈیروں کیوں اتنی نیچی رکھی گئی تھی اسی منڈیروں سے ٹھوکر کھا کر حکیم مومن خان نیچے گرے۔ ہاتھ اور بازو ٹوٹ گیا اور اسی وجہ سے ان کا انتقال ہوا۔ خود ہی مرنے کی تاریخ کہی تھی کہ ”دست و بازو بشکست“۔

پوچھا ” مگر بھی اب تک علائی نہیں آئے مجھکو انکا کل سے انتظار ہے ۔ اے لو ! وہ آھی گئے ۔ بھی بڑی عمر ہے ‘ میں تم کو پوچھ رہا تھا ۔

نواب علاء الدین خاں علائی ‘ نواب لوہارو کے ولی عہد ہیں ۔ کوئی ۲۳ ‘ ۲۴ سال کی عمر ہے ۔ متوسط قد ‘ گندمی رنگ ‘ موتا موتا نقشہ ‘ گول چہرہ ‘ شربتی آنکھیں اور گھنی چڑھی ہوئی ڈاڑھی ہے ۔ لباس میں غلطے کا تنگ مہری کا پاجامہ سفید جامدانی کا انگرکھا ‘ اس پر سینہ کھلی ہوئی سیاہ مخمل کی نیمہ آستین اور سر پر سیاہ مخمل کی چوکوشیہ ٹوپی تھی ‘ وہ بھی آداب کر کے ایک طرف بیٹھ گئے اور کہا واقعی آج دیر ہوگئی ‘ مجھے خود خیال تھا کہ آپ انتظار کر رہے ہونگے ‘ میری طرف دیکھ کر کہا ۔ آپ کی تعریف ۔ میرزا نوشہ نے تمام قصہ بیان کیا اور کہا علائی تم کو بھی چلنا ہوگا ‘ ابھی تو شاید تم لوہارو نہیں جارہے ہو ‘ انہوں نے کہا ” بہت خوب آپ تشریف لیجائیں گے تو میں بھی حاضر ہوں “ جب یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تو میں نے اجازت چاہی ۔ وہاں سے رخصت ہو کر زین العابدین خاں کے مکان میں آیا ۔ انہوں نے مردانے کا ایک حصہ میرے لئے خالی کر دیا تھا ۔ جو اسباب صبح میں نے بھیجا تھا اس کو جما جما یا

چھوٹا قد ، بہت کورا رنگ ، نازک نازک نقشہ ، غلافی آنکھیں ،
 چمکی دار آہی ، چہریرا بدن ، غرض نہایت خوبصورت آدمی ہیں ۔
 ایک بر کا سفید پاجامہ اور سفید ہی انگرکھا زیب بدن تھا ۔
 قالب چڑھی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی سر پر تھی ۔ ایک بڑا رومال
 سموسہ بنا کندھے پر ڈالے ہوئے تھے ۔ میں نے اُٹھکر سلام کیا ۔
 انہوں نے بڑھکر مصافحہ کیا اور خاموش ایک طرف دوزانو نہایت
 ادب سے بیٹھ گئے ۔ تھوڑی دیر میں میرزا غالب لکھنے سے فارغ
 ہوئے ، پہلے نواب صاحب کی طرف مڑے اور کہنے لگے ، ”میاں نیرا
 تم کس وقت آ بیٹھے ۔“ بھی اس میرزا تفتہ نے میرا ناک میں دم
 کر دیا ہے ۔ ظالم کی طبیعت کی روانی کسی طرح کم نہیں ہوتی ۔
 ہر خط میں اُٹھ ، دس غزلیں اصلاح کے لئے بھیج دیتے ہیں اصلاح
 دیتے دیتے تھک جاتا ہوں ، میری طرف دیکھ کر کہا ”آپ شاید
 مولوی کریم الدین صاحب ہیں ۔“ میں نے کہا ”جی ہاں“
 فرمانے لگے حضرت آپ کے تشریف لانے کی مجھے پہلے ہی سے اطلاع
 مل گئی تھی ۔ کل ہی میاں عارف آکر مجھ سے مشاعرے میں
 چلنے کا وعدہ لے گئے ہیں ۔ کہو میاں نیرا تم بھی چلو گے ۔“ نواب
 صاحب نے کہا ”جہاں آپ وہاں میں ۔ آپ تشریف لیجالیں گے
 تو انشاء اللہ میں بھی ضرور ہمراہ ہوں گا“ میرزا صاحب نے

میرزا نوشہ کی عمر کوئی ۵۰ سال کی ہوگی۔ حسین اور خوش رو آدمی ہیں، قد اونچا اور ہار بہت چوڑا چکلا، موتا موتا نقشہ اور سرخ و سفید رنگ ہے۔ لیکن اُس میں کچھ زردی جھلکتی ہے۔ ایسے رنگ کو معاوڑے میں چمپٹی کہا جاتا ہے اکے کے دودانت توت کئے ہیں، دازھی بھری ہوئی ہے، مگر کھنی نہیں ہے۔ سر منڈا ہوا اُس پر سیاہ پوستین کی ٹوپی ہے جو کلاہ پاپاخ سے ملتی جلتی ہے۔ ایک بر کا سفید پاجامہ سفید ممل کا انگرکھا، اس پر ہلکے زرد زمین کی جامہ وار کا چغہ^(۱) میری آہٹ پا کر لکھتے لکھتے آنکھ اونچی کی۔ میں نے آداب کیا۔ سلام کا جواب دیا اور آنکھوں سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں آگئے۔ یہ امین الدین خاں صاحب نواب لوہارو کے بھائی ہیں۔ ریختے میں ”رخشاں“ اور فارسی میں ”نیر“ تخلص کرتے ہیں۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر ہے۔ انشا پر دازی، جغرافیہ، تاریخ، علم انساب، اسماء رجال تحقیق لغات اور واقفیت عامہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ میرزا نوشہ کے خلیفہ ہیں۔

(۱) قلعہ دہلی کے عجائب خانے میں میرزا غالب کی ایک تصویر ہے اس سے یہ لباس لیا گیا ہے۔

غزل پڑھے ۔ استاد تو ” بہت خوب بہت خوب “ ۔ کہتے رہے مگر حافظ ویران کی تیوری کے بل نہیں کئے ، برابر بڑبڑاتے ہی رہے ” اللہ خیر کرے “ دیکھئے اس مشاعرے کا کیا حشر ہوتا ہے ۔
حضرت پیر و مرشد بھی بیٹھے بیٹھے اشقائے چھوڑا کرتے ہیں ”
وہ اپنی کہے گئے میں تو آٹھ سلام کر چلا آیا ۔

دوسرا حملہ اسد اللہ خاں ، غالب پر تھا ۔ چاندنی چوک سے ہوتا ہوا بلی عماروں میں آیا ۔ حکیم محمود خاں صاحب کے مکان کے سامنے سے قاسم جان کی گلی کٹی ہے بالیس طرف پہلا ہی مکان ان کا تھا ۔ یہ مکان مسجد کے پیچھے ہے اس کے دو دروازے ہیں ایک مردانہ دوسرا زنانہ ۔ مجلسرا کا ایک راستہ مردانے مکان میں سے بھی ہے ۔ باہر کے دروازے کی دھلیز ذرا دھنسی ہوئی سی ہے ۔ دروازے کے اوپر ایک کمرہ ہے اور کمرے کے دونوں پہلوؤں میں دو کوٹھریاں ۔ گرمی میں میرزا صاحب دوپہر کے وقت اسی ایک کوٹھری میں رہا کرتے تھے ۔ دروازے سے گزر کر مختصر سا صحن ہے اور سامنے ہی دالان در دالان ۔ جب میں پہنچا تو اندر کے دالان میں گاؤ تکئے سے لگے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے ۔

(۱) معلوم نہیں کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے ۔ مگر دہلی میں عام طور پر

” شگوفے “ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ۔

جس کا جو جی چاہے سو کہے میں نے تو ان سب کا جواب
ایک رباعی میں دیدیا ہے ۔

تو بہلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوق
ہے برا وہ ہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
اور جو خود تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے
کیوں برا کہنے سے اس کے تو برا مانتا ہے

میں نے عرض کی کہ ”میں کل بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوا
تھا ، حضرت ظلّ اللہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اس مشاعرے میں
ہم میرزا فتح الملک بہادر کو اپنی طرف سے بھیجیں گے اور اپنی
غزل بھی بھیج کر مشاعرے کی عزّت بڑھائیں گے اور یہ بھی ارشاد
ہوا تھا کہ استاد ذوق سے بھی کہہ دیں گے وہ بھی مشاعرے میں
آئیں گے۔“ یہ سن کر حافظ ویران تو تھنڈھے پڑ گئے ۔ استاد نے
فرمایا ”ہاں بھی مجھے یاد آگیا ۔ کل شام کو حضرت پیرو مرشد
نے مجھ سے بھی فرمایا تھا اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ تم بھی
ضرور جائیو ۔ میاں میں انشاء اللہ تعالیٰ ضرور آؤں گا ۔ مگر
یہ تو بتاؤ ” طرح کیا رکھی ہے “ میں نے واقعہ عرض کیا اور
کہا کہ ” حضرت ظلّ سبحانی نے ’ طرح ‘ کا جگہڑا ہی نکال دیا ۔
جو شخص جس بھر اور جس ردیف ، قافیہ میں چاہے آکر

از کرم نہ ہوگا۔“ میرا اتنا کہنا تھا کہ حافظ ویران تو چراغ پا ہو گئے کہنے لگے جالیے جالیے۔ کہاں کا مشاعرہ نکالا ہے۔ استاد کو فرصت نہیں ہے ان میرزا لے پالک^(۱) کے پاس کیوں نہیں جاتے جو خواہ مخواہ ان کو آکر دق کرتے ہو۔“ استاد نے کہا۔ ”بھی حافظ ویران! تمہاری زبان نہیں رکھتی۔ بیٹھے بٹھائے تم دنیا بھر سے لڑائی مول لیتے ہو۔“ حافظ ویران کہنے لگے ”استاد جب وہ آپ کو برا بھلا کہیں تو ہم کیوں چپ بیٹھنے لگے۔ وہ ایک کہینگے تو ہم سو (۱۰۰) سنائیڈنگے اور تو اور میاں آشفتمہ کو دن لگے ہیں، کل ہی کی بات ہے آپ کو ناوڑا^(۲) کہہ رہے تھے، مگر میں نے بھی ایسی خبر لی کہ تمام عمر یاد کریں گے ان کی سات پشت کو تو م ڈالا۔“ استاد ہنس کر فرمانے لگے ”نا بھی نا، تم میری وجہ سے کیوں بلا میں پڑتے ہو۔ مجھے

(۱) ان دنوں دہلی میں لوگوں نے یہ اڑا رکھا تھا کہ میرزا نوشہ (غالب) میرزا عبد اللہ بیگ کے بیٹے نہیں ہیں بلکہ انہوں نے ان کو پال لیا ہے اور یہ دراصل کسی کشمیری کی اولاد ہیں حافظ ویران نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ خدا محفوظ رکھے دہلی والوں سے جو باہر سے آیا اس کے حسب نسب میں انہوں نے کترے ڈالے۔

(۲) استاد ذوق کو شہر بھر نائی کہتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آزاد مرحوم نے ان کے ہاتھ میں اسٹرے کے بجائے تلوار دے کر ان کو سپاہی زادہ بنا دیا ہے۔

جاتا ہے۔ جب میں پہنچا تو استاد صحن میں بان کی کھری چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ دوسری چارپائی پر ان کے چہیتے شاگرد حافظ غلام رسول ویران بیٹھے تھے۔ یہ اندھے ہیں اور ان ہی سے ہوشیار رہنے کے لئے حضرت جہاں پناہ نے ارشاد فرمایا تھا۔ استاد ذوق قد و قامت میں متوسط اندام ہیں، رنگ اچھا سانولا ہے چہرے پر چیچک کے بہت داغ ہیں، آنکھیں بڑی بڑی اور روشن اور نگاہیں تیز ہیں چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا ہے۔ اس وقت سفید تذکی پاجامہ، سفید کرتہ اور سفید ہی انگرکھا پہنے ہوئے تھے۔ سر پر گول چندوے کی ململ کی ٹوپی تھی۔ میرے پاؤں کی آہٹ سنتے ہی حافظ ویران نے چونک کر کہا ”کون ہے“ میں نے کہا کریم الدین، استاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں“ استاد نے اپنا نام سن کر کہا ”اُئیے اُئیے اندر تشریف لائیے“ میں نے آداب عرض کیا۔ انہوں نے فرمایا۔ ”بیٹھو، بیٹھو“ میں حافظ ویران کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کہا ”فرمائیے کیسے تشریف لانا ہوا“۔ میں نے عرض کی کہ ”میرا ارادہ قاضی کے حوض پر ایک مشاعرہ شروع کرنے کا ہے۔ ۱۴ رجب تاریخ مقرر ہوئی ہے اگر حضور بھی ازراہ بندہ نوازی قدم رنجہ فرمائیں تو بعید

خدا یہ مشکل بھی آسان کر دیگا۔ جب میں نے اس کام میں ہاتھ ڈالا ہے تو میں جانوں اور میرا کام جانے۔ تم بیٹے تماشا دیکھو۔ مگر ہاں مکان کل تک خالی کر دینا۔ نوہی دن تورہ گئے ہیں۔ رات کم اور سوانگ بہت ہے۔ اب جاؤ خدا حافظ۔ تم تھک بھی گئے ہو، ذرا آرام لیلو اور کل صبح ہی سے ادھر مکان خالی کرنے کی فکر کرو، ادھر ان تینوں استادوں کے مکان کا چکر لگاؤ۔ مکان خالی ہو جائے تو فوراً مجھے اطلاع دینا اور خود میرے ہاں چلے آنا۔ اس میں شرم کی کونسی بات ہے، آخر میری ہی وجہ سے تو تم اپنا مکان چھوڑ رہے ہو۔ ” وہاں سے نکل کر میں اپنے گھر آیا مطبع کو بند کرتے اور سامان کو سمٹتے شام ہو گئی۔ صبح اٹھ کر پہننے اور رھنے کا سامان تو نواب زین العابدین خان کے مکان پر روانہ کیا اور خود کابلی دروازے کی طرف چلا کہ پہلے استاد ذوق ہی سے بسم اللہ کروں۔

کابلی دروازے کے پاس ہی ان کا مکان ہے، مکان بہت چھوٹا ہے، چھوٹی سی دیوڑھی ہے اس میں ایک طرف جائے ضرور ہے۔ اندر صحن اتنا چھوٹا ہے کہ دو پلنگ بچھنے کے بعد راستہ چلنے کے لئے مشکل سے جگہ رہتی ہے۔ سامنے چھوٹا سا دالان ہے اور اس کے اوپر ایک کمرہ۔ صحن میں سے زفانہ مکان میں راستہ

لُغْزِش ہوئی تو یاد رکھو کہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا۔ جب دیکھو کہ ان میں سے کوئی ہاتھوں سے نکلا ہی جاتا ہے تو میرا نام لے دینا۔ امید ہے کہ میرا نام سنکر شاید راضی ہو جائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ مبارک النساء بیگم کی حویلی جس میں تمہارا مطبع ہے دو روز میں خالی کر کے بالکل میرے حوالے کر دو، مجھے وہاں نشست کا انتظام کرنا ہوگا، میں نے کہا ”اور میں کہاں جاؤں“ فرمانے لگے ”میرے مکان میں آٹھ نو روز کے لئے آجاؤ تم کو تکلیف تو ہوگی مگر کیا کیا جائے۔ جب قلعہ کے لوگوں کو بلا رہے ہیں تو ان ہی کے رتبے کے موافق مکان کو بھی درست کرنا ہوگا۔ دیکھئے خرچ کیا پڑتا ہے“ میں نے کہا ”مشاعرے میں خرچ ہی ایسا کونسا ہوتا ہے“ زیادہ سے زیادہ سو سو روپے آٹھ جائیں گے“ یہ سن کر نواب صاحب مسکرائے اور کہا ”کریم الدین تم کیا جانو کہ ایسے مشاعروں میں کیا خرچ ہو جاتا ہے ہزار دو ہزار میں بھی اگر پوتہ پورا گیا تو سمجھو کہ سستے چھوٹے“ یہ سن کر تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں نے کہا ”نواب صاحب اگر یہ صورت ہے تو میرا ایسے مشاعرے کو دور ہی سے سلام ہے۔ مطبع تو مطبع اگر اپنے آپ کو بھی بیچ ڈالوں تو اتنی رقم نہ آئے۔“ فرمانے لگے ”بھی تم اس خرچ کے جھگڑے میں نہ پڑو“

فضلِ خدا ہوتا ہے ” یہاں میں ضرور کہوں گا کہ میرے لئے حضوری اتنا مشکل کام نہ تھی جتنا یہ آلتے پاؤں واپس ہونا۔ زمین پاؤں کو نہیں لگتی تھی، اس لئے دو چار قدم ہی چلا ہونگا کہ دیوار سے ٹکر کھائی۔ اس ٹکر سے نہیں سنبھلا تھا کہ نہر میں پاؤں جا پڑا۔ یہ ہزار دقت باہر نکل ہی آیا۔ ادھر میں نکلا ادھر چوبدار ساتھ ہوا اس کو انعام دے دلا کر ٹالا۔ حکیم صاحب کے پاس آیا۔ وہ میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ان سے تمام واقعہ بیان کیا۔ فرمانے لگے مولوی صاحب بات یہ ہے کہ میرزا فخر بہت دنوں سے مشاعرے کے لئے بے چین ہو رہے تھے۔ ان ہی کی یہ کارگزاری ہے ورنہ بھلا یہ معاملہ اس طرح تھوڑی طے ہوتا۔ مگر چلو تمہارا کام بن گیا۔ میاں عارف سے جا کر کہ دو۔ وہ میرے ہی وہاں بیٹھے انتظار کر رہے ہونگے۔

حکیم صاحب کے مکان پر پہنچا تو دیکھا کہ واقعی نواب صاحب میرے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان سے حالات بیان کئے کہنے لگے کہ، چلو یہ مشکل تو آسان ہوئی، اب تم یہ کرو کل کم سے کم استاد ذوق، میرزا نوشہ، اور مومن خان کے مکان کا کشت لگاؤ! مگر دیکھنا ذرا پھونک پھونک کر قدم رکھنا، یہ تینوں بڑے دماغ دار آدمی ہیں، اگر ذرا بھی تم سے بات چیت میں

مشاعرے سے پہلے ان لوگوں سے مل لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت پر انکار کر بیٹھیں۔ میں اور میرزا شبو تو آ نہیں سکتے ہیں ہاں میرزا فخر کو اپنی جگہ بھیج دوںگا اور انشاء اللہ اپنی غزل بھی بھیجوںگا۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم نے طرح کیا رکھی ہے ' طرح ' ہی تو بڑے جھگڑے کی چیز ہے۔ یہ ذرا سوچ سمجھ کر دینا ' یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بازو سے آواز آئی "اے ہے ' یہ انا بچہ کیا بے طرح سلا گئی ہے۔" یہ سنتے ہی بادشاہ سلامت نے یہ فرمایا 'لو بھائی یہ خود بخود فال گوش مل گئی۔' تم اس مشاعرے میں کوئی " طرح " ہی نہ دو۔ جس شخص کا جس بحر جس ردیف قافیہ میں غزل پڑھنے کو دل چاہے پڑھے " نہ لینا ایک نہ دینا دو " میں نے عرض کی تاریخ۔ فرمایا " ۱۴ رجب مقرر کر دو " دن بھی اچھا ہے ' چاندنی رات بھی ہوگی ' آج پانچ تاریخ ہے نو دن باقی ہیں ' اتنے دنوں میں بہت کچھ انتظام ہو سکتا ہے ' ۲۰ جولائی پڑے گی۔ موسم بھی ٹھنڈا ہو جائیگا۔ اچھا اب خدا حافظ ' عمر دولت و اقبال کو دعا دی اور خوش خوش آلتے قدموں واپس ہوا۔ میرزا فخر بیچ میں کچھ نہیں بولے مگر میں سمجھتا تھا کہ یہ سب کیا دھرا انہیں کا ہے ' ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ خلوت شاہی۔ سچ ہے " بگڑی بن جاتی ہے جب

دیوان عام میں مشاعرہ ہوتا تھا ، وہ کچھ دنوں ٹھیک چلا ، پھر میں نے دیکھا کہ بے لطفی بڑھ رہی ہے ۔ اس لئے بند کر دیا ۔ منشی فیض پارسا نے اجمیری دوازے کے باہر غازی الدین خاں کے مدرسہ میں مشاعرہ شروع کیا ، وہ تیلیوں کی طرح بکھر گیا ۔ وہ تو کہو غنیمت ہوا کہ ردیف میں ”تیلیاں“ ہی تھیں ، کہیں خدا نخواستہ اگر ردیف ”کڑیاں“ ہوتی تو خدا جانے کتنوں کے سر پھوٹ جاتے ۔ تم مشاعرہ تو کر رہے ہو مگر ان ہاتھیونکی ٹکر کیسے سنبھالو گے استاد ذوق تو بچارے بے زبان آدمی ہیں ، مگر خدا بچائے حافظ ویراں سے وہ ضرور لڑ مرینگے اور تم جانتے ہو اندھے کی داد نہ فریاد اندھا مار بیٹھیگا ، کسی نے اگر مشاعرے میں استاد پر ذرا چوٹ کر دی تو ان نابینا صاحب کا سنبھالنا مشکل ہو جائیگا ۔ میاں تم سے یہ کام سنبھلتا نظر نہیں آتا ، میں نے عرض کی کہ قبلۂ عالم میری کیا ہمت ہے جو میں اتنے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکوں ، مشاعرے کا سارا انتظام نواب زین العابدین خاں عارف نے اپنے ذمہ لیا ہے ۔ فرمایا : ’ تو مجھے اطمینان ہے ۔ یہ لڑکا بڑا ذہین ہے ، میرزا نوشہ اور مومن خاں کو وہ سنبھال لیگا ، رہے استاد ذوق ان سے میں کہہ دوں گا ۔ خدا نے چاہا تو اس طرح مشاعرہ چل جائیگا ۔ مگر میں یہ کہے دیتا ہوں کہ

دونوں نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی اور بادشاہ سلامت نے فرمایا۔ ”اماں! تمہارا ہی نام کریم الدین ہے، تم کہیں باہر کے معلوم ہوتے ہو۔“ میں نے کہا کہ خانہ زاد پانی پت کا رہنے والا ہے، بچپن ہی سے حضرت ظلّ اللہ کے سایۂ عاطفت میں آ رہا ہے۔“ فرمایا۔ اماں! ابھی تمہارا ہی تذکرہ میرزا فخر کر رہے تھے۔ میرا خود جی چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح دیوان عام میں مشاعرہ کروں مگر کیا کروں زمانے کی ہوا ایسی بگڑ گئی ہے کہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ ”بُود ہم پیشہ باہم پیشہ دشمن“ لیکن خدا محفوظ رکھے ایسی دشمنی بھی کس کام کی کہ دو گھڑی مل جل کر نہ بیٹھنے دے۔

(۱) شاہان دہلی ہمیشہ مرد و عورت دونوں کو ”اماں“ سے خطاب کیا کرتے تھے چنانچہ اس طرز کلام کی جھلک اب تک حیدرآباد میں پائی جاتی ہے۔ سچے بڑا تعجب ہے کہ ایک مورخ نے اس طریقۂ مخاطب کی بنا پر قلعۂ معلیٰ کی تہذیب و اخلاق پر حملہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ ”بادشاہ کے اخلاق کی پستی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بھی ”اماں“ کہتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحب انگریزی نہیں جانتے تھے، ورنہ ان کو بڑھکر تعجب ہوتا کہ جس قوم کو وہ تہذیب کا پتلا اور اخلاق کا نمونہ ظاہر کرتے ہیں ان کے ہاں بھی خاوند اپنی بیوی کو ”اماں“ ہی کہتا ہے اور بیوی خاوند کو کبھی ”ابا“ کبھی ”دادا“ پکارتی ہے۔ (میرے خیال میں یہ ”ارے میاں“ کا اختصار ہے۔ چنانچہ اب بھی بے تکلف بول چال میں میاں کو ماں ہی کہہ جاتے ہیں)۔

ایک چاندی کی پلنگڑی پر لیٹے تھے ، پالٹی میرزا فخر و بیٹے
 پاؤں دبا رہے تھے ۔ دھلی میں وہ کون ہے جس نے حضرت ظلّ اللہ
 کو نہیں دیکھا ۔ میانہ قد ، بہت نحیف جسم ، کسی قدر لمبا
 چہرہ ، بڑی بڑی روشن آنکھیں ، آنکھوں کے نیچے کی ہڈیاں
 بہت ابھری ہوئی لمبی گردن ، چوکا ذرا اونچا ، پتلی ستواں ناک
 بڑا دھانہ ، گہری سانولی رنگت ، سرمندا ہوا ، چھدری ڈاڑھی ،
 کلوں پر بہت کم ، ٹھوڑی پر ذرا زیادہ ، لبیں کتري ہوئی
 ۷۰ برس سے اونچی عمر تھی ، بال سفید بہق ہو گئے تھے ، لیکن
 پھر بھی ڈاڑھی میں اکا دکا سیاہ بال تھا ۔ چہرہ پر جھریاں تھیں
 لیکن باوجود اس پیرانہ سالی اور نقاہت کے آواز میں وہی
 کرار پن تھا ۔ سبز کمخواب کا ایک بر کا پاجامہ اور سفید ڈھاکے کی
 ململ کا کرتہ زیب بدن تھا ۔ سامنے ایک چوکی پر جامہ وار کی
 خفتان اور کارچوبی چوگوشیہ ٹوپی رکھی ہوئی تھی ۔ اب رہے
 میرزا فخر و تو وہ عین مین باپ کی تصویر تھے ۳۲ ، ۳۳ برس کی
 عمر تھی ، فرق تھا تو بس یہی کہ وہ بدھے تھے ، یہ جوان ۔ ان کا
 رنگ بڑھاپے کی وجہ سے ذرا کلونس لے آیا تھا ۔ ان کا کھلا گھواں
 رنگ تھا ۔ ان کی ڈاڑھی سفید تھی ، ان کی سیاہ ۔ ورنہ یہی
 معلوم ہوتا تھا کہ ایک بادشاہ لیٹے ہیں اور ایک بیٹے ہیں ۔

ہیں۔ ایک گرم دوسرا سرد۔ عمارت کا جو حصہ موتی مسجد کی جانب ہے وہ گرم ہے اور جو جمنا کے رخ پر ہے وہ سرد ہے۔ ریتی کے رخ خس کے پردے ڈال کر خس خانہ بنا لیا جاتا ہے۔ اندر نہر بہتی ہے۔ بیچ میں کئی بڑے بڑے حوض ہیں۔ ان میں فوارے چلتے ہیں۔ حمام کیا ایک بہشت کا ٹکرا ہے۔ چوہدار جو گیا تو آنے کا نام نہیں لیا۔ دھوپ میں کھڑے کھڑے فشار ہو گیا۔ پسینہ میں تربتر گردن نیچے کئے کھڑا ہوں اور ناک سے پسینے کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ ارادہ ہوا کہ واپس چلا جاؤں۔ مگر اول تو طلبی کے بعد بھاگ جانا ہی نا زیبا، دوسرے راستہ کس کو معلوم۔ خدا خدا کر کے یہ مشکل آسان ہوئی اور چوہدار نے آکر کہا کہ چلئے۔ اس ایک لفظ نے خود بخود پاؤں میں لغزش اور دل میں کپکپی پیدا کر دی۔ خیر کسی طرح الٹے سیدھے پاؤں ڈالتا حمام مبارک میں داخل ہو گیا۔ چوہدار نے آواز دی ”ادب سے“ نگاہ رو برو‘ حضرت جہاں پناہ سلامت‘ آداب بجا لاؤ“ میں نواب زین العابدین خان صاحب سے یہ سبق پورا اور اچھی طرح پڑھ کر آیا تھا، دھرا ہو کر سات تسلیمات بجا لایا اور نذر گزرائی۔ نذر دیتے وقت ذرا آنکھ اونچی ہوئی تو وہاں کا رنگ دیکھا۔ حضرت پیر مرشد

کہ ہم لوگ بھی اُسکیں خیر بیٹھئے۔ شاید ابھی آپ کی یاد ہو۔“
 میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ بیٹھا ہی تھا کہ چوہدار نے اُکر کہا
 ”وہ کریم الدین کون صاحب ہیں۔ ان کو حضور والا یاد فرماتے
 ہیں۔“ یہ سننا تھا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں سمجھا تھا
 کہ حکیم صاحب ہی کے پاس جا کر معاملہ طے ہو جائیگا۔ یہ کیا
 خبر تھی کہ بارگاہ جہاں پناہی میں یاد ہوگی اور یاد بھی
 ایسے وقت کہ میرا سانس بھی پیت میں پوری طرح نہ سمایا ہوگا۔
 حکم حاکم مرگ مفاجات۔ اُٹھا اور چوہدار کے پیچھے پیچھے
 روانہ ہوا۔ تمام راستے آیۃ الکرسی پڑھتا رہا۔ اُنکھ اُٹھا کر
 یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ بندہ خدا کدھر لئے جا رہا ہے۔
 اندر سے قلعہ دیکھنے کا مدت سے شوق تھا۔ اب جو موقع ملا تو
 کن اُنکھیوں سے بھی دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چلتے چلتے آندھ
 اُگئی۔ آخر خدا خدا کر کے چوہدار نے دیوان خاص کی سیڑھیوں کے
 پاس لے جا کر کھڑا کر دیا اور آپ اندر اطلاع دینے چلا گیا۔
 حضرت جہاں پناہ اس وقت حمام میں رونق افروز تھے۔ جن
 صاحبوں نے دہلی کا قلعہ نہیں دیکھا ہے وہ شاید نہ سمجھ سکیں
 کہ گرمیوں میں حمام میں بیٹھنے کے کیا معنی ہیں۔ اصل یہ ہے
 کہ یہ حمام کیا ہے ایک عالی شان عمارت ہے۔ اس کے دو درجے

کل آپ ایک بجے قلعہ معلیٰ میں آجائے۔ میں چوہدری سے کہے جاتا ہوں، یہ اندر پہنچا دیگا، آگے آپ جانیں اور آپ کی قسمت“ یہ کہہ کر حکیم صاحب نے خدا بخش کو آواز دی۔ وہ آیا تو اُس سے کہا کہ ”کل یہ صاحب حویلی^(۱) میں ایک بجے آئینگے، ان کو میری بیٹھک میں پہنچا دینا“۔ یہ کہہ کر وہ نواب صاحب کی طرف متوجہ ہو گئے اور میں آداب کر کے واپس چلا آیا۔

دوسرے روز ایک بجے کے قریب میں مولویانہ ٹھاٹھ سے جبہ پہن، شملہ باندھ، قلعہ معلیٰ پہنچا۔ لاہوری دروازے کے باہر خدا بخش کھڑے ہوئے تھے وہ مجھ کو حکیم صاحب کی بیٹھک میں لے گئے۔ یہ بیٹھک جسکو پہلے زمانے میں ”نشست“ کہا جاتا تھا دیوان عام سے ملی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے، مجھے دیکھ کر بولے ”اجی مولوی صاحب میں نے آپ کا کام کر دیا ہے“ صاحب عالم میرزا فتح الملک بہادر سے صبح ہی کو ملنا ہو گیا، وہ اس تجویز سے بڑے خوش ہوئے۔ فرماتے تھے، جہاں پناہ سے میں اجازت لئے لیتا ہوں مگر مشاعرے کا انتظام ایسا ہونا چاہئے

(۱) قلعہ دہلی کو لال حویلی یا صرف حویلی بھی کہا جاتا ہے حافظ عبد الرحمن خاں احسان کا شعر ہے کہ۔

میری تنخواہ لوٹی ان لٹیروں نے حویلی میں
بہادر شاہ غازی کی دھائی ہے دھائی ہے

میرا بھی چاہتا ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لوں جس میں یہاں کے سب کاملین فن جمع ہو جائیں، مگر مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی معلوم نہیں ہوتی۔ اچھا تم بھی کوشش کرو، میں بھی کرتا ہوں، ممکن ہے کہ کوئی صورت نکل آئے۔ ہاں تھیرو حکیم صاحب کو آنے دو، ایک تجویز ذہن میں آئی ہے، اگر چل گئی تو میری بھی آخری خواہش پوری ہو جائیگی اور تمہارا بھی کام نکل جائیگا۔ ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ حکیم صاحب نکل آئے۔ گورے چٹے آدمی ہیں۔ تمام باتیں سنکر فرمایا ”آپ کے دوست کو صاحب میرزا فتح الملک بہادر سے ملا دیتا ہوں انکو آج کل مشاعرہ کی لو لگی ہوئی ہے۔ حضور سے بھی کئی مرتبہ عرض کرچکے ہیں، مگر وہ ٹال گئے اگر ان صاحب نے ذرا بھی زور دیا تو مجھے یقین ہے کہ صاحب عالم کہ سن کر ضرور اجازت حاصل کر لینگے۔ اچھا تو مولوی صاحب

(۱) ان کا نام میرزا فخرالدین خطاب میرزا فتح الملک بہادر عرف میرزا فخر اور تخلص رمز تھا۔ بہادر شاہ ثانی کے منجھلے بیٹے تھے۔ میرزا محمد دارا بخت عرف میرزا شبو ولیعہد سلطنت کے انتقال کے بعد سنہ ۱۸۴۸ء میں ولیعہد ہوئے۔ مگر غدر سے پچھلے ہی ۱ جولائی سنہ ۱۸۵۲ء میں ۴۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے بعد میرزا جوان بخت کی ولیعہدی کے جھگڑے ہوئے۔

اُن کے مکان پر پہنچا ۔ معلوم ہوا کہ وہ حکیم احسان اللہ خاں صاحب
 وزیر اعظم کے مکان پر تشریف لے گئے ہیں ۔ حکیم صاحب کا مکان
 سرکی والوں میں تھا ۔ واپسی میں دروازے پر دریافت کیا
 تو معلوم ہوا کہ نواب زین العابدین خاں اندر ہیں ۔ چوہدار کے
 ذریعے سے اطلاع کرائی ۔ انہوں نے اندر بلا لیا ۔ بڑا عالی شان
 مکان ہے ۔ صحن میں نہر ہے ، سامنے بڑا چبوترہ ہے اور چبوترے پر
 بڑے بڑے دالان در دالان ، مکان خوب آراستہ و پیراستہ ہے ، ہر چیز
 سے امارت ٹپکتی ہے ۔ سامنے گاؤ تکیہ سے لگے نواب صاحب بیٹھے تھے ۔
 میں نے تو ان کو پہچانا بھی نہیں سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے اور
 چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں ۔ میں نے سلام کر کے کیفیت پوچھی ۔
 کہنے لگے ” مولوی صاحب کیا کہوں کچھ دل بیٹھا جاتا ہے ، بظاہر
 کچھ مرض بھی معلوم نہیں ہوتا ۔ علاج کرا رہا ہوں مگر بے نتیجہ ،
 بھی اب ہمارے چل چلاؤ کا زمانہ ہے ، کچھ دنوں دنیا کی ہوا کھا
 رہے ہیں مگر یہ تو کہئے آج آپ کدھر نکل آئے ” میں نے واقعات کا
 اظہار کر کے ضرورت بیان کی ۔ تھوڑی دیر تک سوچتے رہے ۔ پھر
 ایک آہ بھر کر کہا ۔ ” میاں کریم الدین تم کو بات تو اچھی سوجھی
 ہے ، مگر بھی اس کا نباہنا مشکل ہے ۔ تمہیں خبر نہیں دہلی کے
 پہلے مشاعروں نے کیا کچھ دلوں میں فرق ڈال دئے ہیں ۔ دل تو

فارغ البال ہیں اپنا دل بہلانے اور حسرت نکالنے کے لئے شاعری کرتے ہیں ۔

میں خود عالم ہوں ، میرے باپ دادا عالم تھے ، بہلا میں تو اس قسم کی فضولیات کی طرف توجہ بھی نہ کرتا ۔ مگر کیا کروں ۔ ضرورت سب خیالات پر حاوی ہو گئی اور مجھے قیام مشاعرہ پر مجبور کیا ۔ لیکن بڑی مصیبت یہ ہے کہ ایک تو اس شہر میں غریب اور خاص کر پردیسی غریب کو منہ نہیں لگاتے ، دوسرے یہ کہ میری جان پہچان تھی تو مولویوں سے ، وہ بہلا اس معاملے میں میرا کیا ساتھ دے سکتے تھے ۔ سوچتے سوچتے نواب زین العابدین خاں عارف پر نظر پڑی ۔ اُن سے دو چار دفعہ ملنا ہوا تھا ۔ بڑے خوش اخلاق آدمی ہیں ، لال کوٹیس کے پاس ایک حویلی ہے اُسکو مدرسہ بھی کہتے ہیں ، وہاں رہتے ہیں ۔ کوئی ۳۰ سال کی عمر ہے ۔ گوری رنگت ، اونچا قد اور نہایت جامہ زیب آدمی ہیں ۔ البتہ ڈاڑھی بھر کر نہیں نکلی ہے ، تھوڑی ہی پر کچھ گنتی کے بال ہیں ۔ غالب کے بہانجے بھی ہیں اور شاگرد بھی ۔ کچھ عرصے تک شاہ نصیر سے بھی اصلاح لی ہے ۔ بہر حال اُنکی محبت ، اُنکی شرافت اور سب سے زیادہ اُنکے رسوخ نے مجھے اُنکی امداد حاصل کرنے پر مجبور کیا ۔ ایک روز صبح ہی صبح گھر سے نکل

دہلی بھری پڑی تھی ، ہر سمت علم کے چشمے جاری تھے ۔
 ملا کی دور مسجد ۔ میں بھی پانی پت چھوڑ کر دہلی آ گیا ۔
 کاپی نویسی سے گزارا کرتا ، محنت مزدوری کے بعد ذوق علم
 ہر حلقہ درس میں مجھے لیجاتا ۔ اسی زمانے میں دہلی کالج کی
 تنظیم جدید ہوئی تھی ۔ طالب علموں کی تلاش تھی ۔ میں بھی
 ۱۸ سال کی عمر میں وہاں شامل ہو گیا ۔ ۱۶ روپیہ وظیفہ بھی
 مقرر ہوا اور اس طرح میں نے علم کی پیاس بڑی حد تک
 بجھائی لیکن یہ وہ زمانہ نہیں تھا کہ علم کو علم کے لئے حاصل
 کیا جاتا ۔ اب اس کے ساتھ گزارے کی ایک بڑی شق لگ گئی
 تھی ۔ اس لئے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک مطبع کھولا ۔
 قاضی کے حوض پر مبارک النساء بیگم کی حویلی کرایہ پر لی ۔
 عربی کی مشہور مشہور کتابوں کے ترجمے چھاپے لیکن مطبع جیسا
 چلنا چاہئے تھا نہ چلا ۔ یہ اردو شاعری کے شباب کا زمانہ تھا
 بادشاہ سے لیکر فقیر تک سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے ۔
 خیال آیا کہ ایک مشاعرہ قائم کر کے شعراء کے حالات اور ان کا کلام
 طبع کروں ، ممکن ہے کہ اس طرح مطبع چل جائے مجھے شاعری سے
 نہ کبھی لگاؤ تھا اور نہ اب ہے ، بلکہ شعر کہنا میں برا جانتا ہوں ،
 کیونکہ اہل علم کا یہ پیشہ نہیں ہے ۔ وہ لوگ جو معیشت سے

۲۔ تدبیر

ہوس کو بے نشاط کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

میرا نام کریم الدین ہے ۔ میں پانی پت کا رہنے والا ہوں
یہ قصبہ دہلی سے ۴۰ کوس پر بجانب شمال مغرب واقع ہے اور
اپنی لڑائیوں کی وجہ سے تاریخ میں مشہور ہے ۔ ہم اچھے کھاتے
پیتے لوگ تھے ؛ مولویوں کا خاندان تھا ۔ لیکن زمانے کی گردش نے
ایسا پیسا کہ کوری کوری کو محتاج ہو گئے ؛ جالداد ضبط ہو گئی
میرے دادا صاحب قبلہ ایک مسجد میں جا بیٹھے اور اللہ کر کے
گزار دی ۔ جب ضبط شدہ جالدادوں کے متعلق دریافت شروع
ہوئی تو توکل نے ان کا دامن پکڑ لیا ، اپنی جگہ سے نہ ہلے ۔
نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیشہ کے لئے روٹیوں کا سہارا کھو بیٹھے ۔ میرے
والد سراج الدین مرحوم بمصداق ” عصمت بی بی از بے چادری “
متوکل بنے رہے اور مسجد میں ایسے بیٹھے کہ مرکز آئے ۔ میں سنہ
۱۲۳۷ھ میں عین عید الفطر کے دن پیدا ہوا ۔ میری تعلیم
ان ہی دونوں بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی ۔ لیکن بے چین طبیعت
اور خاندانی جھگڑوں نے آخر پانی پت چھڑایا اس زمانے
میں دہلی میں علم کا بڑا چرچا تھا ۔ ہرفن کے کاملوں سے

مکھی کی طرح نکال کر پھینک دوں۔ جس نے اس مشاعرے میں بہت بڑا حصہ لیا تھا؛ جس کے مکان پر یہ مشاعرہ ہوا تھا اور جو اس مشاعرہ کی روح رواں تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی یہ مجلس محدود تھی اور میں نے اس کو اتنی وسعت دی ہے کہ اس زمانے کے تقریباً سب بڑے بڑے شعرا کو اس میں لا بیٹھایا ہے۔ اب اس میں مجھے کامیابی ہوئی یا نہیں اس کا اندازہ قارئین کرام فرما سکتے ہیں۔ اگر ہوئی ہے تو زہ نصیب میری معنت ٹھکانے لگی، اگر نہیں ہوئی تو کم سے کم یہی سمجھ کر میری داد دی جائے کہ میرزا صاحب نے بات تو اچھی پیدا کی تھی مگر نباہ نہ سکے جو ان سے نہیں ہوا وہ اب ہم کر دکھاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس طرح کوئی قلم کا دھنی ان ”خفتگان خاک“ کا کوئی ایسا مرقع تیار کر دے جو بزم ادب اردو میں سبانی کے قابل ہو۔ لیجئے ”میں“ اب ”مولوی کریم الدین صاحب“ کی جون میں حاضر خدمت ہوتا ہوں، لیکن یہ ضرور عرض کئے دیتا ہوں کہ جب میں اپنی تمام معنت ”کریم الدین صاحب“ کی نذر کر رہا ہوں تو جو کچھ برا بھلا آپ کو اس مضمون کے متعلق کہنا ہے وہ مجھے نہ کہئے مولوی صاحب کو کہئے اور خوب دل بہر کے کہئے۔ میں خوش اور میرا خدا خوش۔ والسلام۔

جو خود میں نے برے بوڑھوں سے پوچھ کر بنائی ہیں۔ لیکن ہر صورت میں شہادت تائید کے مقابلے میں شہادت تردیدی کو زیادہ وقعت دی ہے۔ یعنی اگر کسی واقعے کے متعلق ایک بھی مخالف بات معلوم ہوئی تو اس واقعے کو قطعاً ترک کر دیا۔ اگر اتنے سارے حیلے ایک جگہ ہی جمع ہو جاتے تو یقیناً یہ مضمون فوج کے چہروں کا رجسٹر بن کر بے لطف ہو جاتا۔ لیکن ادھر تو آزاد مرحوم کے ”نیرنگ خیال“ نے دل میں مشاعرہ کا خیال ڈالا، ادھر کریم الدین مغفور کی کتاب ”طبقات الشعراء ہند“ کے طبقہ چہارم نے رجب سنہ ۱۲۶۱ھ کے ایک مشاعرہ کا پتہ دیا۔ اب کیا تھا دونوں کو ملا کر ایک مضمون پیدا کر لیا، رہی رنگ آمیزی اس کی تکمیل میں خود کئے دیتا ہوں۔ البتہ اچھے برے کی ذمہ داری نہیں لیتا۔ بحیثیت مورخ سنہ ۱۲۶۱ھ کے واقعات میں خود اس طرح لکھ سکتا تھا گویا سب میرے دید ہیں اور

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام * ہفتصد ہفتاد قالب دیدہ ام
پر نظر رکھتے ہوئے اس زمانے کا بھی میرزا ”الم نشرح“ بن سکتا تھا۔ مگر میرے دل نے گوارا نہیں کیا کہ کریم الدین مرحوم کی کامیابی کا سہرا اپنے سر پر باندھوں اور ایسے شخص کو دودھ کی

آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ جو لوگ علمی مذاق رکھتے ہیں وہ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ کسی کا کلام پڑھتے وقت اگر اس کی شکل و صورت، حرکات و سکنات، آواز کی کیفیت، نشست و برخاست کے طریقے، طبیعت کا رنگ اور سب سے زیادہ کہ اس کے لباس اور وضع قطع کا خیال دل میں رہے تو اس کا کلام ایک خاص اثر پیدا کر دیتا ہے اور پڑھنے کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے۔ ورنہ مصنف کے حالات سے واقف ہوئے بغیر اس کی کسی کتاب کا پڑھ لینا گراموفون کے ریکارڈ سننے سے زیادہ موثر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل مہذب ممالک کے کسی مصنف کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوتی جس کے شروع میں اس کے حالات درج نہ کئے جائیں اور وہ واقعات نہ دکھائے جائیں جن کی موجودگی میں وہ تصنیف ضبط تحریر میں آئی۔

یہی خیالات تھے جنہوں نے مجھے ان چند اوراق کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس البم میں آپ ایسی بہت سی تصویریں دیکھیں گے جو ان کاملین فن نے اپنے ہاتھ سے خود کھینچی ہیں؛ بہت سے ایسے مرقعے پائیں گے جو دوسرے کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں؛ بعض ایسے نقش و نگار ملیں گے جو فوٹو یا قلمی تصاویر دیکھ کر الفاظ میں اتارے گئے ہیں؛ اکثر و بیشتر ایسی صورتیں ہوں گی

مجمع ہو گیا جس کی نظیر ہندوستان تو ہندوستان دوسرے کسی ملک میں بھی ملنا دشوار ہے۔

زمانہ ایک رنگ پر نہیں رہتا۔ سنہ ۱۸۵۷ ع سے قبل ہی ان کاملین فن میں سے بہت سے تو ملک عدم کو سدھارے ' جو بچے کھچے رہ گئے تھے۔ ان کو غدر کے طوفان نے تتر بتر کر دیا۔ جسکو جہاں کچھ سہارا ملا ' وہیں کا ہو رہا۔ دہلی برباد ہو کر حیدرآباد اور رامپور آباد ہوئے۔ اکثر شرفا گھروں سے ایسے نکلے کہ پھر ان کو دہلی کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی جو رہ گئے ہیں وہ چلنے چلانے کو تیار بیٹھے ہیں ' بہت سے اٹھ گئے ' بہت سے اٹھتے جاتے ہیں ' اور ایک زمانہ وہ آنے والا ہے کہ کوئی یہ بتانے والا بھی نہ رہے گا کہ مومن مرحوم کا مکان کہاں تھا ' جس طرح سوائے میرے اب شاید کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی قبر کہاں ہے۔

ان حالات کو دیکھ دیکھ کر مجمع خیال آیا (اس خیال کی معرک مومن مرحوم کی تصویر بھی ہوئی) کہ " اردو " کے لئے ان سے ایک ایسا تو چراغ روشن کر لوں جس کی روشنی میں آنے والی نسلیں زبان اردو کے ان معسنوں کی شکلیں (خواہ وہ دھندلی ہی کیوں نہ سہی) دیکھ سکیں اور ان کا کلام پڑھتے وقت کم سے کم ان کی صورتوں کا ایک موہوم سا نقشہ پڑھنے والوں کی

قائم کر، مگر ان لوگوں کے کلام پر تنقید کرنے کے بجائے صرف ان کی چلتی پھرتی تصویر ہی دکھا۔ خیال میں رفتہ رفتہ پختگی ہوئی اور اس پختگی خیال نے ایک شاعرے کا خاکہ پیش نظر کر دیا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مختلف زمانوں کے شاعروں کو کس طرح ایک جگہ جمع کروں۔ اس عقدہ کو امیر اللہ تسلیم مرحوم کے اس شعر نے حل کر دیا۔

جوانی سے زیادہ وقت پیری جوش ہوتا ہے

بہرکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے

اس شعر کا یاد آنا تھا کہ شعرائے دہلی کا آخری دور انکھوں کے سامنے پھر گیا اور دل میں یہ بات جم گئی کہ بجائے تمام شعرائے اردو کے، دہلی کے آخری دور کا نقشہ کھینچ دیا جائے۔ قاعدے کی بات ہے کہ مرنے سے پہلے بیمار سنبھالا لیتا ہے۔ اردو شاعری کے حق میں بہادر شاہ ثانی کا زمانہ بھی دہلی کا سنبھالا تھا۔ بادشاہت برائے نام تھی جو تذخواہ بادشاہ سلامت کو ملتی تھی اس میں قلعے کا خرچ بھی مشکل سے چلتا تھا۔ بر خلاف اس کے دکن اور اودھ میں دولت کی گنگا بہہ رہی تھی ”دریائے جمنا کی چمکیلی ریت“ دہلی والوں کے لئے نظر فریب رہی اور ”آجرے دیار“ میں شعرا ہی نہیں ہر فن کے کاملوں کا ایک ایسا

سنہ ۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ

۱۔ تمہید

نام نیک رفتگان ضائع مکن

تا بماند نام نیکت برقرار

بقول غالب مرحوم انسان ”ایک معشر خیال“ ہے لیکن

خیال میں حشر پیدا ہونے کے لئے کسی بیرونی تحریک کا ہونا

لازمی ہے۔ دماغ خیال کا گنجینہ ہے، لیکن اس گنجینے کے

واسطے کسی ظاہری اسباب کی کنجی کی ضرورت ہے۔ مجھے

بچپن سے شعرائے اردو کے حالات پڑھنے اور سننے کا شوق

رہا ہے، مگر کبھی کوئی ایسی تحریک نہیں ہوئی جو ان کے

حالات کو ایک جگہ جمع کرنے کا خیال پیدا کرتی اور یہ خیالات

الفاظ کی شکل میں ظاہر ہو کر ایک خوش نما چلتی پھرتی

تصویر بن جاتے۔

جب کوئی بات ہونے والی ہوتی ہے تو اسباب خود بخود

پیدا ہو جاتے ہیں۔ اتفاق دیکھئے کہ پرانے قدیم کاغذات میں

مجھکو حکیم مومن خان ’مومن‘ دہلوی کی ایک قلمی تصویر کا

ملنا تھا کہ یہ خیال پیدا ہوا کہ تو بھی محمد حسین ’آزاد‘

مرحوم کے ”نیرنگ خیال“ کی محفل شعراء کی طرح ایک مشاعرہ

مکان پر جانا ، ہر شاعر کی طرز زندگی و خصائل و عادات کا معلوم ہونا ، آپس کی نوک جھوک ، شعراء کی آمد کا منظر ، مشاعرہ کی ابتداء ، شعراء کا انداز بیان اور نمونہ کلام ، تنقید و تبصرہ طریق نشست وغیرہ ایسے دل کش پیرائے میں تحریر ہیں کہ بالکل یہ معلوم ہوتا ہے جیسے تمام واقعات اپنے سامنے ہو رہے ہیں اور بچشم خود اس مشاعرہ کو دیکھ کر حال و قال سے دور ماضی کے لطف اٹھا رہے ہیں جس میں شاہ و شاہزادگان والا تبار اور شاعرانہ دربار ، یکتائے روزگار کی خوبیاں قابل دید و لائق داد ہیں ۔ دل چسپی کے علاوہ معلومات میں بھی اضافہ ہوگا ۔

راقم : احسن مارہروی

آرد و لیکچرار - مسلم یونیورسٹی - علی گڑھ

انتخاب

از

دہلی کا ایک یادگار آخری مشاعرہ

مصلفہ

جناب میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی اے۔ دہلوی

تعارف

سنہ ۱۲۶۱ھ کا وہ یادگار مشاعرہ جو ابو ظفر بہادر شاہ
آخری تاجدار دہلی کے عہد میں باہتمام مولوی کریم الدین
صاحب ہوا تھا میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی نے نہایت
قابلیت کے ساتھ اپنی مقبول طرز نگارش میں قلم بند کیا ہے
جس کے مطالعہ سے اُس عہد کا مذاق شعر و ادب اور قلعة
معلیٰ کی بعض خصوصیات معاشرت کا اندازہ اس طرح ہوتا ہے
جس طرح چشم دید حالات و واقعات معلوم ہو سکتے ہیں۔

کارکن مشاعرہ کی شخصیت ' شاہانہ مشاعرہ کی اہلیت '
ظل سبھانی تک رسائی ' بادشاہ سلامت کا انداز تکلم ' قلعة
معلیٰ کی سیر ' شعراء دہلی کو دعوت شرکت دینا۔ ہر ایک کے

سات روز جہاز میں چلنے کے بعد بندرگاہ بارہرہ پہونچا۔ اور
وہاں سے ایک مہینے کے سفر کے بعد بحیرہ قلزم کے ایک بندرگاہ
جدے میں آیا اور وہاں سے دو ماہ کے بعد کوہ سینا کے قریب
لنگر انداز ہوا۔

یہاں سے میں خشکی کے راستے روانہ ہوا اور ریگستان میں
ہوتا ہوا مصر کے شہر قاہرہ میں آیا جہاں میری بی بی اور
دو بچوں نے انتقال کیا۔ آخر اتنا بڑا دریا اور خشکی کا سفر
کر کے پچیس سال بعد میں اپنے وطن شہر وینس میں پہونچ گیا۔

گردن پر گھوڑوں کی طرح ایال ہوتی ہے۔ لیکن انکے بال زیادہ لمبے ہوتے ہیں اور سینک اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ جب وہ اپنا سر پیچھے کی جانب موڑتے ہیں تو سینک دم تک پہنچ جاتے ہیں۔ سفر میں لوگ ان سینگوں میں پانی بھر کے ساتھ لیجاتے ہیں۔ یہاں سے میں جزیرہ سقوطرہ میں آیا جو مغرب کی جانب ہے اور براعظم سے ایک سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ میں یہاں دو مہینے رہا۔ یہ چھ سو میل کے رقبے میں ہے اور یہاں زیادہ تر نسطوری عیسائی آباد ہیں۔

اس جزیرے کے قریب پانچ میل کے فاصلے پر دو اور جزیرے ہیں جن کا فاصلہ ایک دوسرے سے سو میل سے زیادہ نہیں۔ ان میں سے ایک جزیرے میں مرد رہتے ہیں اور دوسرے میں عورتیں۔ کبھی کبھی مرد عورتوں کے جزیرے میں چلے جاتے ہیں اور کبھی عورتیں مردوں والے جزیرے میں آجاتی ہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ چھ مہینے سے پہلے اپنے اپنے جزیروں میں واپس آجائیں ورنہ فوراً مرجائیں گے۔ اگر کوئی شخص اس مقررہ میعاد کے بعد ایک دن بھی دوسرے میں ٹھہر جاتا ہے تو فوراً مرجاتا ہے۔

یہاں سے روانہ ہو کے پانچ روز میں عدن پہنچا جو نہایت بارونق شہر ہے اور جس میں بڑی بڑی عمارتیں ہیں۔ یہاں سے

ہیں جو پانی کے اندر رہا کرتے ہیں۔ رات کے وقت وہ کناروں پر نکلتے ہیں اور لکڑیاں جمع کر کے اور دو پتھروں کو رگڑ کے آگ نکالتے اور اُسے روشن کرتے ہیں۔ روشنی دیکھ کے بہت سی مچھلیاں وہاں جمع ہو جاتی ہیں۔ اور یہ وحشی لوگ جو پانی کے اندر چھپ رہتے ہیں انہیں پکڑ کے کھا لیتے ہیں۔ اس ملک میں بھی وہ تمام میوے پیدا ہوتے ہیں جو کولسن میں پائے جاتے ہیں۔

یہاں سے روانہ ہو کے اور مختلف مقامات میں ہوتا ہوا میں کالی کت آیا جو ایک بندرگاہ ہے اور اٹھ میل کے رقبے میں آباد ہے۔ ہندوستان کا یہ بڑا تجارتی شہر ہے یہاں مرچ۔ لاکھ۔ سوئٹھ۔ دارچینی اور ہر وغیرہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

کالی کت سے چل کے پندرہ روز میں شہر کھمیاں پہنچا۔ جو سمندر کے کنارے بارہ میل کے رقبے میں آباد ہے۔ یہاں لاکھ۔ ہر۔ سن اور ریشم پیدا ہوتا ہے۔ یہاں برہمن آباد ہیں۔ جو پوجاری کہلاتے ہیں۔ یہ فقط ایک شادی کرتے ہیں۔ اور وہ بیوی ان کے مرنے پر زندہ جلادی جاتی ہے یہ برہمن کسی قسم کا گوشت نہیں کھاتے فقط چاول۔ دودھ اور ترکاریوں پر بسر کرتے ہیں۔ یہاں وحشی چوپائے بہت زیادہ ہیں۔ ان کی

بڑی آواز ہوتی ہے ۔ اوپر کا چھلکا مویشیوں کو دے دیا جاتا ہے ۔
 اس درخت کے پھل اکثر زمین کے اندر جڑوں تک میں نکلتے
 ہیں ۔ وہ مزے میں بہترین ہوتے ہیں ۔ لہذا عام لوگوں کو نہیں
 دیئے جاتے بلکہ بادشاہ کے لئے محفوظ رکھے جاتے ہیں ۔ اس کا
 درخت انجیر کے درخت کا ایسا ہوتا ہے ۔ اور اسکے پتے کھجور کے
 مانند ہوتے ہیں اسکی لکڑی کے صندوق بناتے ہیں اور بہت
 قیمتی ہوتی ہے ۔ اس درخت کا نام کاجی ہے ۔ یہاں ایک اور
 پھل ہوتا ہے جسے آم کہتے ہیں ۔ اسکی شکل سبز نارنگی کی
 ایسی ہوتی ہے لیکن اس سے چھوٹا ہوتا ہے اوپر کا چھلکا بدمزہ
 ہوتا ہے لیکن اندر کا حصہ شہد کے مانند شیریں ہوتا ہے ۔
 پکنے سے پہلے یہ پھل درخت سے توڑ لئے جاتے ہیں اور ان کی
 تیزی دور کرنے کے لئے پانی میں ڈال دیتے ہیں ۔

کولسن سے روانہ ہو کے تین دن کے بعد میں شہر کوچن
 پہونچا ۔ یہ شہر پانچ میل کے رقبے میں آباد ہے اور ایک ندی
 کے دھانے پر واقع ہے ۔ چند روز میں اس ندی کے اوپر سیر
 کرتے گیا ۔ ایک رات کو میں نے دیکھا کہ ندی کے کنارے اکثر
 مقامات پر آگ روشن ہے ۔ میں نے خیال کیا کہ ماہی گیروں نے
 جلائی ہوگی ۔ لیکن لوگوں نے بتایا کہ یہ عجیب الخلقت لوگ

سات سر ہوتے ہیں اور ہمیشہ درختوں پر رہا کرتے ہیں۔ وہ بہت تیز اڑتے ہیں اور نہایت زہریلے سانپ ہیں بلکہ کہا جاتا ہے کہ ایک سانس میں وہ آدمی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔

یہاں پردار بالیاں ہوتی ہیں انکے اگلے اور پچھلے پیروں کے بیچ میں جھلی ہوتی ہے جو انکے جسم سے لگی رہتی ہے۔ اور جب وہ بیٹھتی ہیں تو سمٹ جاتی ہے۔ وہ اپنے پیر پھیلا کے بازوؤں کو ہلا کے ایک درخت سے دوسرے درخت پر اڑ جاتی ہیں شکاری جب ان کا تعاقب کرتے ہیں تو وہ اڑتے اڑتے تھک جاتی ہیں۔ پھر زمین پر گر پڑتی ہیں اور لوگ انہیں پکڑ لیتے ہیں۔ یہاں ایک درخت نہایت کثرت سے پیدا ہوتا ہے جس کے تنے میں انناس کے ایسے پھل ہوتے ہیں لیکن اتنے بڑے کہ ایک آدمی مشکل سے اٹھا سکتا ہے۔ اس کا چھلکا سخت اور سبز رنگ کا ہوتا ہے اسکے اندر دو سو سے تین سو تک پھل نکلتے ہیں۔ جو انگور کی طرح شیریں اور نہایت خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ ہر پھل علیحدہ علیحدہ جھلی میں ہوتا ہے۔ جھلیوں میں ان پھلوں کے علاوہ ایک قسم کا سخت گودا نکلتا ہے جو مزے اور سختی میں شاہ بلوط کے پھل کے مانند ہوتا ہے اور اسی طرح پکایا جاتا ہے۔ اگر بغیر گرم کئے انگاروں پر رکھ دیا جائے تو

چڑیا کا گوشت نہیں کھایا جاتا لیکن اس کی دم اور کھال بہت قیمتی ہوتی ہے۔ لوگ اسے اپنی ٹوپوں میں لگاتے ہیں۔

میں نے جاوا میں ضروری سامان تجارت خریدا اور مغرب کی جانب جہاز پر روانہ ہوئے بندرگاہ سیامپا میں آیا جہاں عود۔ کافور اور سونا پیدا ہوتا ہے۔ اس سفر میں ایک مہینہ صرف ہوا۔ پھر میں وہاں سے روانہ ہوئے بندرگاہ کولسن پہونچا۔ اس ملک کو لوگ ملابار کہتے ہیں۔ یہاں سونٹھہ مرچ اور دارچینی پیدا ہوتی ہے۔ یہاں ایک قسم کے سانپ ہیں جو چہرے گزلمے ہوتے ہیں اور جنگل میں رہتے ہیں۔ لیکن جب تک انہیں کوئی نہ ستائے کسی کو نہیں کاٹتے۔ وہ بچوں کو دیکھ کے خوش ہوتے ہیں۔ لہذا بچوں کو دیکھتے ہوئے وہ آبادی میں آجاتے ہیں۔ یہاں ایک اور قسم کا سانپ بھی ہوتا ہے جسکے چار پیر ہوتے ہیں اور کتے کی طرح لمبی دم ہوتی ہے۔ یہ کسی کو نہیں ستاتے لیکن لوگ اسے کھاتے ہیں اور اس کا گوشت بہترین قسم کی غذاؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔

یہیں ایک اور قسم کے بھی سانپ ہیں جو ایک ہاتھ لمبے ہوتے ہیں۔ اور چمگادڑوں کی طرح انکے بازو ہوتے ہیں۔ انکے

اسکے قرضدار کو قتل کیا ہے اور اس سے اپنا روپیہ مانگتا ہے ۔
اور حاکم اس کا فیصلہ کرتے ہیں ۔

اگر کوئی شخص نئی تلوار مول لیتا ہے تو اسے آزمانے کے
لئے جو شخص پہلے سامنے آجاتا ہے اس کے جسم میں بھونکدیتا ہے ۔
اور اگر وہ شخص مرجائے تو اسے کوئی سزا نہیں دی جاتی ۔
راستہ چلنے والے اس کے زخم کو دیکھ کے اس شخص کی تعریف
کرتے ہیں جس نے اس طرح سیدھی تلوار بھونک دی ۔ یہاں
ہر شخص جتنی بیبیاں چاہے رکھ سکتا ہے ۔

یہاں کے لوگوں کی سب سے زیادہ دلچسپی مرغوں کی
لڑائی میں ہوتی ہے ۔ مختلف لوگ اپنے اپنے مرغ لاتے ہیں ۔
اور ہر شخص کا دعویٰ ہوتا ہے کہ ہمارا مرغ جیتے گا ۔
جو لوگ لڑائی کا تماشا دیکھنے آتے ہیں اس پر بازی
لگاتے ہیں اور جو مرغ فتح پاتا ہے وہی ان کی بازی کا
فیصلہ کرتا ہے ۔

جادا کے بڑے جزیرے میں ایک نہایت خوبصورت چڑیا
ہوتی ہے جو جنگلی کبوتر کے برابر ہوتی ہے لیکن اس کے پیر
نہیں ہوتے ۔ سر پر ایک کلفی ہوتی ہے اور دم لمبی اور گول
ہوتی ہے ۔ اکثر یہاں کے درختوں پر دیکھی جاتی ہے ۔ اس



اپنے دیوتاؤں کے آگے قربانی نہ کر لیں تو کافور لکڑی کے اندر سے غالب ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں دو جزیرے ہیں جو دنیا کے خاتمے پر واقع ہوئے ہیں۔ دونوں کا نام جاوا ہے۔ ایک کا رقبہ تین ہزار میل ہے اور دوسرے کا دو ہزار میل۔ دونوں مشرق میں سمندر کے راستے میں ہیں۔ اور براعظم سے ایک مہینے کے سفر پر اور ایک دوسرے سے سو میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ (جو سارے سفر میں میرے ہمراہ تھے) یہاں نو مہینے رہا۔

ان جزائر کے باشندے دنیا کی سب قوموں سے زیادہ بے رحم اور ظالم ہیں۔ کتے۔ بلیاں۔ چوہے۔ اور ایسے ہی ناپاک جانور کھاتے ہیں۔ کسی آدمی کو مار ڈالنا انکے یہاں ایک مذاق ہے۔ اور اس قتل کی انہیں کوئی سزا بھی نہیں دی جاتی۔ قرضدار کو پکڑ کے قرضخواہ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ اسے اپنا غلام بنا لیتا ہے۔ لیکن اگر وہ غلام بننے سے موت کو ترجیح دے تو ایک ننگی تلووار لے کے نکل پڑتا ہے اور جو شخص اس کے سامنے آ جاتا ہے قتل کر ڈالتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی اس سے زیادہ طاقتور مقابل مل جاتا ہے جو اسے مار ڈالتا ہے۔ اب قرضخواہ آگے اس شخص کو پکڑتا ہے جس نے

اگر شہر والے بغاوت کریں تو بادشاہ انکے اندر ہی اندر جس قلعے میں چاہے چلا جائے۔ اس شہر سے پندرہ دن کے راستے پر ایک اور بڑا شہر ہے جو اسی بادشاہ نے تعمیر کرایا ہے وہ تیس میل کے رقبے میں آباد ہے اور نپ نالی کہلاتا ہے۔ سب شہروں سے زیادہ آباد ہے۔ ان دونوں شہروں کے مکان اور بڑی عمارتیں اور رونق سب اٹلی کی ایسی ہے۔ یہاں کے لوگ نہایت ہوشیار اور شریف ہیں اور سب ملکوں سے زیادہ دولت مند ہیں۔

یہاں سے میں اوا واپس آیا اور سترہ دن جہاز میں سفر کر کے ایک ندی (غالباً پیگو) کے دھانے پر پہونچا۔ یہاں ایک شہر آباد ہے۔ میں اس میں نہیں ٹھہرا۔ لیکن ایک دوسری کشتی میں بیٹھ کے ندی کے اوپر چلا۔ اور دس روز کے بعد ایک نہایت آباد شہر یونیا میں آیا جو بارہ میل کے رقبے میں آباد ہے۔ یہاں چار مہینے ٹھہرا۔ ہندوستان میں فقط یہی ایک مقام ہے جہاں انگور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بھی بہت کم ہوتا ہے۔ لہذا لوگ اس کی شراب نہیں بناتے۔ یہاں سیب۔ نارنگی۔ بلوط۔ خربوزے۔ سفید سندل اور کافور پیدا ہوتا ہے۔ کافور ایک درخت کے اندر سے نکلتا ہے۔ اور اگر لوگ اسکی چھال نکالنے سے پہلے

چھپا رہے۔ اور گھوڑے کی گردن میں بھی باندھ دیتے ہیں تاکہ اس کے آگے لٹکتے رہیں۔ اور سینہ ان میں چھپا رہے۔ یہ بڑی عزت کی چیز خیال کی جاتی ہے۔ رسالے کے سوار ان بالوں کو اپنے نیزوں میں لگاتے ہیں اور شرافت کا نشان سمجھتے ہیں۔

اس ملکوں سے اچھا ہے۔ اس کا نام کیتھا^(۱) ہے۔ اس ملک کے حاکم کو خان اعظم کہتے ہیں جسکے معنی شہنشاہ کے ہیں۔ اسکے دارالسلطنت کا نام کہبلشیا^(۲) (خان بالق) ہے۔ یہ شہر اٹھالیس میل کے رقبے میں آباد ہے۔ اسکے درمیان میں ایک نہایت مضبوط قلعہ ہے اور اسی کے اندر بادشاہ کا محل ہے۔ یہ شہر ایک مربع رقبے میں آباد ہوا ہے لہذا فصیل کے چاروں کونوں پر چار مدور قلعے تعمیر کئے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک کا دور چار میل ہے۔ ان قلعوں میں ہر قسم کا سامان جنگ اسلحہ اور شہروں پر دھاوا کرنے کی کلیں موجود رہتی ہیں۔ قصر شاہی سے ان چاروں قلعوں کو سرنگیں گئی ہیں جو اس خیال سے بنائی گئی ہیں کہ

(۱) چین کا ایک جنوبی حصہ۔ لیکن اب اُس کے حدود کا اندازہ کرنا غیر ممکن ہے۔

(۲) پکن کا قدیم نام خان بالق تھا۔

اور اسے نہایت پر تکلف غذا خیال کرتے ہیں۔ اسکے سوا وہ
کیکڑوں کو بھی نمک مرچ میں بھون کے کھا جاتے ہیں۔
یہاں ایک جانور ہوتا ہے جس کا سر سور کے مانند ہوتا ہے۔
دم بیل کی سی ہوتی ہے۔ اور پیشانی پر گیندے کی طرح
ایک چھوٹا سینگ ہوتا ہے۔ رنگ اور قد و قامت میں وہ ہاتھی کے
برابر ہوتا ہے۔ اور ہمیشہ ہاتھی سے لڑا کرتا ہے کہ اسکا سینگ
ہر قسم کے زہر کا علاج ہے۔ اور اسی وجہ سے لوگ اسکی بڑی
قدر کرتے ہیں۔

اس ملک کے اندرونی حصے میں سیاہ اور سفید بیل پیدا
ہوتے ہیں۔ اور وہ بیل نہایت قیمتی سمجھے جاتے ہیں جن کی
دمیں گھوڑے کی طرح گھنی اور لمبے بالوں کی ہوں۔ لیکن
گھوڑوں سے زیادہ لمبی اور پیروں تک نیچی ہوں۔ انکی دموں کے
بال بہت باریک۔ ہلکے اور نرم ہوتے ہیں۔ اور اپنے وزن کے
برابر چاندی کے معاوضے میں فروخت ہوتے ہیں۔ ان بالوں کے
پنکے اور چونریاں بنائی جاتی ہیں جو دیوتاؤں اور بادشاہوں کو
جھلی جاتی ہیں۔

ان بیلوں کی دموں کے بال معزز اور امیر لوگ اپنے گھوڑوں کی
دمچیوں میں لگا دیتے ہیں تاکہ گھوڑے کا پچھلا حصہ ان میں



اور اُسکی گردن میں سونے کی زنجیر پڑی ہے جس میں قیمتی جواہرات جڑے ہیں۔ وہ اُس کے پیروں تک لٹکتی رہتی ہے۔

یہاں کے مرد ایک ہی بی بی رکھتے ہیں۔ اور سب مرد اور عورتیں اپنے گوشت میں سوئیوں سے سوراخ کر کے ایسا رنگ بھرتے ہیں جو کبھی زائل نہیں ہوتا۔ لوگوں کا مذہب بت پرستی ہے۔ لیکن جب سوکے اٹھتے ہیں تو مشرق کی طرف منہ کر کے اور دونوں ہاتھ جوڑ کے کہتے ہیں ”خدا کی تثلیث اور اسکی شریعت ہمیں محفوظ رکھے“۔

اس ملک میں ایک قسم کا سیب پیدا ہوتا ہے جو انار کی شکل کا ہوتا ہے اور اس میں نہایت شیریں عرق بھرا ہوتا ہے۔ ایک درخت ہوتا ہے جو تال (تار) کہلاتا ہے۔ اس کے پتے بہت بڑے ہوتے ہیں۔ اور اسی پر لوگ لکھتے ہیں کیونکہ سارے ہندوستان میں سوا کھمیات کے اور کسی جگہ کاغذ کا رواج نہیں ہے۔ اس درخت میں چقندر کے مانند ایک پھل بھی ہوتا ہے۔ اس کے اندر جو عرق ہوتا ہے چند روز بعد جم جاتا ہے اور کھانے میں بڑے مزے کا ہوتا ہے۔

اس ملک میں نہایت خوفناک سانپ پیدا ہوتے ہیں جن کے پیر نہیں ہوتے لیکن انسان کے برابر موٹے اور چہرہ گز لمبے ہوتے ہیں۔ یہاں کے باشندے انہیں آگ میں بھون کے کھاتے ہیں۔

روزانہ دیدی جاتی ہے۔ اسی طرح پندرہ روز میں اُس کا جوش کم ہو جاتا ہے۔ اب وہ اُسے دو پالو ہاتھیوں کے بیچ میں باندھتے ہیں اور شہر کے اندر سڑکوں پر لیجاتے ہیں۔ غرض چند روز میں وہ اور ہاتھیوں کی طرح پالو ہو جاتا ہے۔

لیکن بعض جگہ ہاتھیوں کو ایک اور طریقے سے پکڑتے اور پالو کرتے ہیں۔ وہ ہاتھیوں کو ایک ایسے مقام پر لیجاتے ہیں جو چاروں طرف سے محفوظ ہو۔ پھر پالو ہتھنیوں کو وہاں سے نکال دیتے ہیں اور ہاتھیوں کو فاقے دے دے کے پالو کر لیتے ہیں۔ چار روز بعد انہیں ایک تنگی مقام میں لیجاتے ہیں جو خاص کر اسی ضرورت سے بنایا جاتا ہے۔ اور وہاں انہیں سدھار لیتے ہیں۔ بادشاہ ان ہاتھیوں کو اپنی ضرورتوں کے لئے خریدتے ہیں پالو ہاتھیوں کو گھبی اور چاول دئے جاتے ہیں۔ اور جنگلی ہاتھی درختوں کے پتے اور گھانس کھاتے ہیں۔ پالو ہاتھی کو فقط ایک آدمی ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتا ہے اُس کے سر پر بیٹھ کے ایک آہنی آنکس کے ذریعے سے چلاتا ہے۔ یہ جانور اس قدر ہوشیار اور عقلمند ہوتا ہے کہ میدان جنگ میں دشمن کے تیروں اور برچھیوں کو وہ اپنے پیر کے تلووں پر روک لیتا ہے تاکہ اُن لوگوں کو نقصان نہ پہنچے جو اُس کی پیٹھ پر سوار ہیں۔ اس ملک کا بادشاہ ایک سفید ہاتھی پر سوار ہوتا ہے

ہیں جو لڑائی میں کام آتے ہیں قلعے (عماریاں) ان ہاتھیوں کی
 پیٹھ پر باندھ دئے جاتے ہیں۔ جس میں اٹھ یا دس آدمی
 تیر کمان اور خنجر لیکے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ ہاتھی جنگل میں
 رہتے ہیں۔ لیکن عام طور پر اس طرح پکڑے جاتے ہیں کہ ایک
 خاص فصل میں پالو ہتھنی جنگل میں چھوڑ دی جاتی ہے جب
 ہاتھی اُسے دیکھ لیتے ہیں تو وہ آہستہ آہستہ چرتی ہوئی ایک
 احاطے کے اندر آ جاتی ہے جسکے گرد دیواریں ہوتی ہیں اور دو بڑے
 پھاٹک لگے ہوتے ہیں۔ جب جنگلی ہاتھی اُسے اس احاطے کے
 اندر دیکھتے ہیں تو وہ بھی ایک پھاٹک سے اُس میں آ جاتے ہیں۔
 لیکن ہتھنی فوراً دوسرے پھاٹک سے نکل جاتی ہے اور لوگ جو
 اُسکی نگرانی کرتے رہتے ہیں دونوں مضبوط بند کر لیتے ہیں۔
 پھر بہت سے آدمی چھوٹے چھوٹے دروازوں سے اُس احاطے میں
 آ جاتے ہیں۔ اُنکے ہاتھ میں نہایت مضبوط رسیاں ہوتی ہیں
 جن میں پھندے بنے ہوتے ہیں۔ ایک آدمی اس ہاتھی کے
 سامنے جاتا ہے اور جیسے ہی ہاتھی اُسے مارنے کے لئے دوڑتا ہے
 اور لوگ پیچھے سے اُس کے پیروں میں رسی کے پھندے ڈال
 دیتے ہیں۔ پھر اُس کے پیر مضبوط جکڑ دئے جاتے ہیں اور تین
 چار دن اُسے وہیں باندھ دیتے ہیں۔ فقط تھوڑی سی کھانسی

نہایت آباد شہر مارزیہ (متھرا) میں اُترا۔ یہاں عود - سونا چاندی جواہرات اور موتی پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں سے میں نے مشرق کی جانب پہاڑوں کا راستہ لیا جہاں کی نسبت سنا تھا کہ سنگ شب چراغ پیدا ہوتا ہے۔ وہاں کے سفر میں تیرہ دن صرف ہوئے اور میں پھر سرناؤ (کرونگر) واپس آیا۔ بُضی تانیہ (بردوان) گیا یہاں سے روانہ ہوئے ایک مہینے کے دریائی سفر کے بعد دریائے اوا کا کے دھانے پر پہونچا۔ اور ندی میں چھ روز چلنے کے بعد ایک بہت بڑے شہر میں آیا جو اسی ندی کے نام سے مشہور ہے اور اسی کے کنارے آباد ہے۔

یہاں سے چل کے میں ایسے ملک میں پہونچا جہاں آبادی کا نام و نشان بھی نہیں۔ سترہ دن پہاڑوں میں اور پندرہ دن میدانوں میں سفر کرنے کے بعد میں ایک اور ندی کے کنارے پہونچا جو گنگا سے بھی بڑی ہے اور لوگ اُسے داوا (اراودی) کہتے ہیں۔ اس ندی میں اوپر کی جانب ایک مہینہ چلنے کے بعد میں ایک شہر میں آیا جو اور سب شہروں سے بڑا ہے اور پندرہ میل کے رقبے میں آباد ہے۔ اس شہر کا نام آوا ہے۔

یہ ملک مسمیٰ فوس (سیام) کہلاتا ہے۔ اور اس میں ہاتھی بہت زیادہ ہیں۔ یہاں کے بادشاہ کے پاس دس ہزار ہاتھی ایسے

گنگا کے دھانے پر پہونچا۔ پھر ایک کھتی میں پندرہ دن اسی دریا میں چڑھائی پر سفر کر کے ایک بڑے اور مشہور شہر میں پہونچا جو سرناؤ (کرونگر) کہلاتا ہے۔ یہ ندی اتنی چوڑی ہے کہ اس کے بیچوں بیچ میں سے دونوں جانب کی زمیں نہیں نظر آتی۔ بعض مقامات پر اس کا عرض پندرہ میل سے زیادہ ہے۔ اس ندی کے کنارے بہت اونچے بانس پیدا ہوتے ہیں جو اسقدر موٹے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے دونوں بازوؤں کے دور میں لینا چاہے تو نہیں لے سکتے یہاں کے لوگ ان کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں بناتے ہیں۔ یہ دونگی اس ندی میں آمد و رفت کے لئے بہت موزوں ہوتی ہے۔ بانس میں ایک گرہ سے دوسری گرہ کا فاصلہ آدمی کے قد کے برابر ہوتا ہے۔ مگر مچھ اور مختلف قسم کی مچھلیاں جن سے ہم نہیں واقف ہیں اس ندی میں موجود ہیں ندی کے دونوں جانب نہایت خوشنما آبادیاں اور کھیت اور باغ ہیں جن میں ہزاروں قسم کے میوے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے اچھے موز (کیلے) جو انگور کے ذائقے اور شہد سے زیادہ شیریں ہیں۔ اور ناریل ہیں۔

یہاں سے روانہ ہو کے میں تین مہینے اسی ندی کے اوپر چلا گیا۔ اور چار بہت بڑے اور مشہور شہر راستے میں چھوڑ دیئے۔ پھر ایک

بیچ سبز ہوتے ہیں جنہیں وہ لوگ راکھ میں ڈال کے دھوپ سے خشک کر لیتے ہیں۔ اس جزیرے میں ایک خاص قسم کا پھل ہوتا ہے اور کھیرے کے برابر ہوتا ہے جب اسے کاٹتے ہیں تو اس میں نارنگیوں کے سے گول پانچ پھل نکلتے ہیں اور ان کا مزہ پفیور کا ایسا ہوتا ہے۔

اس جزیرے کے ایک حصے میں جو باتش کہلاتا ہے ایسی قوم آباد ہے جو مردم خوار ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ قرب و جوار کے لوگوں سے لڑا کرتے ہیں وہ انسانی سروں کو بڑی قیمتی چیز سمجھتے ہیں۔ جب وہ کسی دشمن کو گرفتار کرتے ہیں تو اس کا سر کاٹ کے رکھ لیتے ہیں اور بقیہ جسم کھا جاتے ہیں۔ جب انہیں کوئی چیز خریدنے کی ضرورت ہوتی ہے تو روپے کے بجائے وہی سر دیدیتے ہیں۔ لہذا ان میں وہ شخص سب سے زیادہ مالدار سمجھا جاتا ہے جس کے گھر میں سب سے زیادہ سر ہوں۔

اب میں اس جزیرے سے روانہ ہوا اور سولہ دن کے نہایت طولانی سفر کے بعد تناسرم پہونچا جو اسی نام کے دریا کے دھانے پر واقع ہے۔ اس ملک میں ہاتھی بہت سے ہیں۔ اور ایک خاص قسم کی چڑیاں ہوتی ہیں۔

یہاں سے روانہ ہوئے اور خشکی اور تری کا سفر کر کے دریائے

شہر میں ایک سال رہا۔ یہ شہر چھ میل کے رقبے میں آباد ہے اور بڑی تجارت کی جگہ ہے۔ ایک اچھے موسم میں چند روز میں نے جہاز پر سیر کی اور جزیرہ اندمانیہ کو اپنی داہنی جانب چہرے دیا۔ یہ سونے کا جزیرہ کہلاتا ہے اور آٹھ سو میل کے رقبے میں ہے۔ یہاں کے لوگ مردم خوار ہیں۔ کوئی جہاز اس کے ساحل پر نہیں ٹھہرتا۔ اور اگر طوفان کی وجہ سے وہاں جانا پڑا اور ان وحشیوں نے دیکھ لیا تو فوراً آ کے لوگوں کو پکڑ لے جاتے ہیں۔ اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھا لیتے ہیں۔ جزیرہ سماترا چھ ہزار میل کے رقبے میں ہے۔ وہاں کے لوگ ظالم اور وحشی ہیں۔ مردوں اور عورتوں کے کان بہت بڑے ہوتے ہیں۔ اور ان میں وہ بالیاں پہنتے ہیں جن میں قیمتی جواہر جڑے ہوتے ہیں۔ وہ سوتی اور ریشمی کپڑے پہنتے ہیں۔ جو گھٹنوں کے نیچے تک لٹکتے رہتے ہیں۔ مرد جتنی بیبیاں چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ ان کے مکانات نہایت پست ہوتے ہیں اور فقط اس غرض سے بنائے جاتے ہیں کہ دھوپ کی شدت سے لوگوں کو بچائیں۔ یہاں کے لوگ سب بت پرست ہیں۔

اس جزیرے میں مرچ اور کافور پیدا ہوتا ہے۔ اور کانوں میں سے سونا نکالا جاتا ہے۔ مرچ کا درخت چھوٹا ہوتا ہے اور اس کے

اس خلیج کے بیچ میں ایک جزیرہ ہے جس کا نام ضیلام
(سیلون یعنی سراندیپ) ہے۔ اس کے چاروں طرف ساحل کی
لمبائی تین ہزار میل ہے۔ اس میں لال - یاقوت - فیلم -
اور وہ قیمتی پتھر پیدا ہوتا ہے جو رات کو روشنی دیتا ہے۔
یہاں دارچینی کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا درخت
ہمارے ملک کے بید کے مشابہ ہوتا ہے۔ لیکن اسکی شاخیں
اوپر کی جانب نہیں ہوتیں بلکہ چاروں طرف پھیلتی ہیں۔

اس جزیرے میں ایک جھیل^(۱) ہے۔ اور اس کے بیچ میں
ایک شہر آباد ہے جس کے ساحل کا دور تین میل ہے۔ ان
جزیروں میں برہمنوں کی حکومت ہے جو دیگر لوگوں سے زیادہ
قابل خیال کئے جاتے ہیں۔ برہمن بڑے فلسفہ دان ہوتے ہیں
اور اپنی ساری زندگی نجوم اور ہیئت کی فکروں میں بسر
کردیتے ہیں۔

اس کے بعد جزیرہ تپرویونا کے ایک شہر میں گیا۔
اس جزیرے کو وہاں کے باشندے سموترا کہتے ہیں۔ میں اس

(۱) سیلون میں اب کوئی جھیل نہیں ہے اور نہ کوئی ایسے آثار
پائے جاتے ہیں کہ اتنی بڑی جھیل موجود ہو جس کے بیچ میں
شہر آباد ہو۔

(غالباً ورمائٹم جو ٹلی چری کے قریب ہے) ہے ۔ راستے میں
مجمعہ دو شہر ملے جن کا نام رواگیری اور چندرگیری ہے ۔ پھر
اگے بڑھ کے ایک اور بندرگاہ ملا جو میلاپور کہلاتا ہے اور
دریائے سندھ کے بعد دوسرے خلیج میں واقع ہے ۔ یہاں ایک
بڑے اور خوشنما گرجے میں سینٹ ٹامس کی قبر ہے ۔ اور بے دین
نسطوری فرقے کے لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں ۔ اس شہر میں
ان کی تعداد ایک ہزار ہے ۔ یہ نسطوری سارے ہندوستان میں
اسی طرح پھیلے ہوئے ہیں جس طرح ہمارے ممالک میں
یہودی ہیں ۔ یہ سارا علاقہ ملاپور کہلاتا ہے ۔ اس کے اگے
ایک اور شہر ہے جس کا نام کاہلہ (کل کیر) ہے ۔ یہاں
سمندر میں موتی پیدا ہوتے ہیں ۔ اس شہر میں ایک درخت
ہوتا ہے ۔ جس میں پھل نہیں لگتے لیکن اس کا پتہ چم بالشت
لمبا اور اسی قدر چوڑا ہوتا ہے اور اس قدر پتلا کہ ایک
شخص اسے دبا کے اپنی مٹھی میں بند کرلیتا ہے ۔ یہاں کے
لوگ ان پتوں پر لکھتے ہیں اور بارش کے موسم میں اپنے
سر پر ڈال لیتے ہیں تاکہ کپڑے مینہ سے محفوظ رہیں ۔ اس
پتے کو پھیلا کے تین چار آدمی بہ آسانی اسے نیچے چل
سکتے ہیں ۔

چلی گئیں ہیں۔ اور انکے دامن کی وادیوں کو اپنے آغوش میں
 لیے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے اس شہر کی وسعت بہت زیادہ
 ہو گئی ہے۔ اس شہر میں نوے ہزار جوان ایسے ہیں جو
 میدان جنگ میں اُسکتے ہیں۔ یہاں کے مردوں کی کئی بیبیاں
 ہوتی ہیں اور اپنے شوہر کے ساتھ جل کے مر جاتی ہیں۔
 ہندوستان کے بادشاہوں میں یہاں کا راجہ سب سے زیادہ
 طاقتور ہے۔ اسکی بارہ ہزار بیبیاں ہیں۔ جہاں کہیں وہ جاتا ہے
 چار ہزار بیبیاں پیدل ہمراہ ہوتی ہیں اور باورچی خانے کا
 انتظام انہیں کے سپرد ہوتا ہے۔ چار ہزار جو اچھے کپڑے پہنے
 ہوتے ہیں گھوڑوں پر سوار ہو کے ساتھ چلتے ہیں۔ اور
 باقی پالکیوں میں ہوتے ہیں جنہیں آدمی لیکے چلتے ہیں
 انہیں میں دو تین ہزار ایسی منتخب بیبیاں ہیں جو
 اس شرط سے رکھی گئی ہیں کہ راجہ کی موت پر یا اس کے
 ساتھ جل کے مرجائیں گی۔ اور یہ ان کے لئے بڑی عزت کی
 بات خیال کی جاتی ہے۔ مشہور شہر پلاکندہ (غالباً پناکندہ)
 اسی راجہ کے علاقے میں شامل ہے۔ اور بیجانگر سے آٹھ روز کی
 مسافت پر واقع ہے۔ یہاں سے سفر کر کے بیس دن چلتا
 رہا۔ اور ایک بندرگاہ میں آیا جس کا نام پودی فتانپہ

اس طرح ایک مہینہ سفر کر کے اور دریائے سندھ کے دھانے سے گذر کے میں ایک خلیج میں داخل ہوا اور شہر کھمیات پہونچا۔ یہاں ایک قسم کا قیمتی پتھر پیدا ہوتا ہے جو رات کو روشنی دیتا ہے۔ یہاں کے لوگوں میں رواج ہے کہ جب شوہر مر جاتا ہے تو اسکی موت کو اہمیت دینے کے لئے اسکی بیوی جو شوہر کو زیادہ عزیز ہوتی ہے اس کی لاش کے برابر لیت جاتی ہے اور اسکے گلے میں بانہیں ڈال کے ساتھ جل جاتی ہے۔ اور جب چتا روشن ہو جاتی ہے تو دوسری بیبیاں بھی شعلوں میں گھس پڑتی ہیں۔

یہاں سے روانہ ہو کے میں نے بیس روز جہاز پر گزارے اور دو شہروں کے قریب پہونچا جو ساحل پر واقع ہیں۔ ان شہروں کے قریب سونٹھ اور ادراک پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک چھوٹے پودے کی جڑ ہے جو دو بالشت اونچا ہے۔ اس کی جڑ کھود کے نکال لیتے ہیں اور راکھ میں ڈال کے تین دن دھوپ میں پھیلا دیتے ہیں۔ اور اور وہ خشک ہو جاتی ہے۔

یہاں سے روانہ ہو کے اور تقریباً تین سو میل اندرون ملک خشکی کا سفر کر کے میں بڑے شہر بیجانگر پہونچا جو بلند چٹانوں کے دامن میں واقع ہے۔ یہ شہر ساٹھ میل کے رقبے میں آباد ہے۔ اس کی فصیلیں پہاڑوں کے اوپر تک

رفت ہے۔ بغداد کے قریب شہر بابل کی بہت سی یادگاریں اور عمارتوں کے کھنڈر اب تک باقی ہیں۔ شہر کے ایک بلند مقام پر مضبوط قلعہ ہے۔ اور اسی کے اندر شاہی قصر ہیں۔

یہاں سے روانہ ہو کے میں نے بیس دن کشتی کا سفر کیا۔ دریا کے دونوں جانب نہایت زرخیز زمینیں نظر آئیں۔ پھر آٹھ روز خشکی کا سفر کر کے بصرے پہنچا اور وہاں سے چار روز کے بعد خلیج فارس میں داخل ہوا۔ اس سمندر میں بحر اٹلانٹک کی طرح مد و جزر ہوتا ہے۔ یہاں سے چار روز جہاز پر سفر کر کے بندرگاہ قلقوس میں اور وہاں سے جزیرہ ہرمز پہنچا جو ساحل سے بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس جزیرے سے میں ہندوستان کی جانب روانہ ہوا اور سو میل چل کے ایک شہر میں آیا جو کل کیشیا کہلاتا ہے۔ اور ایران کا ایک بہت بڑا بندرگاہ ہے۔ یہاں میں چند روز ٹھہر گیا۔ فارسی زبان سیکھی جس سے بعد میں بہت کام نکلا۔ یہیں سے میں نے عیسائیوں کا لباس اختیار کیا اور اپنے سارے سفر میں اسی کو پہنتا رہا۔ پھر چند ایرانی تاجروں کے ساتھ میں نے ایک جہاز کرائے پر لیا۔ اور آپس میں قول و قرار کر کے کہ ایک دوسرے کے ساتھ ایمانداری اور راستبازی سے پیش آئیں گے روانہ ہو گیا۔



نکلو دمشق الشام میں ایک تاجر کی حیثیت سے رہتا تھا۔ اور عربی زبان سیکھ کے ایک قافلے کے ساتھ جس میں چھ سو تاجر تھے اپنا مال تجارت لے کے عراق عرب کی جانب روانہ ہو گیا۔ چلیڈیا ہوتا ہوا دریائے دجلہ کے کنارے پہونچا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ اس راستے میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ آدھی رات کو جب ایک مقام پر ٹہرے ہوئے تھے زور و شور کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ ہم سمجھے کہ عربوں نے حملہ کر دیا ہے اور ہمیں لوٹنے آرہے ہیں لہذا ہر شخص اٹھا اور مقابلہ کے لئے تیار ہو گیا۔ اب ہم انکے انتظار میں کھڑے تھے کہ دیکھا لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت گھوڑوں پر سوار قریب آگئے اور ہمارے خیموں کے پاس سے گزرنے لگے لیکن ہم سے کچھ نہ بولے۔ بعض تجربہ کار تاجروں نے جو ایسے واقعات پہلے دیکھے چکے تھے کہا کہ ”یہ جن ہیں اور اس میدان میں اکثر اسی طرح نظر آیا کرتے ہیں۔“

دریائے دجلہ کے کنارے ایک بہت بڑا شہر ہے جس میں قدیم شہر بابل کا بھی ایک حصہ آگیا ہے۔ یہ شہر چودہ میل کے رقبے میں آباد ہے۔ اسے وہاں کے لوگ بلدوشیا (بغداد) کہتے ہیں۔ دریائے دجلہ اس شہر کے بیچ میں سے ہو کے گذرا ہے۔ اور ایک پل کے ذریعے سے جس میں چودہ درہیں ہیں۔ اور دونوں حصوں میں آمد و

انتخاب از مضامین شرر

مصنفہ

مولانا مولوی محمد عبد الحلیم شرر لکھنوی

قدیم سیاحان ہندوستان

پندرہویں صدی عیسوی کے آغاز میں نکلو کانٹی نام
وینس کے ایک تاجر نے ہندوستان کا سفر کیا۔ اور برہما۔
الجزائر۔ چین۔ اور مصر ہوتا ہوا پچیس سال کے بعد اپنے وطن
واپس آیا۔ اس سفر میں وہ اپنی بیوی اور بچوں کو ساتھ لیتا
گیا تھا۔ واپسی کے وقت مصر میں اُسے اپنا عیسوی مذہب چھوڑ
دینا پڑا۔ جب وہ وطن پہنچ گیا تو پوپ بوجن چہارم سے
درخواست کی کہ میرا گناہ کبیرہ جو اپنی جان بچانے کی غرض سے
سرزد ہو گیا تھا معاف کر دیا جائے۔ پوپ نے اس کی درخواست
منظور کر لی۔ لیکن یہ شرط لگا دی کہ اپنے سفر کے حالات سکرٹری
پوگیو پوگیو بریسولی نی سے بیان کر دو۔ پوگیو نے یہ واقعات
اُس سے سنکے لاطینی زبان میں لکھ دیئے تھے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ
اسکے حالات ناظرین دلگداز کے لئے بہت ہی دلچسپ ثابت ہونگے۔



نواب مصطفیٰ خاں مرحوم نے اس زمانے میں میرزا کے ساتھ دوستی کا حق پورا پورا ادا کیا اپیل میں جو کچھ صرف ہوا وہ اپنے پاس سے صرف کیا اور تیس مہینے تک برابر انکی غمخواری اور ہر طرح کی خبر گیری میں مصروف رہے۔ جب میرزا قید سے میاں کالے صاحب کے مکان میں آکر رہے تھے۔ ایک روز میاں کے پاس بیٹھے تھے؛ کسی نے آکر قید سے چھوٹنے کی مبارکباد دی؛ میرزا نے کہا ”کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے؟“ پہلے ”گورے“ کی قید میں تھا اب ”کالے“ کی قید میں ہوں۔

راضی ہوں۔ مگر آرزو کرنا اُٹیس عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔
 میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں؛ اور اگر رہوں تو
 ہندوستان نہ رہوں۔ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے،
 یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ
 رحمة للعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے، دیکھئے وہ کب
 وقت اُٹیکا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے
 زیادہ جانفرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اس مرنے کے کہ کوئی
 منزل مقصود قرار دوں سر بصرہا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ کہ
 مجھ پر گزرا اور یہ ہے جسکا میں آرزو مند ہوں۔“

یہ واقعہ میرزا صاحب پر نہایت شاق گزرا تھا۔ اگرچہ منجملہ
 چھ مہینے جو انکو قید خانے میں گزرے ان کو کسی طرح کی
 تسکلیف نہیں ہوئی؛ وہ بالکل قید خانے میں اسی آرام سے رہے
 جیسے گھر پر رہتے تھے؛ کھانا اور کپڑا اور تمام ضروریات حسب
 دلخواہ گھر سے انکو پہنچتی تھیں۔ انکے دوست ان سے ملنے جاتے
 تھے۔ اور وہ صرف بطور نظر بندوں کے جیلخانہ کے ایک علیحدہ
 کمرے میں رہتے تھے۔ مگر چونکہ اس وقت تک شہر کے شرفاء و
 اعیان کے ساتھ کبھی اس قسم کا سلوک میرزا نے نہیں دیکھا تھا
 اس لئے وہ اسکو بڑی بے ابروئی کی بات سمجھتے تھے۔



ایک فارسی خط میں مختصر طور پر بیان کیا ہے جس کا ترجمہ ہم اس مقام پر لکھتے ہیں ”کوئوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف؛ فتنہ گہات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوئوال کا حاکم ہے؛ میرے باب میں وہ کوئوال کا معکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سشن جج‘ باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صعبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا‘ اُس نے بھی انعام اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب ادھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی بہت تعریف کی۔ سنا ہے کہ رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفریں کی اور میری خاکساری اور آزادہ روی سے اسکو مطلع کیا؛ یہاں تک کہ اس نے خود بخود میری رہائی کی رپورٹ بھیج دی۔ اگرچہ میں اسوجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اس پر

صاحب سکرٹری کے دیرے پر پہنچے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی۔ انہوں نے فوراً بلا لیا۔ مگر یہ پالکی سے اتر کر انتظار میں ٹھہرے رہے کہ دستور کے موافق صاحب سکرٹری انکے لینے کو آئینگے۔ جب بہت دیر ہو گئی، اور صاحب کو معلوم ہوا کہ اس سبب سے نہیں آئے؛ وہ خود باہر چلے آئے اور میرزا سے کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائینگے تو آپ کا اسطرح استقبال کیا جائیگا۔ لیکن اسوقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہوسکتا۔ میرزا صاحب نے کہا گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لئے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو نہ اس لئے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔ صاحب نے کہا؛ ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔ میرزا صاحب نے کہا مجھکو اس خدمت سے معاف رکھا جائے، اور کہہ کر چلے آئے۔

قید ہونیکا واقعہ

میرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی۔ اور چوسر جب کبھی کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔ اسی چوسر کی بدولت سنہ ۱۲۶۴ ہجری میں میرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گزرا۔ میرزا نے خود اس واقعہ کو

ورنہ اہل دہلی بھی اکثر بجائے 'اپنے تئیں' کے 'آپ کو' بولتے ہیں؛ اس میں کچھ اہل لکھنؤ کی خصوصیت نہیں ہے۔

لطیفہ

زبان کے متعلق میرزا کا اسی قسم کا ایک اور لطیفہ مشہور ہے۔
دلی میں 'رتہ' کو بعضے مؤنث اور بعض مذکر بولتے ہیں؛
کسی نے میرزا صاحب سے پوچھا کہ حضرت! رتہ مؤنث ہے یا
مذکر؟ آپ نے کہا بھیا! جب رتہ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو
مؤنث کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر سمجھو۔

ملائمت سرکاری سے افکار

تذکرہ ابعیات میں لکھا ہے کہ سنہ ۱۸۴۲ع میں جب کہ
دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا۔ مسٹر ٹامسن سرٹری گورنمنٹ
ہند، جو آخر کو اضلاع شمال و مغرب میں لفٹنٹ گورنر ہو گئے تھے،
مدرسین کے امتحان کے لئے دلی میں آئے اور چاہا کہ جس طرح
سورویہ ماہوار کا ایک عربی مدرس کالج میں مقرر ہے؛
اسی طرح ایک فارسی کا مدرس مقرر کیا جائے۔ لوگوں نے 'میرزا'
اور 'مومن خان' اور مولوی 'امام بخش' کا ذکر کیا۔ سب سے
پلے میرزا صاحب کو بلایا گیا۔ میرزا پالکی میں سوار ہو کر

لطیفہ

T3eU 2171

لکھنؤ کی ایک صعبت میں جب کہ میرزا وہاں موجود تھے -
ایک روز لکھنؤ اور دہلی کی زبان پر گفتگو ہو رہی تھی ایک
صاحب نے میرزا سے کہا کہ جس موقع پر اہل دہلی 'اپنے تئیں'
بولتے ہیں وہاں اہل لکھنؤ 'آپ کو' بولتے ہیں؛ آپ کی
راے میں فصیح "آپ کو" ہے یا "اپنے تئیں"؟ میرزا نے کہا
فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ بولتے ہیں؛ مگر اس میں
دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت یہ فرمائیں کہ میں
آپ کو فرشتہ خصائل جانتا ہوں اور میں اُس کے جواب میں
اپنی نسبت یہ عرض کروں کہ میں تو آپ کو کتے سے بھی بدتر
سمجھتا ہوں؛ تو سخت مشکل واقع ہوگی؛ میں تو اپنی نسبت
کہونگا اور آپ ممکن ہے کہ اپنی نسبت سمجھ جائیں - سب حاضرین
یہ لطیفہ سنکر پھڑک گئے - میرزا کا مطلب صرف اسقدر بیان
کرنا تھا کہ آپ کو مخاطب کے لئے تو عموماً بولا ہی جاتا ہے؛ اگر
متکلم کے لئے بھی اسکا استعمال ہوگا تو بعض موقع پر التباس
واقع ہوگا - اس مطلب کو انہوں نے اس لطیف پیرائے میں بیان
کیا - مگر یہ فقط ایک لطیفہ اہل صعبت کے خوش کرنے کے لئے تھا

تعطیل میں جو اُن مسودات میں موجود تھے نائب السلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لئے لکھی تھی۔ لیکن میرزا صاحب نے ملاقات سے پہلے دو شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں ایک یہ کہ نائب میری تعظیم دیں، دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھا جائے۔ اسی وجہ سے میرزا بغیر اسکے کہ روشن الدولہ سے ملیں اور وہ نثر پیش کریں، وہاں سے کلکتے کو روانہ ہو گئے مگر معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے سے واپس آنے کے بعد انہوں نے ایک قصیدہ دلی سے نصیر الدین حیدر کی شان میں لکھ کر ایک دوست کے توسط سے گزارنا تھا۔ اور اُس پر پانچ ہزار روپے بطور صلے کے ملنے کا حکم ہوا تھا؛ شیخ امام بخش ناسخ نے میرزا کو لکھا کہ پانچ ہزار ملے تھے؛ تین ہزار روشن الدولہ کھا گئے؛ اور دو ہزار متوسط کو دیکر کھا کہ اس میں سے جو مناسب سمجھو میرزا کو بھیج دو۔ میرزا صاحب نے یہ سن کر پھر کچھ تحریک کی مگر تین دن بعد یہ خبر پہنچی کہ نصیر الدین مر گئے۔ پھر واجد علی شاہ کے زمانے میں میرزا نے سلسلہ جنبانی کی؛ اور پانسو روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لئے وہاں مقرر ہو گئے۔ لیکن صرف دو برس گزرے تھے کہ ریاست ضبط ہو گئی؛ اور وہ دفتر گاؤ خور ہو گیا۔

معترضین میں زیادہ جوش و خروش پیدا ہوا اور میرزا پر اعتراضوں کی بوچھاڑ پڑنے لگی۔ اگرچہ میرزا کے طرفدار بھی کلکتے میں بہت تھے مگر چونکہ میرزا اعتراض اور مخالفت سے بہت جذبہ ہوتے تھے۔ اُنکے گہبرا دینے کو ایک معترض بھی کافی تھا۔ اُنہوں نے تنگ آکر ایک مثنوی موسوم بہ باد مخالف جس میں اپنی غریب الوطنی کا ذکر اور اہل کلکتہ کی نا مہربانی کی شکایت اور اُنکے اعتراضات اور اپنے جواب نہایت عمدگی اور صفائی اور درد انگیز طریقے سے بیان کئے ہیں۔

قیام لکھنؤ

رمضان الدولہ جب میرزا نے کلکتے جانے کا ارادہ کیا تھا اُس وقت راہ میں ٹھہرنے کا قصد نہ تھا۔ مگر چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ میرزا ایک بار لکھنؤ آئیں؛ اس لئے کانپور پہنچ کر اُن کو خیال آیا کہ لکھنؤ دیکھتے چلے۔ اُس زمانے میں نصیر الدین حیدر فرمانروا۔ اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔ اہل لکھنؤ نے میرزا کی عمدہ طور مذاقات کی، روشن الدولہ کے ہاں بعنوان شائستہ اُنکی تقریب کی گئی۔ میرزا سے اُس پریشانی کے عالم میں قصیدہ تو سرانجام نہیں ہو سکا، مگر ایک مدحیہ نثر صنعت

برابر ملتا رہا اور تمام لوکل حکام اور افسران سے رئیس زادوں کی طرح ملتے رہے۔

مجادلۂ اہل کلکتہ

کلکتہ کے قیام کے زمانے میں کچھ لوگوں نے میرزا کے ^{مشہور بادشاہ} کلام پر اعتراض کئے تھے اور اپنے اعتراضوں پر قتیل کا قول سنداً پیش کیا تھا۔ مگر میرزا ہندوستان کے فارسی گو شاعروں میں خسرو کے سوا کسی کو نہیں مانتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں ”اہل ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں“ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے“ اسی لئے وہ قتیل و واقف وغیرہ کو کچھ چیز نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے قتیل کا نام سنکر ناک بہوں چڑھائی اور کہا کہ میں دیوالی^(۱) سنگہ فرید آباد کے کہتری کے قول کو نہیں مانتا اور اہل زبان کے سوا کسی کے قول کو قابل استناد نہیں سمجھتا۔ اور اپنے کلام کی سند میں اہل زبان کے اقوال پیش کئے۔ اس پر

(۱) میرزا قتیل نو مسلم تھے۔ اسلام لانے سے پہلے اُن کا نام دیوالی سنگہ تھا اور فرید آباد ضلع دہلی کے کہتری تھے مسلمان ہونے کے بعد لکھنؤ چلے گئے تھے جہاں اُنکی نہایت قدر ہوئی۔

میرزا صاحب نے گورنمنٹ ہند سے پانچ درخواستیں کی تھیں۔ ایک تو یہی کہ ان کے خیال کے موافق جو مقدار پنشن کی سرکار نے مقرر کی ہے وہ آئندہ پوری ملا کرے۔ دوسری یہ کہ اب تک جسقدر کم پنشن ملتی رہی ہے اُسکی واصلات ابتدا سے آج تک ریاست فیروزپور سے دلوالی جائے۔ چونکہ پہلی درخواست نا منظور ہوئی تھی (اس لئے دوسری درخواست کیونکر منظور ہوتی) تیسری درخواست یہ تھی کہ کل پنشن میں جو حصہ میرا قرار پائے وہ اور سرکار سے علیحدہ کر دیا جائے۔ چوتھی یہ کہ پنشن فیروزپور سے خزانہ سرکار میں منتقل ہو جائے، تاکہ رئیس فیروزپور سے مانگنی نہ پڑے۔ (یہ دونوں درخواستیں منظور ہو گئیں اور ان کے موافق اخیر تک عملدرآمد رہا) پانچویں درخواست خطاب اور خلعت کی تھی۔ جہان تک معلوم ہے کوئی خطاب گورنمنٹ سے میرزا کو نہیں ملا۔ لیکن گورنمنٹ سے انکو ”خانصاحب بسیار مہربان دوستان“ لکھا جاتا تھا۔ اور جب کبھی دلی میں ویراے یا لفٹننٹ گورنر کا دربار ہوتا تھا تو انکو بھی دیگر رؤسا و عمائد شہر کی طرح بلایا جاتا تھا۔ اور سات پارچے کا خلعت مع جیغہ اور سر پیمچ و مالائے مروارید کے انکو

غرضکہ میرزا کی عمر کچھ کم چالیس برس کی تھی۔ جبکہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتے پہنچے۔ کلکتے میں لوگوں نے انکی بہت خاطر و مدارات کی اور انکو کامیابی کی امید دلائی۔ اسٹرلنگ صاحب سکرٹری گورنمنٹ ہند نے جنکی مدح میں میرزا کا فارسی تصیدہ انکے کلیات میں موجود ہے، وعدہ کیا کہ تمہارا حق ضرور تمکو ملیگا کولبرگ صاحب جو اس وقت دلی میں رزیدنٹ تھے انہوں نے دلی ہی میں میرزا سے عمدہ رپورٹ کرنے کا اقرار کر لیا تھا۔ ان امیدوں کے دھوکے میں وہ پورے دو برس کلکتے میں رہے، مگر آخر کار نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہ ہوا۔ گورنمنٹ نے سر جان میلکم گورنر بمبئی سے جو لارڈ لیگ کے سکرٹری رہ چکے تھے، اور انہیں کے روبرو جاگیروں اور پنشنوں کی سندیں لوگوں کو ملی تھیں، میرزا کے معاملے کی بابت استفسار کیا۔ انہوں نے میرزا کے دعوے کو غلط بتایا اور جس طرح اور جس قدر پنشن فیروزپور سے ملنی قرار پائی تھی اُس کی مفصل کیفیت، جو میرزا کے دعوی کے بالکل خلاف تھی، گورنمنٹ میں بھیج دی۔ جب یہاں سے میرزا کو مایوسی ہوئی تو انہوں نے ولایت میں اپیل کیا مگر وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔

جب میرزا کے چچا نصر اللہ بیگ خان نے وفات پائی تھی اس وقت میرزا کی عمر نو برس کی تھی اور انکے بھائی کی عمر سات برس کی تھی۔ نصر اللہ بیگ خان کی وفات کے بعد انکے متعلقوں اور وارثوں کے لئے، جن میں میرزا اور انکے بھائی بھی شریک تھے، جو پنشن گورنمنٹ نے ریاست فیروزپور جہر کہ پر معمول کر دی تھی جب تک میرزا صغیر سن رہے جو کچھ وہاں سے ملتا رہا پاتے رہے۔ جب سن تمیز کو پہنچے اور شادی بھی ہو گئی۔ عالم شباب اور خانہ داری کی ضرورتیں بہت بڑھ گئیں اور گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا وہ بھی چند روز میں سب خرچ ہو گیا؛ لاچار فکرِ معاش دامن گیر ہوئی۔ اول میرزا کو غلط یا صحیح یہ خیال پیدا ہوا کہ فیروزپور سے جس قدر پنشن ہمارے خاندان کے لئے گورنمنٹ نے مقرر کرالی تھی اسقدر ہمکو نہیں ملتی۔ ضرورتوں نے سخت تنگ کر رکھا تھا، ادھر قرضخواہوں کے تقاضے سے ناک میں دم آگیا تھا، ادھر چھوٹے بھائی کو جنون ہو گیا، میرزا جیسے آزاد منش آدمی کے لئے یہ وقت نہایت سخت تھا؛ اس کشمکش میں انکو اس کے سوا اور کچھ نہ سوجھا کہ کلکتے پہنچ کر سوپریم گورنمنٹ میں پنشن کی بابت استغاثہ پیش کریں۔

اخیر مکان جسمیں ان کا انتقال ہوا۔ حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوانخانہ کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جس کی نسبت وہ کہتے ہیں۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندہ کمینہ ہمسایہ خدا ہے

مطالعہ کتب

جس طرح میرزا نے تمام عمر رہنے کے لئے مکان نہیں خریدا اسی طرح مطالعے کے لئے بھی۔ باوجودیکہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گزری۔ کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی۔ **إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ**۔ ایک شخص کا یہی پیشہ تھا کہ کتاب فروشوں کی دوکانوں سے لوگوں کو کرائے کی کتابیں لادیا کرتا تھا، میرزا صاحب بھی ہمیشہ اسی سے کرائے پر کتابیں منگواتے تھے اور مطالعے کے بعد واپس کر دیتے تھے۔

سفر کلکتہ

ظاہراً میرزا نے کوئی لمبا سفر کلکتے کے سوا نہیں کیا۔ اسی سفر کی آمد و رفت میں وہ چند ماہ لکھنؤ اور بنارس میں بھی ٹھہرے تھے۔ کلکتے جانے کا سبب یہ تھا کہ

اہل دہلی میں سے جن لوگوں نے میرزا کو جوانی میں دیکھا تھا اُن سے سنا گیا ہے کہ عنفوان شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین و خوشرو لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ بڑھاپے میں بھی۔ جبکہ راقم نے پہلی بار اُن کو دیکھا ہے۔ حسانت اور خوبصورتی کے آثار اُن کے چہرے اور قد و قامت اور ذیلِ دول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ مگر اخیر عمر میں قلتِ خوراک اور امراضِ دائمی کے سبب وہ نہایت نحیف و زار و نزار ہو گئے تھے۔ لیکن چونکہ ہار بہت چکلا قد کشیدہ اور ہات پاؤں زبردست تھے اس حالت میں بھی وہ ایک نووارد تورانی معلوم ہوتے تھے۔

مسکن

دہلی میں اُن کے قیام کا زمانہ قریب پچاس برس کے معلوم ہوتا ہے، اس تمام مدت میں اُنہوں نے غالباً یہاں کوئی مکان اپنے لئے نہیں خریدا، ہمیشہ کرائے کے مکانوں میں رہا کئے۔ یا ایک مدت تک میاں کالے صاحب کے مکان میں بغیر کرائے کے رہے تھے، جب ایک مکان سے جی اُکتایا اُسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا، مگر قاسم جان کی گلی یا حبش خان کے پھاٹک یا اسکے قرب و جوار کے سوا کسی اور ضلع میں جا کر نہیں رہے۔ سب سے

دو کڑے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اسی کے دروازے کی سنگیں بارہ دری پر میری نشست تھی۔ اور پاس اس کے ایک کھٹیا والی حویلی، اور سلیم شاہ کے تکتے کے پاس دوسری حویلی، اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹرا۔ کہ وہ گذریوں والا مشہور تھا۔ اور ایک کٹرا کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا، اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔ واصل خاں نامی ایک سپاہی تمہارے دادا کا پیش دست رہتا تھا اور وہ کٹروں کا کرایہ اگاہ کر جمع کرواتا تھا۔ بہائی تم سنو تو سہی! تمہارا دادا بہت کچھ پیدا کر گیا۔ علاقے مول لئے تھے اور زمیندارہ اپنا کر لیا تھا دس بارہ ہزار روپے کی سرکار کی مالگزاری کرتا تھا۔ آیا وہ سب کارخانے تمہارے ہاتھ آئے یا نہیں؟ اس کا حال از روے تفصیل جلد مجھ کو لکھو۔“ اس خط کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا کے نانا کی اگرہ میں ایک خاصی سرکار تھی جس کی بدولت ان کے ملازم اور متوسلین دس دس بارہ ہزار کے مالگزار بن گئے تھے، اور میرزا کا بچپن اور عنفوان شباب بڑے آلتے اور تلون میں بسر ہوا تھا۔

جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوٹے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دلہند ہو۔ اب تم کو مشفق و مکرّم لکھوں تو گنہگار۔ تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم؟ مجھ سے سنو! تمہارے پردادا عہد نجف خاں میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی، اور گھر بیٹھے، تو تمہارے پردادا نے بھی کمر کھول دی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر، خاں صاحب کے ساتھ ہیں، اور انہوں نے جو کتھیٹم گانوں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا ہے تو بنسی دھر اُس امر کے منصرم ہیں، اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ اُنیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اُن کی؛ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت، ادھی ادھی رات گزر جاتی تھی؛ چونکہ گھر اُن کا بہت دور نہ تھا اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے۔ پس ہمارے اور اُن کے مکان میں مچھیا رندی کا گھر اور ہمارے

سکھا سکتا تھا اس میں ہرگز مضائقہ نہ کیا ہوگا اور جیسا کہ 'قاطع برہان' اور 'درفش کاویانی' کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس نے تمام فارسی زبان کے مقدم اصول اور گراور پارسیوں کے مذہبی خیالات اور اسرار جن کو فارسی زبان کے سمجھنے میں بہت بڑا دخل ہے اور پارسی و سنسکرت کا متعدد الاصل ہونا اور اسی قسم کی اور ضروری باتیں میرزا کے دل میں بوجہ اوفیٰ تہ نشیں کر دی تھیں۔

چونکہ میرزا کے چچا کا رشتہ نواب فخر الدولہ کے خاندان میں ہو چکا تھا اور اس لئے ان کے خاندان سے ایک نوع کا تعلق پیدا ہو گیا تھا؛ میرزا کی شادی نواب فخر الدولہ کے چھوٹے بھائی میرزا الہی بخش خان معروف کے ہاں قرار پائی۔ اور جیسا کہ میرزا نے ایک رقعہ میں اشارہ کیا ہے۔ تیرہ برس کی عمر میں سات رجب سنہ ۱۲۲۵ ہجری کو ان کا عقد ہو گیا۔ اس تقریب سے ان کی آمد و رفت دلی میں زیادہ ہو گئی اور آخر کار یہیں سکونت اختیار کر لی اور اخیر عمر تک دلی ہی میں رہے۔

میرزا کے نانا کی جاگیر میں متعدد دیہات اور آگرہ شہر میں بہت بڑی املاک تھیں۔ وہ منشی شیونرائن رئیس آگرہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں "میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو

ملا عبد الصمد علاوہ فارسی زبان کے جو اس کی مادری زبان اور اس کی قوم کی مذہبی زبان تھی - عربی زبان کا بھی - جیسا کہ میرزا نے لکھا ہے - بہت بڑا فاضل تھا - اگرچہ میرزا کو اس کی صعوبت بہت کم میسر آئی ، مگر میرزا جیسے جوہر قابل کو صغرسن میں ایسے شفیق کامل ، جامع اللسانین استاد کا ملجانا ان فوائد اتفاقات میں سے تھا جو بہت کم واقع ہوتے ہیں - اگرچہ میرزا کو اس سے زیادہ مستفید ہونے کا موقع نہیں ملا ، مگر اس فیض صعوبت نے کم سے کم وہ ملکہ ضرور میرزا میں پیدا کر دیا تھا جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ”اگر حاصل شود خواندہ و ناخواندہ برابرست ؛ و اگر حاصل نہ شود ہم خواندہ و ناخواندہ برابر“ معلوم ہوتا ہے کہ میرزا کی حسن قابلیت اور حسن استعداد نے ملا عبد الصمد کے دل پر گہرا نقش بٹھا دیا تھا کہ یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی وہ مدت تک میرزا کو نہیں بھولا نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کہتے تھے کہ ملا کے ایک خط میں جو اس نے میرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا یہ فقرہ لکھا تھا ”اے عزیز چہ کسی کہ با این ہمہ آزاد یہاں گاہ گاہ بخاطر می گذری“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ دو برس کے قلیل عرصے میں وہ میرزا کو

اگرچہ کبھی کبھی میرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ ”مجھکو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے“ اور عبد الصمد بعض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ مجھکو لوگ بے استاد کہتے تھے ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے“ مگر اس میں شک نہیں کہ عبد الصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور میرزا نے اس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی چنانچہ میرزا نے جابجا اس کے تلمذ پر اپنی تحریروں میں فخر کیا ہے اس کو بلفظ ’تیمبار‘ جو پارسیوں کے ہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہے یاد کیا ہے۔ جیسا کہ میرزا نے اپنی بعض تحریروں میں تصریح کی ہے۔ میرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبد الصمد ان کے مکان پر وارد ہوا ہے اور کل دو برس اس نے وہاں قیام کیا۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ میرزا کو کس عمر میں اس کی صحبت میسر آئی اور کس قدر قلیل مدت اس کی صحبت میں گزری تو عبد الصمد اور اس کی تعلیم کا عدم وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اس لئے میرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے ”مجھکو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔“

لطیفہ

اکثر لوگ پنشن کا دریافت کرنے کو خط بھیجتے تھے۔ ایک دفعہ میر مہدی نے اسی مضمون کا خط بھیجا تھا؛ اس کے جواب میں میرزا صاحب لکھتے ہیں ”میاں بے رزق جینے کا دھب مجھ کو آگیا ہے؛ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا؛ آگے خدا رزاق ہے؛ کچھ اور کھانیکو نہ ملا تو غم تو ہے۔“

تعلیم

میرزا غالب مع اپنے چھوٹے بھائی کے سن شعور تک آگرہ ہی میں رہے؛ اگرچہ سات برس کی عمر سے وہ دلی میں آنے جانے لگے تھے لیکن شادی کے بعد تک ان کی مستقل سکونت آگرے ہی میں رہی اور شیخ معظم جو اس زمانے میں آگرہ کے نامی معلموں میں سے تھے ان سے تعلیم پاتے رہے۔ اس کے بعد ایک شخص پارسی نژاد جس کا نام آتش پرستی کے زمانے میں ہرمزد تھا اور بعد مسلمان ہونے کے عبد الصمد رکھا گیا، غالباً آگرے میں سیاحانہ وارد ہوا، جو کہ دو برس تک میرزا کے پاس اول آگرہ میں اور پھر دلی میں مقیم رہا؛ میرزا نے اس سے فارسی زبان میں کسیقدر بصیرت پیدا کی؛

میرزا کے والد کی وفات کے بعد ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے ان کو پرورش کیا۔ جب سرکار انگریزی کی عملداری ہندوستان میں اچھی طرح قائم ہو گئی۔ اور نواب فخرالدولہ احمد بخش خاں لارہ لیک کے لشکر میں شامل ہوئے، انہوں نے میرزا غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کو جن سے نواب موصوف کی ہمیشہ منسوب تھیں؛ سرکاری فوج میں بعہدہ رسالداري ملازم کرا دیا ان کی ذات اور رسالے کی تنخواہ میں دو پرگنے یعنی سونک اور سونسا، جو نواح آگرہ میں واقع ہیں، سرکار سے انکے نام مقرر ہو گئے۔ جب تک وہ زندہ رہے دونوں پرگنے ان کے نامزد رہے، اور ان کی وفات کے بعد ان کے وارثوں اور متعلقوں کی پنشنیں سرکار نے فیروزپور جھڑک کی ریاست سے مقرر کر دیں جس میں سے سات سو روپیہ سالانہ میرزا کو آخر اپریل سنہ ۱۸۵۷ء تک برابر ملتا رہا۔ مگر فتح دہلی کے بعد تین برس تک قلعے کے تعلقات کے سبب یہ 'پنشن' بند رہی۔ آخر جب میرزا کی ہر طرح سے بریت ہو گئی تو 'پنشن' پھر جاری ہو گئی، اور تین برس کی واصلات بھی سرکار نے عنایت کی۔ جب تک 'پنشن' بند رہی میرزا کے دوستوں کو نہایت تعلق خاطر رہا۔

دو بیٹے ہوئے ایک میرزا اسد اللہ خان؛ دوسرے میرزا یوسف خان جو ایام شباب میں مجنوں ہو گئے تھے اور اسی حالت میں سنہ ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔

میرزا کے والد عبد اللہ بیگ خان، جیسا کہ میرزا نے خود ایک خط میں لکھا ہے۔ اول لکھنؤ میں جا کر نواب آصف الدولہ کے ہاں نوکر ہوئے اور چند روز بعد وہاں سے تین سو سوار کی جمعیت سے کئی برس تک ملازم رہے۔ مگر وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بھیتے میں جاتی رہی اور وہ واپس آکرہ میں چلے آئے؛ یہاں آکر انہوں نے الور کا قصد کیا۔ راجہ بختاور سنگھ نے ابھی ان کو کوئی خاطر خواہ نوکری نہیں دی تھی کہ اتفاق سے انہیں دنوں میں ایک گڑھی کے زمیندار راج سے پھر گئے۔ جو فوج اس گڑھی پر سرکوبی کے لئے بھیجی گئی اس کے ساتھ میرزا عبد اللہ بیگ خان کو بھی بھیجا گیا تھا؛ وہاں پہنچتے ہی ان کو گولی لگی اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا اور راج گڑھ میں دفن ہوئے۔ راجہ بختاور سنگھ رئیس الور نے گاؤں سیر حاصل اور کسی قدر روزینہ میرزا مرحوم کے دونوں لڑکوں کی پرورش کے واسطے مقرر کر دیا؛ جو ایک مدت دراز تک جاری رہا؛



شدند۔ ازاں جملہ سلطان زادہ ترسیم خان کہ ما از تخم اولیم
سمرقند را بہر اقامت گزید۔ تا در عہد سلطنت عالم بادشاہ
نیائے من از سمرقند بہندوستان آمد۔“

میرزا کے دادا کی زبان بالکل ترکی تھی، اور ہندوستان کی
زبان بہت کم سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں ذوالفقار الدولہ
میرزا نجف خان شاہ عالم کے دربار میں دخل کلی رکھتے تھے؛
نجف خان نے میرزا کے دادا کو سلطنت کی حیثیت کے موافق
ایک عمدہ منصب دلویا اور پہاسوکا سیر حاصل پرگنہ ذات اور
رسالے کی تنخواہ میں مقرر کر دیا، ان کے کئی بیٹے تھے جن میں سے
دو کے نام معلوم ہیں: ایک میرزا کے باپ عبد اللہ بیگ خان
عرف میرزا دولہا اور دوسرے نصر اللہ بیگ خان۔ عبد اللہ بیگ
خان کی شادی خواجہ غلام حسین خان کمیدان کی بیٹی سے
ہوئی تھی؛ جو کہ سرکار میرٹھ کے ایک معزز فوجی افسر اور عمائد
شہر آگرہ میں سے تھے؛ میرزا عبد اللہ بیگ خان نے بطور
خانہ داماد کے اپنی تمام عمر سسرال میں بسر کی؛ اور ان کی
اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی؛ میرزا عبد اللہ بیگ خان کے

(۱) سرکار ملک کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو صوبے کی نسبت چھوٹا
اور پرگنہ و محال وغیرہ سے بہت بڑا ہوتا ہے۔

ہاتھ سے نہ چھوٹی ؛ کیونکہ ترکوں میں قدیم سے یہ قاعدہ
 چلا آتا تھا کہ باپ کے متروکہ میں سے بیٹے کو تلوار کے سوا اور کچھ
 نہ ملتا تھا ، اور کل مال اسباب اور گھر بار بیٹی کے حصے میں
 آتا تھا ۔ بارے ایک مدت کے بعد اسلام کے عہد میں اسی تلوار کی
 بدولت ترکوں کے بخت خفتہ نے پھر کروت بدلی ، اور سلجوقی
 خاندان میں ایک زبردست سلطنت کی بنیاد قائم ہو گئی ۔ کئی سو
 برس وہ تمام ایران و توران و شام و روم (یعنی ایشیائے کوچک) پر
 حکمران رہے ۔ آخر ایک مدت کے بعد سلجوقیوں کی سلطنت کا
 خاتمہ ہوا ، اور سلجوق کی اولاد جا بجا منتشر و پراگندہ ہو گئی ۔
 انہیں میں سے ترسم خان نام ایک امیرزادے نے سمرقند میں
 بود و باش اختیار کر لی تھی ۔ میرزا کے دادا جو شاہ عالم کے
 زمانے میں سمرقند سے ہندوستان میں آئے وہ اسی ترسم خان کی
 اولاد میں تھے ۔ میرزا مہر نیمروز کے دیباچے میں لکھتے ہیں :
 ” از واپسیان این قافلہ نیائے من ۔ کہ در قلمرو ماوراءالنہر ۔
 سمرقند شہر مسقط الراس وے بود ۔ چوں سیل کہ از بالا بہ پستی
 آید از سمرقند بہند آمد “ ۔ اور درفش کاویانی میں اس طرح
 لکھا ہے : ” بالجملہ سلجوقیان بعد زوال دولت و برہم خوردن
 ہنگامہ سلطنت در اقلیم وسیع الفضائے ماوراءالنہر پراگندہ

INTERMEDIATE URDU SELECTIONS

انتخاب از یادگار غالب

مرتبہ

شمس العلماء مولوی خواجہ الطاف حسین حالی

تاریخ ولادت خاندان

میرزا اسد اللہ خاں غالب المعروف بہ میرزا نوشہ ، المخاطب
بہ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ ،
المتخلص بہ غالب در فارسی و اسد در ریختہ ؛ شب ہشتم ماہ
رجب سنہ ۱۲۱۲ھ کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے ۔ میرزا کے خاندان
اور اصل و گوہر کا حال ، جیسا کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں
جابجا ظاہر کیا ہے ۔ یہ ہے کہ انکے آبا و اجداد ایبک قوم کے
ترک تھے ؛ اور ان کا سلسلہ نسب تور ابن فریدوں تک پہنچتا ہے ۔
جب کیانی تمام ایران و توران پر مسلط ہو گئے ، اور تورانیوں کا
جاہ و جلال دنیا سے رخصت ہو گیا ، تو ایک مدت دراز تک
تورکی نسل ملک و دولت سے بے نصیب رہی ، مگر قلمواری کبھی

حصه نظم

- ۱ - انتخاب از میراثی میرانیس ... 1
- ۲ - منتخب از کلیات میر ... 12
- ۳ - انتخاب از کلام شاد عظیم آبادی ... 33
- ۴ - کلام وحشت از خان بهادر مولوی رضا علی وحشت ... 43
- ۵ - انتخاب از بانگ درا از سر محمد اقبال بیرسٹراٹ لا ... 53
- ۶ - انتخاب از کلیات " راسخ " ... 80
- ۷ - انتخاب از کلیات " جرأت " ... 97
- ۸ - انتخاب از دیوان " ناسخ " ... 109
- ۹ - انتخاب از دیوان " ذوق " ... 120
- ۱۰ - انتخاب از کلیات " مومن " ... 135
- ۱۱ - انتخاب از کلام سرور جهان آبادی ... 148
- ۱۲ - انتخاب از قطعات و مثنویات " اکبر " (له آبادی ... 154
- ۱۳ - انتخاب از کلام پندت برج فرالن " چکبست " ... 166
- ۱۴ - انتخاب از رباعیات " درد " ... 173
- ۱۵ - انتخاب از رباعیات " حالی " ... 177
- ۱۶ - حالات مصنفین ... 182

۷ - انتخاب از سیر کہسار - پندت رتن ناتھ " سرشار "

205 بہار کیا شئے ہے ...

۸ - انتخاب از مضامین شرر - مولوی عبد العلیم " شرر "

227 ندیوں کا بہاؤ ...

237 خندہ روئی ...

247 ہمالیہ کی چوٹیاں ...

257 ایک روپیہ کی سرگزشت ...

279 ۹ - انتخاب از حیات صالحہ - از مولانا راشد الخیری ...

۱۰ - انتخاب از مغل اور اردو - نواب نصیر حسین " خیال "

302 بہادر شاہ اور اردوے معلیٰ ...

۱۱ - انتخاب از خیالستان - سید سجاد حیدر

322 ازدواج محبت ...

۱۲ - انتخاب از سیرت الصدیق - مولانا حبیب الرحمن خان شروانی

335 ذاتی حالات ...

فہرست عنـد تـخـبـات اُردو

صفحہ

حصہ نثر

- ۱ - انتخاب از یادگار غالب - 1
- از مولوی خواجہ الطاف حسین "حالی" ✓
- ۲ - قدیم سیاحان ہندوستان - 26
- از مولوی محمد عبد العلیم "شرر" لکھنوی
- ۳ - انتخاب از دہلی کا ایک یادگار آخری مشاعرہ - 51
- از میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی - اے دہلوی
- ۴ - انتخاب از مضامین سر سید احمد - 109
- رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات
- ۱28 امید کی خوشی
- 139 سوازیشن یا تہذیب
- ۵ - انتخاب از نیرنگ خیال - مولانا محمد حسین "آزاد" 149
- بقائے دوام
- ۶ - انتخاب از مقالات شبلی - مولانا شبلی - 182
- ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر
- 199 علوم جدیدہ



انترمیڈیٹ منتخبات اُردو

چوتھی اشاعت

22-11-55

• •
مطبع جامعہ کاکتہ

سنہ ۱۹۵۵ ع